

زندگی خاک نہ تھی

نیم ستم

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیش لفظ

اللہ کے بابرکت نام سے جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

یہ ناول "زندگی خاک نہ تھی" فروری 2013ء میں "واپسی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے شعاع میں۔ کچھ وجوہات کی بنا پر مجھے اس کا نام تبدیل کرنا پڑا۔ لیکن مجھے امید ہے اس تبدیلی سے اس کے معیار کو برگز کوئی نقصان نہیں پہنچا ہو گا۔ آپ سب کی پسند اور خواہش کے مطابق میں نے اس کا "پارٹ نو" لکھا ہے۔ وہ کی یا پھر تھکی جو آپ کو "واپسی" کو یہ پڑھتے ہوئے محسوس ہوئی۔ اس خوبصورت انسانے کے ساتھ یہ تھکی کا احساس میں نے مٹانے کی اپنے طور پر پوری کوشش کی ہے۔

غالباً دو ڈھائی سال قبل شعاع میں ہی ہماری ایک قاری بہن نے تمام مصنفین سے ایک خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ چاہتی ہیں کوئی ایسا ناول لکھا جائے جس کا مرکزی کردار ایک ڈاکو ہو۔ مگر اسے اہتمام پسند حاصل جائے۔ یہ ایک ایسا پلاٹ تھا جس نے میرے ذہن کو فوراً متحرک کر دیا۔ میں نے قلم اٹھایا تھا۔ اور اپنی اس بہن کی خواہش کو عملی جامہ پہنا دیا۔ جو "واپسی" کے عنوان سے کچھ ماہ قبل آپ کے ذوق اور پسند پر پورا اتر کر سراہا جا چکا۔ الحمد للہ! یہاں کتاب کی اشاعت کراتے میں نے اسے از سر نو اس لیے لکھا کہ شعاع کی کمپوزنگ کے دوران بہت ساری جگہوں پر کچھ ایڈیٹنگ ہو جانے کے باعث مجھے کہانی کا ربط ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ جبکہ یہ ناول مجھے ذاتی طور پر بہت پسند تھا۔ دل سے بہت قریب تھا۔ جیسی اس پہ کوئی سمجھوتہ بھی نہیں کر سکی۔ فیس بک اور ٹیلی فونک رائے کے بعد آپ سب کے اصرار پر میں نے اس کا دوسرا حصہ اس سوچ اس خیال کے ساتھ لکھا ہے کہ نیکی کا عہد کر لینا جتنا آسان اس پر قائم رہنا اسے جتنا اسی قدر دشوار امر ثابت ہوا کرتا ہے۔ آپ لوگوں کی خواہش تھی کہ دیا کو اس کے والدین سے ملوانا چاہیے تھا۔ مستقیم کو اپنی ضد چھوڑ دینی چاہیے تھی۔ پارٹ نو میں آپ کو معلوم ہوئے گا۔ دیا اگر اپنے والدین سے ملی تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ مستقیم نے اگر اپنی ضد برقرار رکھی تو اس کی وجوہات کیا تھیں۔

اس ناول میں میرا پسندیدہ کردار "دیا" کا کردار ہے۔ میں نے ایک کوشش کی ہے عورت کو اس کا مرتبہ اس کا مقام سمجھانے کی۔ حالات جیسے بھی ہوں۔ اسے اپنی ہمت اپنا وقار اپنا یقین اللہ پر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

پہلا حصہ

پہننا ہوا رکشہ ایک نسبتاً چھوٹے مکان کے سامنے آ کر رُک گیا۔ بابا کرایہ ادا کرنے گئے تو دیا اپنا بیگ اور چادر سنبھالتی اتر آئی۔ لکڑی کا پرانا رنگ آڑا بوسیدہ سادہ سا دروازہ تھا۔ چھوٹی دیواروں پر سے جامن کے درخت کی شاخیں ادھر ادھر جھانک رہی تھیں۔ بابا کے ہمراہ یونہی بھڑا ہوا دروازہ کھول کر وہ اندر آئی تو دادی جامن کے درخت تلے چھٹی چار پائی پہنچیں سبزی بنانے میں مصروف تھیں۔ انہیں دیکھا تو بوڑھے چہرے پر ایک دم رونق سی چھا گئی۔ اٹھ کر پرتپاک انداز میں بیٹے اور پوتی کو باری باری گلے لگایا پیار کیا۔

”چائے پیو گے کہ بوتل منگوا لوں؟“

”دادی پہلے بوتل پھر کھانے کے بعد چائے۔“

اس سے چنبلی کہ بابا جواب دیتے وہ بول پڑی۔ دادی کو اس کی یہ اہمیت آمیز بے تکلفی پسند آئی تھی جیسی مسکرائے لگیں اور بوتل منگوانے کو گلی کے چھپچھپ کو آواز دینے لگی تھیں کہ بابا نے روک دیا۔

”رہنے دیں اماں! میں لاتا ہوں۔“

دادی کے منع کرنے کے باوجود بابا چلے گئے تو دیا نے چادر اتار کر تہہ کی اور وہیں چار پائی پر لیٹ گئی۔ دھیان خود بخود گھر کی جانب چلا گیا تھا۔ ذیشان اور لائپہ تو امی کے ساتھ کھانا کھا چکے ہوں گے۔ امی تو نماز پڑھ کے سو جائیں گی۔ لائپہ اور ذیشان نے ضرور اودھم مچا رکھا ہوگا۔ آزاد دی جو نصیب ہوئی تھی انہیں۔ نہ بابا گھر نہ وہ۔ اس سے تو خاص طور پر ڈرتے تھے۔ بہت رعب جمایا کرتی تھی ان پر اپنی بیانی کا جیسی خاصا دبا کے رکھا ہوا تھا دونوں بچاروں کو۔

جب دادی کا بلا وہ آیا تو تھکی دونوں نے جھٹ اس کا نام لے دیا تھا۔

”بھوکو بھیج دیں بابا! ویسے بھی ان کے ایگزٹ ہو چکے ہیں۔“

اس کے گھورنے کو نظر انداز کیے ذیشان نے کہا تھا۔

”تم خود کیوں نہیں چلے جاتے؟“

بابا کو آمادہ ہوتے پا کر وہ ذیشان کو گھورتے ہوئے غرائی۔

مضبوط رکھنا ہے۔ پھر بھلا ممکن ہے کہ کامیابی قدم نہ چوے۔ دیا روشنی کے جگنو کا نام ہے ہر ایسی عورت کے لیے جو حالات و واقعات کے ہارنگبوت میں جکڑی جائے۔ اگر قسمت نے آزمائش نصیب کی ہے تو خدا را اس سے فرار حاصل نہ کریں۔ حالات کے سامنے ڈٹ جائیں جیسے دیا ڈٹ گئی۔ اللہ پہ بھروسے یقین اور ایمان کے ساتھ۔ سرخروئی نصیب لازمی ٹھہرے گی۔ ان شاء اللہ!

کیونکہ اچھائی یہ نہیں کہ حالات اچھے سب کچھ ٹھیک تو ہم بھی اچھے ہیں۔ نہیں..... اچھائی یہ ہے کہ حالات کڑے۔ آزمائش سر پہ مگر ہم نے سپر نہیں ڈالی ہے۔ خود بدلنے کی بجائے۔ حالات کو بدلنے کا عزم ضروری ہے۔

”زندگی خاک نہ تھی“ مستقیم کے حالات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی کہانی ہے۔ اس کا مرکزی کردار بھی مستقیم ہی ہے۔ لیکن دیا نے اسے کیسے بدلا اسے کیسے جیت لیا۔ اس کا جواب محبت اور خدا پہ یقین کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس دعا کے ساتھ اجازت دیں کہ

”اللہ پاک میری ارض پاک پہ امن و سلامتی اتارے۔“

میرے والدین بھائی بہنوں آمنہ اور ہر پاکستانی ہر مسلمان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے مکمل سلامتی کے ساتھ۔ خوش رہے، خوشیوں کو باٹھے۔

ام مریم

”میری ان سے اتنی اندر اسینڈنگ نہیں ہے نا۔ ہر بات پر اعتراض۔ اس روز پتہ ہے کیا کہہ رہی تھیں؟ لڑکے اتنی چیز تیز منہ چلا کر نہ کھایا کرو۔ مجھے لگتا ہے کہ بکرا چارہ کھا رہا ہے۔ کتر کتر کتر۔“ وہ غصے میں کہہ گیا مگر بچہ تیار نہ کیا اور لالچہ کے ساتھ بابا اور امی بھی ہنس رہے تھے۔ وہ روہانسا ہونے لگا۔

”اب آپ لوگ بھی مذاق اڑائیں گے میرا۔“

”نہ میرے چاند دادی کی بات کا برا نہ مانا کرو۔ وہ جو بھی کہتی ہیں مقصد اصلاح ہوتا ہے۔“

امی اپنے لاڈلے کو لپٹا کر پیار سے سمجھانے لگیں، جبکہ وہ مسند و ہیں انکا تھا ساتھ میں دیا کی جان بھی۔ قرعہ اس کے نام نکلتا تھا اور وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔

”نوکری تو مجھے بھی رہتی ہیں دادی میری تھوڑا بہتی ہے ان سے۔“

وہ بسوری اور امی نے اسے گھورا تھا۔ ان کے خیال میں آج کل کے بچے بہت بے مہار تھے۔

مجال ہے جو بڑوں کا ادب لحاظ ہو۔

”آپ سے پیار تو کرتی ہیں نا۔ نوکری بھی اگر ہیں تو نرمی سے۔ ہمیں تو بس ڈانٹنی ہی ہیں۔“

لالچہ نے بھی نقطہ اعتراض اٹھا لیا۔ اور یوں بے دلی سے سبکی مجبوراً و مروغاً ہی مکر آنا دیا کوئی پڑا تھا۔ فارغ وہی تھی۔

بابا صرف کولڈ ڈرنک نہیں گوشت، سبزیاں، پھل اور ضرورت کی دیگر اشیاء لے آئے تھے۔ جنہیں سنبھالتیں دادی اب بڑبڑا بھی رہی تھیں۔

”ذرا جو خیال ہو۔ گڈیوں کی طرح پیسے اڑاتا ہے ولی محمد! بھلا مجھ اکیلی جان کا کتنا خرچہ۔“

جب بھی آئے گا تھیلے بھر کے چیزوں کے جمع کر کے رکھ جائے گا۔

چار پانی پر لپٹی دیا نے تکیے سے سر ذرا سا اونچا کر کے انہیں دیکھا پھر ہنسنے لگی۔

”کیوں پریشان ہوتی ہیں دادی! اب میں آگنی ہوں نا یہاں۔ سب کچھ بڑپ کر لیا کروں گی۔“

اس کی بات نے گھاس دھوئیں دادی کو نہال کر ڈالا۔

”ہاں۔ عیندی رو دھیے۔ اللہ سب برتنا نصیب کرے۔“

وہ اسی خوشی و اطمینان سے اسے دعا میں دینے لگیں۔

”بچے آپ نکال لیں کولڈ ڈرنک گلاسوں میں۔“

”دو مزے سے چٹنی تھی۔ بابا کے نوکٹے پر منہ بنا لیا۔“

”فکر نہ کریں بابا! اب دادی کے سارے کام مجھے ہی کرنا ہیں۔ اس وقت تو تھکی ہوئی آتی ہوں۔“

”نا۔“

”ہاں ہاں۔ تو چپ رو۔ میں اتنا سا کام اپنی دھمی کا کر کے تھکنے نہیں لگی۔“

دادی نے بھی بابا کو ہی ڈانٹا تھا۔ پانی پی کر بابا نماز کے لیے مسجد چلے گئے تو دیا نے پھر چار پانی پر لپٹ کر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ طبیعت مضطرب ہی ہو رہی تھی۔ دادی اٹھ کر سالن بنانے کی تیاری میں مصروف ہوئیں اور گوشت کی قھیلی جو دادی کی نگاہ سے بچ کر وہیں تخت پر پڑی رو گئی تھی دیوار پر بیٹھی بلی کی نگاہ سے نہ بچ سکی۔ اس نے اپنی کانچی سی آنکھیں کھولیں۔ گوشت کی قھیلی کو تولیتی نظروں سے دیکھا۔ ٹانگ سکڑ کر تازہ گوشت کی خوشبو سونگھی اور مال فیمت جان کر وہ بے پاؤں اترتی۔ دیوار سے چھت پہ کودی پھر سبز حیاں مہر کیں۔ سکن میں آ کر وہ بہت سرعت سے چھٹی تھی اور گوشت کی قھیلی کو منہ میں ڈالے دیوار پر جست لگا دی۔

عین اسی لمحے دادی باہر آئی تھیں۔ مارے صدمے کے ہاتھ سے لہسن پیاز کی گڈیاں چھوٹ نکلیں۔

”اڑے پکڑو۔ بھاگید، لے گئی کجنت! تیرے باپ کی کمائی تھی۔ ارے کوئی ہے؟“

ان کی چیخ و پکار کے جواب میں دیا نے چونک کر آنکھوں سے بازو ہٹایا اور صورتحال سمجھنے ہی جھک کر اپنا جوتا اٹھایا اور تاک کر تین وقت پر بلی کو کھینچ مارا۔ بلی کے منہ سے قھیلی چھوٹ کر گر گئی۔ جسے دادی نے بھاگ کر قبضہ میں کیا اور سینے سے لگا لیا۔

”نا ہنجار۔ کیمینی۔ تو بذر کی ذرا نظر چوکی نہیں اور یہ سارا گوشت لے کر بھاگی نہیں۔“

دادی کا قصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ جبکہ وہ اپنی پھرتی کے مظاہرے پر اب ہنس رہی تھی۔

جب دادی نے اس کا کارنامہ بابا کو سنا کر اسے شاباش دی۔ اس کی گردن کچھ اور اڑ گئی تھی۔ گویا بابا کو جتنا ہی ہو آپ کی دیا اتنی بھی بیکار نہیں جتن آپ سمجھتے ہیں۔ بابا نے مسکراہٹ چھپائی تھی۔

دادی کی پڑھی لکھی شہری پوتی کی آمد کا سن کر آس پڑوس کی عورتیں باقاعدہ اس کے دیدار کو آ رہی تھیں۔ دادی ہر کسی کے سامنے اس کے تسخیر آپ، ذہانت، تعلیم اور خوبصورتی کے لیے چوڑے قصیدے پڑھتیں تو دیا یکدم تجل ہو جایا کرتی ایک دو بار انہیں بے انداز میں ٹوکا بھی۔ مگر ان کا اپنا ایک انداز تھا۔ سوگن رہی اس روز انہوں نے بڑے شوق سے گڑ کے چاول پکائے تھے جس میں پنے کی دال بھی ڈالی تھی۔

”تیرا بچہ یہ چاول بڑے پسند ہیں اور تیرے بہشتی دادا کو بھی۔“

انہوں نے پلیٹ بھر کے اسے تھماتے اطلال دی۔ وہ محض مسکرا دی مگر اتنی رفعت سے کھانہ سکی

جتنی سے غائب دادا اور بابا کھاتے ہوں گے۔ جسے ہی تو دادی کا چہرہ اتر گیا تھا۔

”چل پھر تو رونی کھالے چتری! بھوکے پیٹ نہ سوتا۔ میں ذرا شریا کے گھر دے آؤں یہ چول۔“

وہ بڑے سائز کی دوسری پلیٹ بھر کے اٹھ گئیں۔ البتہ باہر جانے سے قبل اسے اندر سے دروازہ بند کرنے کی تاکید کرنا نہیں بھولیں۔ دیا گہرا سانس بھر کے اٹھی تھی۔

دادی نے چار مرغیاں پال رکھی تھیں۔ اس وقت اس نے دادی سے اندوں کے ملوے کی فرمائش کی تھی۔ جب ہی دادی ایک دم پر جوش ہو کر ملوہ بنانے میں مصروف تھیں۔ دیکھی تھی دیتی میں گزرتا تھا اور ماحول میں اندوں کے ملوہ کی خوشبو پکڑنے لگی تھی۔ خود دادی وقتے وقتے سے چمچے چلاتیں گویا اسے بھی سکھانے پر کمر بستہ اسے ترکیب باواز بلند از پر کر رہی تھیں۔ دیا کو انہوں نے خشک میوہ جات صاف کرنے پر لگا رکھا تھا۔

بابا اسے دادی کے پاس چھوڑ کر جا چکے تھے۔ وہ شہری ماحول کی عادی تھی۔ یہاں اسے وقت بہت سست روی سے گزرتا محسوس ہوتا تھا۔ ماحول کی تبدیلی نے اس پر بیزارمی اور کسلمندی طاری کر رکھی تھی۔ حالانکہ تقریباً روز ہی گھر پہ سب سے فون پر بات ہوتی تھی مگر پھر بھی وہ ایلے جسٹ نہیں کر پا رہی تھی۔ زندگی پہ چھایا جمود اب اسے اکتاہٹ سے دو چار کرنے لگا تھا۔ مگر دادی کے خیال سے چپ تھی کہ اتنی جلدی اس کی واپسی کا سن کر ان کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ جب سے دادا کی وفات ہوئی تھی وہ رات اکیلی ہو گئی تھیں۔ بابا کو ہر وقت ان کے حوالے سے فکر لاحق رہا کرتی کیونکہ وہ ان کی منت مابست کے باوجود بھی شہر آ کے رہنے پر آمادہ نہ تھیں۔

”نہ پتر! تیرے بابا مجھے اس گھر میں بیاہ کر لائے تھے۔ میرا جنازہ بھی یہیں سے اٹھنا چاہیے پھر تیرے بابا کی ہی کیا۔ ہمارے سارے پرکھوں کی قبریں یہیں ہیں۔ میں ایسی بے وفائی نہیں کر سکتی کہ سب کچھ چھوڑ کر شہر جاؤں۔“

بابا کے سمجھانے اصرار کرنے پر دادی نے یہی کہا تھا اور وہ اپنی ضد پر قائم رہی تھیں۔ تب بابا نے ان کی تنہائی کا یہ صل نکالا تھا کہ دیا کو ان کے پاس چھوڑ دیا تھا۔

”اچھا ہے اماں! آپ اسے اپنے پاس رکھیں۔ ذرا اس کی تربیت بھی کر دیجیے گا۔ ورنہ اس کے بابا نے تو صرف لڑا پیار کر کے اسے بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ یہ نہیں پتہ مینی پر لیا دھن ہوتی ہے۔ اس کی شادی بھی نہ رہے۔“

اسی رات امی نے فون پر دادی سے کہا تھا اور دادی جی جان سے تیار ہو گئی تھیں۔

”سو بسم اللہ! کیوں نہیں پتہ میں اپنی دھی کو سینا پر ونا، گھر داری سب سکھا دوں گی۔ بس اللہ ہو پتا میری شہزادی جیسی صورت رکھنے والی پوتی کا نصیب بہت اچھا کرے۔“

اور اب دادی یقیناً اس کی تربیت کا ہی بیڑا اٹھائے ہوئے تھیں کہ ہر کام اس سے کرایا کرتیں۔ صبح خود نماز کو اٹھیں تو اس وقت تک ان کی پکاریں نہ تھمتیں جب تک اسے بھی وضو کے لیے واش روم لاند نہ کر دیتیں۔ پھر ہمیں پکارتا نہ ہوتا تھا۔ قرآن پاک کی تلاوت اور تسبیحات بھی ضروری تھیں۔ جبکہ وہ تو صبح کالج جانے سے ذرا پہلے اٹھنے کی عادی تھی۔ یہاں دادی اسے نماز پڑھ کے بھی سونے کی اجازت نہ دیا کرتیں۔

”بغیر عذر کے فجر کے بعد سونا جائز نہیں ہے پتر! منع ہے ہمارے مذہب میں۔“

وہ ہر بات اتنے پیارا اتنے رसान سے سمجھایا کرتیں کہ انکار کی ہمت اور جرأت مفقود ہو جایا کرتی۔ یہاں آنے کے بعد وہ شاید ہی پندرہ بیس دنوں میں کوئی نماز چھوڑنے پائی ہو۔ ورنہ گھر پہ تو وہ بھی کی مالک ہوا کرتی تھی۔ بی چا پڑھی نہیں تو نہ سہی۔ بابا کی تاکید اور امی کی سرزنش پہ وہ کہاں اتنا ان دھرنے کی عادی تھی۔ مگر دادی کی تو بات ہی الگ تھی۔ وہ صرف کہنا نہیں منوانا بھی جانتی تھیں۔

مگھانی سرد شام تیزی سے درود دیوار پر اترتی آ رہی تھی۔ ماحول میں خشکی کا احساس بڑھ رہا تھا۔ دھڑلے کپڑے اتارنے چھت پر آئی تھی اور دیوار سے بندھی ری سے ایک ایک کپڑا اکھینچنے لگی۔ کچھ کپڑے کپڑوں کے پروں کی کاٹ اور گنگنائے کی آواز سے گونج اٹھی۔

آہستہ پاس تیری روت میں اتر جاؤں

نظر کے پاس رکھوں مد سے میں گزر جاؤں

دیا چونک کر بیٹھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ منڈیر پر جھکا اپنے کپڑوں کو نہیں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی متوجہ ہوتے ہی بوفرانہ انداز میں مسکرایا اور جھٹ ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔ دیا صرف بڑائی نہیں صلق تک بیٹا رہی ہو گئی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ اسے چھت پر منڈا لاتے دیکھا کرتی تھی۔ اسے تو لگا تھا وہ اسی کا منتظر ہوتا ہے۔

گدھی سے بس بول وے

نہ چند سا ذی رول وے

آدلاں دیا جانیاں

تو کمر باندیاں آہستہ جا میرے کول دے
نہ چند ساڈی رول دے

وہ اب باقاعدہ لہک لہک کرتا ہنسی اڑا رہا تھا۔ دیا کا مارے فیسے کے چہرہ لال بھبھوکا ہوا۔ گو
اس کی بے نیازی کا شکوہ کیا جا رہا تھا۔ جتنے کپڑے وہ اتار چکی تھی انہی کو سینے پلٹ کر دیکھنے کا تحفظ
کیے بنا وہ دھڑ دھڑ کرتی سیر حیاں اتر آئی۔

”میں نے سوچا آج پاؤں پکا لیتی ہوں۔ گوشت لا دیا ہے۔ دھو کے بھی رکھ دیا۔ پکائے گی چھ
لاڈورانی۔“ اسی وقت دادی کچن سے نکلی تھیں۔ دیا نے جواب دیے بنا کپڑوں کا ذخیرہ چار پالی
پھینک دیا۔ وہ اس عاشق سے بیزار تھی مگر اس کا حل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ دادی کے دوبارہ کچن میں

جانے کے بعد وہ وہیں بیٹھ کر کپڑوں کو تہہ لگا کر رکھنے لگی۔ اداس شام چپکے چپکے در و دیواروں سے
جھانکتی رہی تھی۔ کھلے سے آئین میں بکھری اکٹائی سی دھوپ نے دھیرے دھیرے بے دلی سے اسے
پر سمیٹے اور واپسی کا سفر شروع کر دیا تو نیلا خاموش امبر پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ اور چبکاروں سے

بھرنے لگا۔ جامن کی شاخوں پر پڑے مہولے پر کوئی ننھی سی چڑیا شاید راستہ بھول کر آئی تھی۔ دھیرے دھیرے
دھوپ میں اونگھتے پتوں نے آنکھ کھول کر اس اجنبی مگر مانوس مسافر کو خوش آمدید کہا۔ اس کے ننھے دھوپ سے
سے مہولا ہولے ہولے ہلنے لگا۔ دیا کپڑے تہہ لگا کر انہی تو چڑیا ہڑبڑا کر پھر سے اڑ گئی۔ وہ کپڑے

الماری میں رکھ رہی تھی جب اس کے سیل پر پیپ ہونے لگی۔ کچن سے دادی بھی مسلسل پکار رہی تھیں
”دادی کو کیا فرق پڑا میرے آنے سے؟ وہ اکیلی تھوڑا سی تھیں۔ یہاں ہمسایہ کی عورتیں دن دن
ان کے پاس چکر لگاتی ہی رہتی ہیں۔ مگر میری زندگی کیسی اکٹاہٹ سے بھر گئی ہے۔“

وہ فون پر لائبہ سے شکوہ کناں تھی۔

”کوئی بات نہیں بجو! آہستہ آہستہ دل لگ ہی جائے گا۔“
لائبہ کی تسلی پر وہ بھڑک اٹھی۔

”مجبوری بھی آخر کیا ہے جو دل لازمی لگاؤں۔ واضح رہے یہ میرا سسرال نہیں ہے جو زبردستی
کروں۔“ اس کی اتنی سنجیدگی بلکہ رنجیدگی سے کئی بات پہ بھی لائبہ کی کھی کھی جاری ہو گئی تھی۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ؟ میری بے بسی کا مذاق اڑا رہی ہو؟“
وہ مرنے مارنے پر تل گئی۔ لائبہ فون پر ہی کھٹکھٹانے لگی۔

”نہ نہیں بھو۔ میں تو اس لیے ہنسی کہ سسرال میں زبردستی نہیں کرنی پڑے گی آپ کو۔
لگانے میں وہاں ہمارے وجہ بہ وکیل وینڈسم وولہا بھائی ہوں گے نا اس کام کو۔“

وہ جیسے اسے بہلا رہی تھی۔ مگر یہاں تو تھی کہ وہ بھل نہیں سکتی تھی۔ فون بند کیا تو پہلے سے زیادہ
کھول ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

دادی کو جب بھی کسی کام کی ضرورت پڑتی رضیہ کے لڑکے کو آواز دے لیتی تھیں۔ رضیہ کا گھر ان
کے سامنے ہی تھا۔ انہوں نے دروازہ کھول کر کھلی میں جھانکا۔ شاید کہیں کو کھیلتا نظر آ جائے۔

مگر کھلی خالی تھی۔ انہوں نے پلٹ کر دیا کو اندر سے کنڈی لگانے کا کہا اور خود کھلی پار کر کے رضیہ
کے دروازے پر آن رکھیں۔ رضیہ سامنے ہی نظر آ گئی۔ صحن میں ایک طرف بنے کھرے میں اپنے بچے
کو بہلا رہی تھی۔

”بہنی یہ کون سا وقت ہے بچے کو نہلانے کا۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔“
”کیا کروں مای اذرا کی ذرا اٹھا کر گئی تھی اندر وال نکالنے کو۔ سیدھا جا پڑا گوبر میں۔“

رضیہ بھی ننھی تھی۔ بچے کی گردن بغل میں دابے اس کی ناک میں صابن سے مل کر دھونے میں
صحن کے ایک طرف گھاس پھونس کے چھیرے تے بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ جن کی غلاقت کی
دھوپ میں اونگھتے پتوں نے دل اٹھاتا تھا۔ بچہ روتے ہوئے ناک میں چلانے لگتا تو رضیہ صابن سے بھرے ہاتھ کا ہی دھمو کہ اس
کمر پر بند دیتی۔ بچہ پہلے سے بڑھ کر گلا چھانڈنے لگتا۔

”آپاں نظر نہیں آ رہی ہیں۔ کچھ بھی کہیں نہیں تھا۔ مجھے تو اس سے کام تھا۔“
دادی نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے سے قبل اس کی ساس کا پوچھا۔ رضیہ کی آنکھیں نفرت سے سٹڑ گئیں۔

”ہو گی منٹے کے دورے پر۔ شام کو اس وقت آئے گی جب ہانڈی روٹی پک کے تیار ہوگی۔“
پاؤں پر بیٹے کی ہمدردی کے مروڑ الگ اٹھتے ہیں۔ وہ جو میری ہڈیاں توڑتا ہے اس کا پتہ نہیں۔ قسم سے

کئی رات پھر پار چوٹ کی مار لگائی مجھے۔ جسم نیلوں نل ہے۔ پیسے مانگ رہا تھا نٹے کو۔ میں نے
تھک کہہ دیا۔ ماں بہنوں کو سچ کر کر لے چکا پورا۔“

”دوپٹے کے ساتھ بچے کی ناک میں خشک کرتی وہ اپنے دکھ پھولنے لگی۔“
”مائی تو خود انصاف کر۔ سارا دن گدھی کی طرح کام کروں۔ اس پر ایسا بھی نہیں کہ دونوں کسی

کو ہی اٹھالیں۔ اب میرے ساتھ یہ چولہے میں سردے یا گوبر میں جا گھسے، مفت کی نوکر ہوئی میں
اس پر ماں بیٹے کی جھتیں سنوں۔“

”یعنی سخت حالات میں صبر سے گزارا کرتے ہیں۔ تیرا مرد گھر کی ناچاقی کی وجہ سے نشہ کرنے
کا سب سے بڑھ کر پریشانی کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ تجھے چاہیے تو عقل کے ناخن لے۔ ساس سے

بیٹھا بول بول اور شوہر کی دلجوئی کر۔ وہ سر کا سائیں ہے تیرا۔ خدا نخواستہ کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو سر کے روئے گی۔

دادی کی نصیحتوں پر رضیہ کے ماتھے پر سلونٹیں نمودار ہونے لگیں۔
"تو چھوڑ ماسی ان جھیلوں کو۔ یہ معاملے نہیں سدھرنے کے۔ لا پیسے دے۔ بتا جو منگنا ہے آئے تو منگادوں گی۔"

دادی کو صاف لگا وہ دوسرے لفظوں میں انہیں وہاں سے چلتا کر رہی ہے۔ وہ سخت دل برداشتہ واپس آئی تھیں۔

"عورت خود اپنا گھر لگاڑتی اور بناتی ہے۔ قدرت نے اس میں اتنی طاقت رکھی ہے کہ وہ معاملے سدھار سکے مگر رضیہ۔"

وہ دیا سے رضیہ کا سارا قصہ کہتی آخر میں تاسف سے گویا تھیں۔ دیا کیا کہتی۔ اسے نہ رضیہ دلچسپی تھی نہ اس کی کہانی ہے۔

☆ ☆ ☆

دادی کے کہنے پر وہ مرغیوں کے ڈربے سے انڈے لینے آئی تھی مگر کو دادی سے بھی مشتاق لگتا تھا اس کام کا۔ جیسی اس سے پہلے موجود تھا۔ دیا نے حیرانی سے اسے انڈے چراتے دیکھے۔ دادی سے وہ متعدد بار یہ سن چکی تھی کہ وہ انڈے چرا کر بھاگ جاتا ہے۔ اب وہ باقاعدہ چھوڑ چکی تھیں۔ مگر کو پھر بھی ہاتھ دے جاتا تھا انہیں۔
"نکو کے بچے! اک منٹ روکو تم۔"

اسے بے تحاشہ غصہ آ گیا جیسی زور سے چیخی۔ نکو اسے دیکھتے ہی بدحواس ہوتا بگٹ بھاگ کر کی چھت کو دوسری سے الگ کرتی درمیانی منڈیر پھلا گئی۔ ایک سے دوسری پھر تیسری چھت پر وہ لچوں میں غائب ہو چکا تھا۔
"بد تمیز کتنا بڑا چور ہے۔"

وہ جھنجھلائی تھی۔ اور ڈربے پر جھکی جو خالی پڑا منڈیر چراتا تھا۔ گہرا سانس کھینچ کر پھر اس دیکھا اور چونک گئی۔ منڈیر پر فونے ہوئے انڈے پڑے تھے۔ یقیناً بدحواسی میں نکلے کے چھوٹ گئے تھے۔ چھلکے انڈے کی زردی اور سفیدی۔ منڈیر پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تاسف کا دھڑکنے والا دیکھ کر دھڑکی۔ چارے کی شام آہستہ روی سے پھیلتی اس شفاف رنگت والی نازک لڑکی کا مسکرا کر نکلتی رہی۔ دن بھر کے سفر سے نڈھال شاہ خاں بڑی فراخ دلی سے اپنا زرد نارنجی رنگ

سنگاروں سے دھرتی کے سینے مکالوں کی پھتوں دیواروں کے سوکھے بدنوں اور بوڑھے درختوں پر پھیلا رہا تھا۔ منڈیر پر پھینکا کو اسے دیکھ کر اڑ گیا۔ وہ گہرا سانس بھرتی واپس بیڑھیاں اتر آئی۔ اس بات سے بے نیاز کہ وہ کبوتروں والا عاشق آج بھی غفلتی بانڈھے اسے دیکھتا رہا ہے اور اسے خبر نہیں ہونے دی۔

وہ نیچے اتر کر آئی اور بے دلی سے تخت پر جا بیٹھی۔ دادی رضیہ کے شوہر کی عیادت کو گئی تھیں۔ جو بیمار رہنے لگا تھا۔ دادی کو رضیہ کے شوہر سے پوری ہمدردی تھی۔ ان کا خیال واقف تھا اگر عورت چاہے تو ڈوبتی ناؤ کو بھی کھینچ کر ساحل پر لا سکتی ہے۔

"آزمائش کس پر نہیں آتی۔ یہ تو اولیا اور پیغمبروں پر بھی آتی ہیں۔"
وہ ناسمجھانہ انداز میں کہا کرتیں۔

"مگر دادی آپ سارا بوجھ عورت پر ہی کیوں ڈالتی ہیں۔ حالات کے سدھار کی ذمہ داری مرد پہ بھی تو عائد ہوتی ہے نا۔"

وہ اختلافی نقطہ اٹھا دیا کرتی۔ دادی جواباً مسکرائے لگیں۔

"یہ بی بی اللہ نے عورت میں ازل سے قربانی کا جذبہ اندر خدا رکھا ہے۔ بظاہر نازک نظر آنے والے جسم میں ہمت اور حوصلہ پہاڑوں جیسا ہے۔ اگر یہ چاہے اگر ہمت کرے تو بگڑے سے بگڑے مرد کو سدھار سکتی ہے۔ وہ بھی ایسے مرد کو جو اپنی بیوی کو اہمیت دے۔ اس سے محبت کرتا ہو۔ تو کیا رضیہ سے اس کا شوہر محبت کرتا ہے؟"

وہ نہ ان ہو کر سوال کر رہی تھی۔ دادی کچھ جھینپ گئیں۔

"ان دونوں کی محبت کی شادی ہے۔ خالہ خال کے دھڑپڑ ہیں دونوں۔ رضیہ کا جیسی تو ذال پتہ ہے کہ سانس برداشت نہیں کرتی اور اس کے کان بھرتی ہے۔"

"اچھا یہ بتائیں آج کیا پکانا چاہیے۔"

دیا نے بات بدل دی۔

"نوکھانا ہے بچی پکالے۔ میں تو سب کچھ ہی کھا لیا کرتی ہوں۔"

دادی کے جواب پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"نہیں خیال ہے مٹر پلاؤ۔ رائے اور سلاؤ۔ رات میں آپ کو کافی پلاؤں گی۔ مزا آ جائے گا بچی۔"

وہ ان کی تائید چاہ رہی تھی۔ جو دادی نے مسکرا کر اس کی پیشانی چوم کر اپنے انداز میں پیش کی۔

☆ ☆ ☆

اسے وہاں آئے ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس دوران ایک پتھر بابا کے ساتھ امی اور ذیشان اور ابا بھی یہاں لگا گئے تھے۔ شروع دنوں میں بیزار رہنے کے بعد جیسے جیسے سہمی مگر وہ ایڈ جسٹ کر رہی تھی۔ یہ نو مہر کا مہینہ تھا اور یہاں تو اکتوبر سے ہی سردی پڑنا شروع ہو چکی تھی۔ شدید سردی کے موسم کے آغاز کے ساتھ ہی دادی کو ہزاروں کام آپڑے تھے۔ سب سے زیادہ الجھن دیا کہ اس وقت ہولی جب دادی لحاف اوجیز کے بیٹھ گئیں۔

”صاف ستھرے تو تھے دادی! کیوں بکھیرا ڈال لیا۔“

وہ جھنجھلا سی گئی تھی۔ دادی کے اطمینان میں البتہ فرق نہیں آیا۔

”دوبارہ سے بھرائی کرائی تھی مابینے! پھر اب میں تمہیں ان میں ڈالنے بھی تو سکھاؤں گی اس طرح۔“

ان کے بڑے چاؤ سے کہنے پر دیا جیسے بیہوش ہونے کے قریب جا پہنچی۔

”پلیز دادی! مجھے نہیں سیکھنے۔“

وہ رو بانسی ہو گئی تھی۔ دادی ہنسنے لگیں۔

”نہ پتر ایسے نہ کہہ۔ سب کچھ والدین کے گھر سے سیکھ کر اپنے گھر جائے گی تو شوہر کے دل پر راج کرے گی۔ کوئی تنگی نہ ہوگی تمہیں کسی بھی نئے کام میں ہاتھ ڈالتے اور کام تو سب ہی کرنے پڑتے ہیں جیٹا! یہ تو طے ہے۔“

دادی نے مخصوص سبب سے سمجھایا۔ دیا ہٹ ہونٹ بھیج کر ناگواری دہائی۔

”مجھے تو ہر کام میں خود جان مارنے کی وجہ سمجھ نہیں آتی دادی! جو کام پیسے دے کر ہو جائے۔“

”نہ کرنا ہر کام میری دھی! مگر سیکھنے میں کوئی فرق ہے؟“

دادی کا انداز وہی ماسخانہ نرم اور وحیما و اپنائیت آمیز تھا۔ جس سے فرار ممکن ہی نہ تھا۔ جیسی محض ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئی۔

”پتر عورت کو ہر کام آنا چاہیے۔ مشکل اور آزمائش کے وقت میں فائدہ دے رہتا ہے۔“

”آپ کو الہام ہوا ہے کہ میری قسمت میں مشکل یا آزمائش ضرور آتی ہے؟“

وہ کھس گئی تھی اور دادی تڑپ۔ جیسی کتنی بے قراری سے اسے گلے سے لیا تھا۔

”میری تو دعا ہے دھی! کہ تیرا نصیب شہزادیوں سے بھی زیادہ اچھا ہو۔ مگر آنے والے وقت کا صرف اللہ کو ہی علم ہے نا۔ اللہ سے تو بہتری اور بھلائی کی امید ہے۔ مگر انسان کو ہر طرح کے حالات

کے لیے تیار ضرور رہنا چاہیے۔ تاکہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ شکوہ شکایت ناراضگی مسائل کا حل کبھی پیش نہیں کرنے۔ بلکہ ہکا بکا باعث بنا کرتے ہیں۔ مشکل حالات میں مضبوط اعصابی، چابک دستی اور صبر و استقامت سے ذات کا مقابلہ کرنا فتح و کامرانی کی کنجی ثابت ہوا کرتا ہے دھی رانی۔“ وہ پھر اسے سمجھا رہی تھیں۔ دیا محض سر ہلا کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

اس کی آنکھ کھلی تو وہ لفافے میں سگریٹ مٹی ہوئی پڑی تھی۔ ساری رات بارش بری تھی۔ صبح نماز کے لیے اٹھی تو آگن گیلیا اور فضا میں کبر تھا۔ ٹھنڈی مٹی ہوا کے جھونکے اسے کپکپا کے رکھ گئے تھے۔ سرویس میں بڑے والی بارش نے سردی کی شدت کو خطرناک حد تک بڑھا دیا تھا۔ وہ نماز بھی یہ مشکل ہی پڑ رہی تھی کہ چیمبوں نے برا حال کر دیا تھا۔ پھر دوبارہ سو گئی۔ اب جا کے آنکھ کھلی تو اس نے لفافے سے سگریٹ نکال کر کمرے کا جائزہ لیا۔ دادی کمرے میں نہیں تھیں۔ وہ آنکھیں کھولے کمرے میں اتنی روشنی نہ دیکھ سکی۔ دھندلی سی صبح تھی۔ کھلے دروازے سے دھند کے بولے سے اندر چلے آ رہے تھے۔ اس نے جہانی لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دادی کا بستر اور لحاف سمٹا ہوا تھا۔ کھلے بالوں کو سمیٹتے اس نے پتر بستر سے نیچے لٹکائے اس سے پہلے کہ اٹھ کر باہر نکلتی۔ دادی اس کے لیے ناشتہ لیے چلی آئی تھیں۔ وہ یکدم شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

”بڑے دیا ہوتا دادی! میں خود بنا لیتی۔“

”کوئی بات نہیں پتر! تو ہی بناتی ہے ہر روز۔ اب طبیعت بہتر ہے؟“ ناشتہ کر لے۔ مجھے رضیہ کی طرف جانا ہے۔“

دادی کا انداز واضح طور پر بھجا بھجا محسوس کر کے وہ بے طرح پڑ گئی۔

”کیوں دادی خیریت؟“

وہ جانتی تھی دادی عام عورتوں کی طرح مٹے گھروں میں فضول جا کر بیٹھنے کی عادی کبھی نہیں تھیں۔ پھر اتنی صبح وہ بھی اس کی طبیعت کی خرابی کے باوجود

”ناراض فوٹ ہو گیا بھاس کا۔“

دادی کی اطلاع پر دیا دھک سے رہ گئی۔ ان کی ساری کہانی دادی نے اتنی بار دہرائی تھی کہ وہ بھی آگاہ تھی۔ پھر اتنی جوان موت کا اچانک صدمہ۔ وہ اس ہی زاویے پر فیضی رہ گئی۔

”ساری رات گھر نہیں آیا تھا نمانا! بیچاری بڑھی ماں برقی بارش میں چھاتا لیے رات بھر ڈھونڈتی پھرتی مگر نہ مانا تھا نہ ماں۔ صبح لوگ فجر کی نماز پڑھ کر لوٹ رہے تھے تو کلوڑ کے گندے نالے کے

قریب گرا ہوا ملا۔ اللہ جانے کیسے جان دی ہوگی سک سک کے بچارے نے۔
 دادی کی آواز بھرا گئی۔

”غلط کاموں کے ہمیشہ غلط ہی نتیجے نکلا کرتے ہیں دادی! وہ غلط راستوں پر چل نکلا تھا تو انجام ایسا ہی ہو سکتا تھا پھر۔“

وہ کسی قدر نرموٹھے پن سے کہہ کر اٹھ کر منہ دھونے چلی گئی۔ کچھ دیر قبل کے احساسات جامد ہو چکے تھے۔ واپس آئی تو ناشتے کی سمت اطمینان سے توبہ دینے لگی مگر دادی تو جیسے اس کی خاطر تھیں۔

”وہ شروع سے ایسا تھوڑا ہی تھا پھر حالات کی ستم ظریفی کی نذر ہو گیا بچارو۔“
 دادی کے رنجیدہ لہجے میں ملال بھی شامل ہو چکا تھا۔ دیا چند نوالوں سے زیادہ نہ لے سکی اور چائے کا گک اٹھا کر ناشتہ ختم کیا۔

”ایسے مردوں کو راہ راست پر لایا بھی کیسے جاسکتا ہے دادی! جو سمجھ رکھنے کے باوجود راہ سے بھٹک جائیں۔“

اس کے سخت لہجے میں واضح سختی اتر آئی۔

”انسان خطا کا پتلا ہے پتر! غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ پھر حالات ہی انسان کو مایوس کرتے ہیں یا حوصلہ مند بناتے ہیں۔ مگر اس غلطی کو نہ سدھارتا ہی اصل غلطی ہے۔ مایوسی سے نہ نکلنا ہی دائمی تباہی ہے۔ بسا اوقات انسان کو خود اپنی غلطی کا احساس باقی نہیں رہتا۔ یا گناہ کی لذت اور کشش ہی اسے اتنا مسحور کر دیا کرتی ہے کہ اندر کا یہ فطری احساس وحیما پڑ جاتا ہے یا مت کر رہ جاتا ہے۔ ایسے میں اس سے وابستہ لوگوں کا فرض ہے کہ اسے بھلائی اور ہدایت کے رستے کی طرف بلائیں اور پھر بیوی کا رشتہ تو ایسا رشتہ ہے جو بہت مضبوط ہی نہیں بہت قریبی بھی ہوتا ہے۔ عورت اپنے مرد سے پیار محبت اور توجہ دے کر جو چاہے کرا لے۔ مرد کی کمزوری بنایا ہے قدرت نے عورت کو۔ اس کے بغیر مرد کبھی خود کو مکمل اور آسودہ محسوس نہیں کرتا اور خاص طور پر وہ عورت جس سے مرد کو محبت ہو۔ وہ مرد سے کچھ بھی کروالینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔“

دادی کے الفاظ میں ایسی تاثیر تھی جو دلوں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ وہ بھی غصہ بھول کر مسکرائے گئی۔

”ہاں یاد آیا۔ آپ نے بتایا تھا مجھے، دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ پھر تو رضیہ نے واقعی عجیب حرکت کی۔“

دادی نے اس کی بات پر گہرا سانس بھرا تھا۔

”پتر اس رشتے میں اگر پہلے محبت نہ بھی ہو تو بعد میں اللہ کی طرف سے ڈال دی جاتی ہے۔ دو انجان غیر اور اجنبی انسان ایک ہوتے ہیں تو اللہ ہی ہے جو انہیں ایک دوسرے کو پیار کرنے اور سمجھوتے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ان میں بھی محبت تھی۔ مگر حالات کے بدلتے رخ نے رضیہ کو کھنور کر کے دیا۔ ذمہ داری نبھانے کی بجائے وہ بری الزمہ ہو گئی۔ شامی اور بیزار۔ اب نقصان سامنے ہے۔ نیک اور پارسا عورت وہی ہے جو رشتہ ازدواج کو خوبصورتی سے بھاتی ہے۔ اس رشتے میں توازن رکھنے میں سب سے زیادہ کردار ہی بیوی کا ہوتا ہے۔ تحمل مزاج اور خوش اخلاق عورت نہ صرف اپنے شوہر کے دل پر راج کرتی ہے بلکہ اسے غلط راستے سے صحیح پر بھی لاسکتی ہے۔ رضیہ کے شوہر کی زندگی تو اتنی ہی تھی۔ مگر جس انداز میں اس کی موت ہوئی اس میں یقیناً حالات کے ساتھ ساتھ رضیہ کی بھی کوتاہی اور زیادتی شامل رہی ہے۔“

دادی نے حسبِ حادث طویل ٹیکچر دیا تھا۔ پھر اس رنج و ملال کے انداز میں گھٹنوں پر ہاتھوں کا دباؤ ڈالتی انہی تھیں۔

”دروازہ بند کر لو اور میری آواز پہچان کر ہی کھولنا۔“

دادی تاکید کرتی چلی گئیں۔ دیا ان کے پیچھے ڈیوڑھی کا۔ آئی۔ دروازہ بند کیا اور نیم گیلہ صحن عبور کر کے پھر سے کمرے میں آ گئی۔ اس کی سوچوں کا محور رضیہ اور اس کے بچے ہی تھے۔ پتہ نہیں جو دادی کہہ رہی تھیں وہ کتنے فیصد صحیح تھا۔ وہ یہ سوچ کر ہانک رہی تھی کہ عورت سے ہی ہر کوئی کیوں قربانی مانگتا ہے۔ اس کا شوہر اس کے بچے اس کے گھر والے اور یہ معاشرہ بھی۔ وہ جتنا سوچتی اسی قدر آزرہ ہوتی جا رہی تھی۔

پچھلے کئی دنوں سے چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ آج بھی صبح سے لگاتار بارش ہو رہی تھی۔ کبھی تیز ہو چھاز کبھی ہلکی پھلکی اور ایسی ہی ہلکی پھلکی پھوار میں بابا، امی، ڈیشان اور لائبہ جب اچانک ہنا کسی اعلان کے چلے آئے تو اس کی خوشی کا جیسے کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ چہرا جو پہلے ہی کم روشن نہیں تھا اس میں کچھ اور بھی جھومکا اٹھا۔ وہ سب سے پہلے بھاگ کر بابا کے کاندھے سے لگی تھی۔

”آپ سب سے زیادہ یاد آتے ہیں مجھے۔“

”بابا نہیں۔ صاف کہیں ان کی لافیاں اور فرمائشیں پوری کرنا مس کرتی ہیں آپ۔“

لائبہ نے ہنک کر کہا تھا وہ اسے گھورنے لگی۔ لائبہ نے ہنستے ہوئے اسے لگے لگایا تھا۔

”رنگیلی میں آپ کو بہت مس کرتی ہوں۔“ وہ اس کے گال کو چوم کر مستی میں ہوئی۔ دیا نے اس

مکے پر اسے ایک زور کی دھپ لگا دی۔

”اچھا چھوڑو۔ امی اور ذیشان سے تو ملے دو۔“

وہ زبردستی اس سے الگ ہوئی پھر ماں اور بھائی سے بھی اسی جوش سے ملی تھی۔

”میں بہت اداس رہنے لگی ہوں امی! ختم کر دیں یہ سزا۔ ہم سب اکٹھے بھی تو مل کر رہ سکتے

ہیں۔“ وہ چلتی ہوئی اور ذیشان و انت نکالنے لگا۔

”جی ہاں۔۔۔ رہ سکتے ہیں مگر ہم سب۔ آپ نہیں۔“

”کیوں؟ میں کیوں نہیں؟“ وہ چھانکھانے کو دوڑی۔

”بھئی آپ کو سسرال بھیجے گا ارادہ بن گیا ہے نا۔“

ذیشان کے چہک کر دیئے جواب نے دیا کا چہرہ فریق کر کے رکھ دیا تھا۔ اس نے بے اختیار امی کو دیکھا جو ذیشان کو گھور رہی تھیں۔ یعنی یہ خاموش اشارہ تھا زبان بندی کا۔ دیا کا دل دھک سے رو گیا۔ وہ شام کی سی ہوتی انھی تھی جب ذیشان نے اس سے پکڑوں اور ٹکٹوں کی فرمائش کر دی۔ وہ کچن میں آئی تو امی بھی ہمراہ ہوئی تھیں۔ بابا حسب عادت آتے ہوئے ڈھیروں سامان لائے تھے۔ جسے امی ان کے ٹھکانوں پر پہنچا رہی تھیں۔ ساتھ لائپہ دکرانے لگی۔ ساری ہنریاں دھو کر فریج میں رکھیں۔ جام، دانتے اور ڈبل روئی کے پیکٹ بھی سلیپے سے فریج میں رکھ دیئے۔ وہ گم صم ہی پالک کا تھی رہی۔ امی نے کام کے دوران اک دو بار اسے دیکھا ضرور تھا۔ کچھ کہنے سے گریز برتا۔ اس کا رزلٹ آچکا تھا۔ وہ جانتی تھیں اب وہ ماسٹرز کرنا چاہتی ہے۔ جبکہ امی اور دادی کا خیال پختہ تھا اس کی شادی کا۔ دونوں اپنی بات پر قائم بھی تھیں۔

پچھلے دنوں امی کی کوششوں کے نتیجے میں اک دو اچھے رشتے بھی آئے تھے۔ امی آج اسی سلسلے میں دادی کے پاس آئی تھیں۔ یہاں سے ساس بہو کا ارادہ بابا کے ساتھ جا کر لڑکا دیکھنے کا تھا۔ یہ ساری اطلاعات ابھی کچھ دیر قبل اسے ذیشان دے چکا تھا۔ تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے تھے۔

”کیوں پیچھے پڑ گئی ہیں آخر امی میرے؟ پڑھ تو لینے دیں سکون سے۔“

وہ جھنجھلا گئی تھی۔ جیسی چیخی۔

”ہم ہمیشہ کے لیے آپ سے جان چھڑانا چاہتے ہیں بھو! قسم سے وہاں آپ کے بغیر اتنا خزا

رہا ہے کہ بس کیا ہی بتاؤں۔ نہ فکر نہ فاقہ بس عیش کر کا کا۔“

وہ جھوم رہا تھا۔ ٹٹنا رہا تھا اور یقیناً اسے چھین رہا تھا مگر دیا کی آنکھیں جانے کس احساس کے

تحت لبالب پانوں سے بھر گئیں۔

”جان چھڑانا ہے تو مجھے کسی کنویں میں دھکا دے آؤ نا۔“

وہ اسے دھکا مار کر بذیانی ہو کر بولی۔ ذیشان تو بوکھا سا گیا تھا۔

”ارے رے۔ اک چندم سے بندے کو بھلا ہم کیوں اتنی پیاری سی لڑکی سے محروم کریں۔

قسم سے بہت ڈرنگ ہیں۔ دیکھیں گی تو بس دیکھتی رہ جائیں گی۔“

ذیشان نے اسے چپ کرانے پہلانے کو کہا تھا۔ وہ ہونٹ کچلتی رہی اور بھیگی آنکھوں سے اسے

گھورا۔

”وہ جتنا بھی پیندم ہو۔ مگر سن لو مجھے ماسٹرز کرنا ہے۔ میں بابا سے خود بات کر لوں گی۔ اور اس

نے یہ محض دھمکی نہیں دی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد جب وہ سب کمرے میں دیکتی انگلیٹھی سے

آگ تاپتے چائے اور ابلے ہوئے انڈوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے تب دیا نے اپنے ازلی اعتاد

کے ساتھ یہ بات بابا سے کہہ ڈالی تھی۔

”ہاں تو پڑھ لینا ہم کون سا معنی کے ساتھ ہی فوراً شادی بھی کر دیں گے۔ ابھی تو صرف لڑکا

دیکھنے جاتا ہے۔“

جواب بابا کی بجائے امی کی طرف سے آیا تھا۔ جنہیں اس کا یوں منہ پھاڑ کر شادی سے باپ کو

منع کرنا ایک آنکھ نہیں بھلا کا تھا۔ جب ہی بے حد جزیب ہو کر بولی تھیں۔ بابا کے تاثرات البتہ مارل

تھے۔ وہ بچوں کو اپنی آزادانہ رائے دینے کے حامی تھے۔

”آپ فکر نہ کریں بیٹے! اگر آپ ماسٹرز کرنا چاہتی ہیں تو ڈونٹ یووری۔ ہم آپ کی تعلیم مکمل

ہونے کے بعد ہی آپ کی شادی کریں گے۔“

ان کی تسلی نے امی کو سب سے زیادہ پرو فراشت کیا تھا۔ جیسی ناگواری دبائے بغیر بول پڑی

تھیں۔

”میں کہے دے رہی ہوں اگر لڑکا مجھے پسند آ گیا تو میں ہرگز یہ رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دوں

گی۔ آج کل پتہ ہے کتنی مشکل ہوتی ہے اچھا بڑا دھوٹے نے میں۔ صاحبزادی کے مزاج نہیں ملتے اس

پر باوا ہیں کہ ہاں میں ہاں ملائے جاتے ہیں۔“

انہوں نے پہلی تنبیہ بابا اور دیا کو جبکہ آخری بات شکایتی انداز میں دادی کو سنا کر کہی تھی۔ ساتھ

عیا اپنا ارادہ بھی ظاہر کر دیا۔ دیا پھر سے بے چین مضطرب ہونے لگی۔

”تو بیگم صاحب آپ اپنا کام کریں۔ اگر لڑکا واقعی اچھا ہو تو ہم بھی پاگل نہیں جوا نکار کر دیں۔“

بابا کے کہنے کی دیر ہوئی دیا سخت احتجاجی انداز میں رو ہانسی ہوتی جھٹکے سے اٹھی تھی۔ اسے نرم نظروں سے دیکھتے بابا محبت و شفقت سے مسکرائے مگر وہ بھرپور ناراضی دکھاتی دھپ دھپ کرتی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی اور کچن میں آکر فنگ فنگ کر ایک ایک برتن دھوئے لگی۔ بابا سب کے سب سے اٹھ کر اس کے پیچھے وہاں آئے تھے۔

”خفا کیوں ہوتی ہو بیٹے! مگنی ہو بنے میں بھلا کیا حرج ہے۔ آئی پر اس و دیو۔ شادی ہم آپ کی تعلیم مکمل ہونے پر کریں گے۔ آپ کی ماں بھی خوش ہو جائے گی۔ چلو اب مسکرا کر دکھاؤ اپنے بابا کو۔“

وہ ہر صورت اس کا موڈ بحال کرنے کے متعین تھے۔ وہ جیسے ہی مسکرا دی۔ بابا مطمئن ہونے لگے۔

☆ ☆ ☆

بابا دیا کا ایڈمیشن یونیورسٹی میں کرانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ادھر امی کو رشتہ بھی تھی جان سے پسند آچکا تھا۔ آتے ہوئے ساتھ لڑکے کی تصویر بھی لائیں۔ اب لڑکے والوں کو اسے دیکھنے آنا تھا۔ دیا، دادی کو قائل کر رہی تھی کہ وہ بھی ان کے ساتھ شہر چلیں۔ دادی کسی طور بھی آمادہ نہ تھیں۔ دیا انہیں اکیلے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ انہیں رمانیت اور محبت سے قائل کر رہی تھی اور یہ اس کی منت سماجت ہی تھی کہ دادی کو اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑ گئے تھے۔ وجہ یہی تھی کہ وہ ان کے بیٹے کی پہلی اولاد ہونے کے باعث اسے بے حد عزیز تھی۔ جب اس نے ناراضی دکھائی تو انہیں مانتے ہی بن پڑی تھی۔ دو دن بعد بابا نے انہیں لینے آنا تھا۔ دادی آج کل اپنی ہمسایوں سے ملتی پھرتی تھیں اور رخصت لیتی تھیں۔ اپنا گھر چھوڑ جانے کے خیال سے اداس بھی لگتی تھیں۔ یہ اس گھر میں ان کی آخری رات تھی۔ دادی اپنے بستر پر سکون کی نیند سو رہی تھیں۔ جبکہ دیا کی آنکھ ایک آدھ گھنٹہ کی نیند کے بعد کھل گئی تھی۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ یونہی کروٹیں بدلتے جانے کتنا ناگم بیت گیا۔ رات اپنے اندر ہزاروں ہمید چھپائے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ وقفے وقفے سے چوکیدار کی سیٹی کی گونجنے والی آواز کے علاوہ اندر باہر خاموشی کا راج تھا۔ معاذیکدم سرد ہواؤں کے جکڑ چلنے لگے۔ دو گھر چھوڑ کے تیسرا گھر اہل تھیہ کا تھا۔ جن کی مچھت پر نصب سیاہ پرچم کے سرے پر لگے ٹھنڈے ہوا سے بچتے تو لگتا جیسے آدھی رات کو کوئی چڑیل مستی میں آکر رقص کرنے لگی ہے۔

دور کہیں سے بھونکتے کتے کی آواز اور فضا میں دراڑ ڈالتی جھینکروں کی آواز کے ساتھ دادی کے بلکے خراٹے بھی اس کی بے چینی کا باعث تھے۔ لائپ بھی سوتے میں خراٹے لیا کرتی تھی اور اسے اپنی

ہی چڑ ہوا کرتی۔ بغیر لحاظ کے اسے جھنجھوڑ کر جکا ڈالتی۔ وہ بیچاری پھر جاگے یا سوئے۔ یہ آرام سے سو جاتی۔ اگلے دن لائپ ڈھیروں شکایتوں کے ساتھ بابا کے آگے فریادی بنی کھڑی ہوئی مگر اس کے سامنے بھلا اس کی کہاں چلتی تھی۔

”اٹھ کرے آپ کا شوہر اتنی زور سے خراٹے لیا کرے کہ آپ سونے کو ترسیں۔“ لائپ کی ایک نہ چلتی تو وہ بددعاؤں پر اتر آتی۔ اس وقت بھی اسے لائپ کی بددعا یاد آئی تو وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی پھر پیاس محسوس کر کے بستر سے اترتی تھی اور سر ہانے پڑی میز سے پانی کا جگ اٹھایا۔ جو خالی تھا حالانکہ دادی کی عادت تھی رات کو پانی ڈال کر ڈھک کے رکھنے کی۔

”شاید بھول گئی ہوں۔“

وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ باہر جانے کی اس میں بہت نہیں تھی۔ مگر پیاس کا شدید احساس حق میں کانٹے سے چھوٹنے لگا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد وہ بالآخر پھر سے اٹھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کچھ سوچا پھر دل کڑا کر کے باہر کچن تک جانے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ دادی کی نیند خراب کرنے کا اس کا دل نہیں چاہا۔ دروازے کی چھٹی گرائی اور سر ہانے پڑی شال اٹھا کر باہر برآمدے میں آگئی۔

ڈیوڑھی میں جلتے اندر بی سیور کی روشنی محض تک بھی پہنچ رہی تھی۔ چاند غائب تھا۔ ہر شے پر خاموشی اور پراسراریت کا تاثر قائم تھا۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتی کچن میں آگئی۔ مہم میں روشنی کچن کی کھڑکی کے راستے اندر آ رہی تھی۔ اس نے لائٹ آن کیے بغیر سنک سے گلاس اٹھا کر سنک کی نوٹنی کھول کر گلاس بھرا۔ ابھی گلاس منہ کی جانب لے کر بھی نہیں گئی تھی کہ فضا میں گونج اٹھنے والے فائر کی آواز سے اس کا دل کانپ کر رہ گیا مگر اصل وہشت اس پر اس وقت طاری ہوئی تھی جب مندر سے یکے بعد دیگرے کئی سایوں نے محض میں چھلانگ لگائی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ خوف سے جمہد ہوتی جیسے اپنی جگہ پر سکتے میں آگئی تھی۔ پہلا خیال چوروں کا ہی تھا۔

وہ لمبے ترنگے آدمی جن کے چہروں پر سیاہ ڈھانچے اور ہاتھوں میں اندھیرے میں چمکتی راتھلیں تھیں۔ دندنا تے ہوئے آگے بڑھ کر آگے کے کھلے دروازے سے اندر بھی جا گئے۔ دیا کو اک بل کو لگا اس کا دل مارے خوف کے کسی بھی لمحے بند ہو جائے گا اور وہ ابھی بیہوش ہو کر گرے گی۔ خوف سے ساکن آنکھیں لیے وہ اسی حالت میں کھڑی باہر جھانکتی رہی۔ کچن کی لائٹ نہ جلا تا اس کے لیے کتنا مفید ثابت ہوا تھا۔

”او بیٹھو! اٹھو۔ تیرے باقی گھر والے کدھر ہیں؟“

اس نے وہیں کھڑے کھڑے اک کرخت آواز سنی تھی۔ اس کی ناخنیں دادی کا خیال آتے ہی

کا پنے تکیوں جو ان وحشیوں کے رحم و کرم پہ آگئی تھیں جو سفاکیت و بے رحمی میں سرفہرست گردانے جاتے تھے۔ ”چابیاں نکال بڑھی! سونا نقدی جو بھی ہے شرافت سے نکال کر ہمارے حوالے کر دے۔ اور کیا تو گھر میں اکیلی ہے؟“

وہی سفاک آواز پھر گونجی۔ دیا کا دل دھک دھک کرنے لگا تو جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ جانے دادی کیا کہتی اب۔

”یقیناً نہیں۔ بڑھی کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ کھانا ہوا دروازہ اور خالی بستر گواہ ہے کسی دوسرے کی موجودگی کا۔ کہاں ہے وہ؟ کہیں اسے پتہ تو نہیں چل گیا ہماری موجودگی کا اور یقیناً مانی کا بابا ہوگا۔ واش روم چیک کرو امانت اور اسے فوراً قابو کرو۔“

ایک اور گھمبیر تر بھاری آواز گونجی۔ جس میں بلا کا یقین اور استحکام تھا۔ دیا کو اپنا وجود سن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ یقیناً اب اس کی خیر نہیں تھی۔ اس تک رسائی حاصل کرنے کو ان وحشی درندوں کو یقیناً زیادہ ٹائم نہیں لگتا تھا۔ برآمدے کے پاس کھڑا ہوا دادی چونکے انداز میں آگے بڑھا تھا۔ اس کا رخ واش روم کی جانب تھا۔ دیا کے دماغ نے لمحے کے ہزار ویں حصے میں کام کرنا شروع کیا۔ اس نے نظریں گھما کر اپنے دفاع کے لیے کسی چیز کو تلاش کیا تھا۔ مٹا اس کی نظر کچن کی سلپ پہ چاؤل پکانے کے بھاری مضبوط پیچھے پر پڑی۔ اس نے سرعت سے وہی اٹھا لیا تھا اور اسی محتاط انداز میں دروازے کی اوٹ میں ہو کر کھڑی ہو گئی۔

واش روم کو خالی پا کر وہ جانتی تھی ڈھونڈنے والے نے یہاں بھی آنا تھا۔ وہ ہرگز بھی آسان ہدف نہیں ثابت ہونا چاہتی تھی۔ دیا نے لمبے سائے کا رخ اس سمت ہوتا دیکھا تھا اور دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ پیچھے کے دستے پر اپنی کانپتی انگلیوں کی گرفت سخت تر کی اور جس ہل وہ لمبا آدی اندر گھسنا دیا نے پوری قوت سے چیخ گھما کر اس پر آؤ تاؤ دیکھے بغیر وار کر دیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی اندر وہ لوگ دادی سے کیا سلوک کر چکے تھے۔ اس کی دھڑکنوں کا شور اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اور کچھ سنائی ہی نہ دیتا تھا۔ اس ہل اس کے خوف پر وحشت کا بیجان آمیز احساس غلبہ پائے ہوئے تھا۔ وہ جیسے ہر انجام سے بے نیاز مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔ آنے والے نقاب پوش کو بھلا کسی بھی عام فرد سے ایسا چاہنا دستی اور پلاننگ کے ساتھ اس بہادری کی توقع نہیں تھی۔ جیسی کچھ لمحوں کو سکتہ زدہ رہ گیا۔ نقاب اس کے چہرے اتر گیا تھا اور سر سے بھل بھل بیہوش اس کی پیشانی اور گردن کے ساتھ دامن کو بھی رقبہ کر چلا گیا تھا۔

دیا نے دوبارہ اسی شدت سے اس پر حملہ آور ہونا چاہا مگر جب تک وہ اس لمحاتی سکتے سے نکل کر

پلندہ آواز میں مفلکات بکنا کسی بھیڑیے کی مانند ہی اس پر جھپٹا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اس کی تحویل میں باقی اور وہ اسے کوئی نقصان پہنچا سکتا۔ اک بھاری بھر کم رنگ آواز نے فی الفور مداخلت کر دی تھی۔

”امانت چھوڑ دو اسے۔“

دیا نے اس منیت غائبانہ پر بے ساختہ چونک کر سر گھمایا۔ بھاری تن و توش کا وہ طویل القامت شخص نقاب میں چھپا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں اتنی سرخ تھیں کہ دیا ایک لگاؤ ڈال کر ہی دہل سی گئی تھی۔

”کیوں چھوڑ دوں؟ تم دیکھ نہیں رہے ہو اس نے میرا ستر۔“

دوسرا آدی زخمی درندے کی مانند ہی غرایا تھا مگر آنے والے نے سرد انداز میں ہاتھ اٹھا کر چیخ میں ہی اس کی بات کاٹ ڈالی تھی۔

”تم باہر چل کر گاڑی میں بیٹھو۔ ہم ابھی آرہے ہیں۔“

آنے والے لمبے آدی نے اپنے مخصوص سرد اور دہنگ انداز میں حکم جاری کیا تھا۔ جبکہ اس کا زخمی ساتھی بے حد خفا نظر آ رہا تھا۔ دیا ان دونوں پر دھیان دینے بغیر وہاں سے بھاگ کر اندر کمرے میں دادی کے پاس آئی تھی اور ہراساں و دہشت زدہ سی نیمٹی دادی سے چٹ گئی۔ وہ یوں ساکن تھیں جیسے خوف اور شدید سدمے نے ان کی قوت گویائی سلب کر لی ہو۔

”تم سب واپس چلو۔“

اسی لمبے سرخ آنکھوں والے نے اندر آ کر حکم جاری کیا۔ وہ غالباً ان کا سرغنہ تھا۔ الماری و فرنگوں وغیرہ سے سونا نقدی تلاشتے۔ ہنگامہ مچانے والا اور دادی پر گمن تانے کھڑا نقاب پوش اس حکم نامے پر ششدر ہو کر رہ گئے۔

”کیا کہہ رہے ہو؟ یہ ہمارے اصولوں کے منافی ہے کہ ہم۔“

”ڈونٹ وری! ہم یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جائیں گے۔“

اپنے ساتھیوں کو تسلی سے نوازتے اس لمبے آدی نے دیا کو اپنی خونخوار سرد آنکھوں سے جیسے دیکھا تھا۔ اس انداز نے دیا کا دھڑکنے والا دل یکدم بند کر کے رکھ دیا۔ اس سے قبل کہ وہ اور دادی کچھ سمجھ پاتیں اس لمبے آدی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر بید روی و سفاکی سے دیا کو اپنی جانب گھسیٹ لیا۔ دادی بے اختیار جھپٹیں۔ اس مقام پر ان پر طاری سکتہ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ جبکہ دیا کے حلق سے نکلنے والی چیخ کا کٹا بیہوشی کی دوامیں بیٹھے رومال نے اس کے چہرے کے نزدیک آتے ہی گھونٹ کے رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد دیا کو لگا تھا ہر شے پر اندھیرے مسلط ہو گئے ہوں اس کی قسمت کی طرح۔ اس کے وجود کی طرح۔

☆☆☆

رات تاریک اور خاموش تھی۔ رات بھر گرنے والی اوس میں بجلی سڑک پہ تیزی سے آگے بڑھتی جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنیاں پڑتیں تو شفاف بوندوں سے منعکس ہو کر جگمگا ہوا تھیں۔ سڑک کے دونوں اطراف کھڑے درخت بھی یوں ساکن تھے جیسے پتھر اگے ہوئے۔ جیپ میں بیٹھے چاروں نفوس خاموش تھے۔ چہروں پر بنور سیاہ ڈھانے تھے۔ صرف آنکھیں روشن تھیں۔ وہ چاروں لمبے قدوں اور بھاری جفے کے مالک تھے۔ مگر جوان میں سب سے طویل القامت تھا وہ سب سے چوکنا تھا۔

حالانکہ اس کے پہلو میں سیٹ پر پڑی لڑکی بالکل بے سدھ تھی۔ اسے احتیاطاً بیہوش کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک ڈاکوؤں کا گروہ تھا۔ جو آج پہلی بار کسی جگہ سے زیورات اور نقدی کی بجائے اس گھری عزت چاہا تھا۔ اور ایسا ان کے سردار نے کیوں کیا تھا اس بات کو اس گروہ کے باقی تینوں افراد سمجھنے سے قاصر تھے۔ ان کے سردار کی نظریں گما ہے بکا ہے بیہوش لڑکی پر اٹھیں تو وہ جیسے کسی سوچ میں ڈوب جاتا۔

چاروں اپنی جگہ پر لب بہت تھے اور گاڑی بہت سرعت سے آگے بڑھتی جاتی تھی۔ چرچ کی سیاہ عمارت کے پیچھے چاند ان کی جیپ کی رفتار کے ساتھ محو سفر لگتا تھا۔ باقاعدہ تعاقب کرتا ہوا۔ دن کے وقت مال کی شکل اور ہوتی ہے۔ مگر اس وقت عمارتیں بہت گرائنڈیل، سڑکیں کشادہ اور بتیاں بہت روشن تھیں۔ اکا دکا ہی کوئی گاڑی نظر آتی تھی۔ پوسٹ آفس کی سرخ و سفید سرکاری عمارت سے لے کر کرشن نگر کے آخری بس سٹاپ تک۔ رات کے اس پہر صرف سائن بورڈ اور لائٹس روشن تھیں۔ فلپا میں تہجد کی اذان کی پکار بھیل رہی تھی جب ایک گھبر موٹر سائیکل پر دودھ کے کین لاوے کچھ فاصلے سے گزرا۔

گاڑی کے شیشے مکمل طور پر سیاہ تھے۔ باہر سے اندر کا منظر دیکھنا خاص طور پر ناممکن تھا۔ پھر وہ شہر کے مضافات بھی بہت پیچھے چھوڑ آئے۔ گچھلی سیٹ پر بیٹھے نقاب پوش لمبے آدمی نے گہرا سانس پھر کے گن سائینڈ پر رکھ کر چہرے پر بند حارو مال اتار دیا۔ اپنے سر کے گتے لمبے بالوں کو سہلایا پھر بڑھی ہوئی شیو کو کھجاتا ایک بار پھر بیہوش دیا کو ٹکنے لگا۔ اس کی نظریں بے چین اور مضطرب تھیں۔

وہ جانتا تھا اس کے اس عمل سے اس کے ساتھی اس سے بہت فحاش ہیں۔ وہ خود اپنی اس حرکت پر بہت حیران تھا۔ اپنی بار پہ ششدر تھا۔ یہ لڑکی جتنی بھی پرکشش تھی مگر اس کا یوں ضبط کھودنیا بہت عجیب تھا۔ وہ اسے دیکھ کر دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں۔ جو بہت بڑی اور خوابناک تھیں اور ہونٹوں کو بھی۔ جن کی رنگت یا قوت کی طرح تھی۔ اس کے کھڑے ہونے۔ اٹھنے بیٹھنے کے انداز میں انوکھا سا وقار تھا۔ وہ کتنی فرصت سے اسے سوچ سکتا تھا۔ حالانکہ اس کو دیکھے کتنا کم ٹائم ہوا تھا مگر دل پر

واردات ہونے میں تو بہت ہی ثقلت ہوئی تھی۔ وہ جو ہمیشہ چھینٹا آیا تھا لوٹتا آیا تھا۔ خود کیسے لمحوں میں اٹ گیا تھا۔

امانت کو اسی نے کسی دوسرے فرد کی تلاش میں بھیجا تھا۔ اندر موجود بڑھیا کے لیے وہ بند سے کافی تھے۔ جب ہی وہ احتیاطاً امانت کے ساتھ ہو لیا تا کہ کسی بھی ہنگامی صورتحال سے نپٹنا پڑے تو آسانی رہے۔ اپنے ساتھیوں کی نسبت وہ بے حد محتاط اور چوکنا ہوا کرتا تھا۔ اپنی اسی سوجھ بوجھ کے باعث وہ آج تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ امانت کو دواش روم کی سمت جاتے دیکھ کر اس نے کچن کا رخ کیا تھا۔

کچن کے آگے سے گزرتے اسے کھڑکی کی جالی سے اندر جاتی روشنی میں لہراتا آنچل اور لمبی چوٹی نظر آتی تھی۔ وہ وہیں قہم گیا۔ وہ لڑکی توجھے زاویے سے کھڑی تھی۔ پھر اس کے دیکھتے ہی اس نے آگے بڑھ کر وہ چھپا اٹھایا تھا۔ وہ لازمی اس کی حکمت عملی پر غور کرتا اور اس سمت آتے امانت کو خبردار بھی کرتا اگر جو اس کے حواس سلامت رہے ہوتے۔

چنگی ہوئی چاندنی جیسا روپ رکھنے والی اس لڑکی میں ایسا کیا تھا جو پہلی نگاہ میں ہی اس کی سدھ بدھ چھین کر لے گیا تھا۔ یہ وہ قطعی سمجھنے سے قاصر رہا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی حسین لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں۔ اس کی زندگی میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین، طرح دار اور فیشن ایبل حسنا نہیں آئی تھیں۔ مگر وہ ہمیشہ روڈ اور لاطلق رہا تھا۔ اس کے باقی ساتھی وقت گزاری کو عورت کی صحبت اختیار کرتے اور اسے دعوت دیتے مگر وہ ہر بار طرح دے جاتا۔

گھراب اس کے وہی ساتھی جو عورت سے اس کی بیزاری اور گریز سے آگاہ تھے اس کے اچانک فیصلے کے پیچھے محرک سوچ رہے تھے۔

”مال تو تم نے اٹھائے نہیں دیا۔ اس لڑکی کو اٹھا کر لانے کی کیا تک ہنٹی تھی؟ بتانا پسند کرو گے مستقیم!“

راجو کا ضبط بالآخر جواب دے گیا۔ اس کی نظریں کاٹ دار تھیں اور لہجہ تند و تیز تھا۔ خلیفہ مستقیم نے چونک کر اسے دیکھا اور گہرا سانس کھینچتے ہوئے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”اگے ذاکے سے میں اپنا حصہ نہیں لوں گا۔ وہ مال سب میں برابر تقسیم ہوگا سوائے میرے۔“ یہ اس بات کا جواب تھا۔ عجیب فیصلہ تھا۔ راجو نے ہونٹ بھینچ کر خود کو کوئی بہت گری ہوئی بات کہنے سے یہ مشکل روکا۔ وہ اس وقت مستقیم کو طیش دلانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کے غصے کی خطرناکی سے آگاہ تھا۔ پھر ان کا سردار ہونے کی بنا پر اس کا حکم ماننا اور اس کے فیصلے کا احترام کرنا بھی ان پر لازم و ملزوم

تھا۔

”بشر کو فون ملا۔ اسے کہہ ہمارے پہنچنے سے قبل گھوڑے سمیت منتظر ملے۔“

اس کا مخاطب اب بھی راجو ہی تھا۔ اس کی بھاری بھر کم آواز جیب کے ماحول میں گونجی۔ اس نے قہیل میں جیب سے موبائل فون نکالا اور اس کا پیغام آگے اسی سپاٹ انداز میں منتقل کرنے لگا۔ خلیفہ مستقیم قدرے مطمئن ہو کر سیٹ پر ریٹکس انداز میں نیم دراز ہو گیا۔ اب وہ پھر اس بیہوش لڑکی کے لئے لگا تھا۔ اب کی مرتبہ اس کی نگاہوں میں پہلے کا سا تلخ نہیں تھا۔ بلکہ ایک انوکھی چمک تھی۔ جسے اس کے ساتھیوں نے حیرت سے دیکھا تھا۔ آج وہ ہر لحاظ سے گویا انہیں حیران کرنے پر تیار ہوا تھا کہ اس جیسے بے حسن کھردرے جذبات سے عاری شخص نے جیب کو لٹکنے والے جھٹکے کے نتیجے میں ڈھلک کر سیٹ سے نیچے گرتی ہنوز بیہوش لڑکی کو اس طرح سنبھالا تھا کہ گویا اپنی گود میں بھر لیا۔ جیب اب کچھ سڑک چھوڑ کر مٹی سڑک پر فرار لے بھر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس طویل سفر کا اختتام جس جگہ پہ جا کر ہوا وہ ایک بے حد ویران علاقہ تھا۔ جہاں دور دور تک آبادی اور ذی روح کا نام و نشان نہیں ملتا تھا۔ ایک عجیب وحشت انگیز سناٹا چار سو پھیلا ہوا تھا۔ ایک طویل و عریض قطعہ ارضی جس پہ آگے لاتعداد درختوں اور خورد رو جھاڑیوں نے اسے جنگل کا روپ دے ڈالا تھا۔ جیب وہیں آ کے رکی تھی۔ کھناک کھناک دروازے کھلے اور شفق کی لالی سے ابھرتے سورج کے گولے کے ساتھ وہ چاروں بھی جیب سے باہر نکل آئے۔ راجو نے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر ایک بے ہیت مگر مخصوص آواز نکالی جس کے نتیجے میں جنگل میں سرسراہٹ کو بجنے لگی۔ ساتھ ہی گھوڑے کی ہنہناہٹ بھی۔ جھاڑیوں کو ہٹا کر خشک چوں پر چلتا گھوڑے کی لگام تھامے کچھ توقف سے درختوں کے جھنڈ سے اک ویسا ہی بھاری جتنے کا آدمی سامنے آ گیا۔

”کون جائے گا گھوڑے پر؟“

آنے والے کے سوال پر راجو نے تلخ تاثرات کے ساتھ خلیفہ کی جانب اشارہ کیا۔ آنے والے نے پلٹ کر اپنے سردار کو دیکھا جو ان کی سمت متوجہ نہیں تھا۔

”اے سیاپے کا کیا کرتا ہے؟ کہو تو واپسی پر ندی میں پھینک آؤں۔“

راجو کا اشارہ ہنوز بیہوش دیا کی جانب تھا۔ لہجہ خار کھایا ہوا تھا۔ جو ظاہر کرتا تھا اس کا موڈ اب بھی بری طرح خراب ہے۔ آج ان کے درمیان اک تناؤ کی کیفیت تھی تو وجہ یقیناً دیا کی موجودگی یا عدم باعث تھا۔ خلیفہ مستقیم نے پلٹ کر سر و مگر تا وہی نظروں سے راجو کو دیکھا تھا۔ راجو یکدم ہونٹ بھیج گیا۔

ایسی تادیبی کا مطلب وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں۔ سب ہی مستقیم کی اس نظر سے خائف رہا کرتے تھے۔ وہ خاموش تھا مگر اس کا موڈ سرد مہر ہی تھا۔ اسی موڈ کے ساتھ خلیفہ مستقیم نے آگے بڑھ کر جیب کے کھلے دروازے سے جھٹکے دیا کو احتیاط اور نرمی کے ساتھ اپنے ہاتھوں پر اٹھالیا۔ امانت کے ساتھ ساتھ مسام اور راجو کو بھی گویا سانپ نے سونگھ لیا تھا۔ وہ برسوں قبل کا واقعہ ابھی تک بھولے نہیں تھے۔

جب سائندہ بانی نے جو اس پر دل و جان سے فدا ہو گئی تھی ہر ممکن طریقے سے اپنے دام میں پھانسنے کی کوشش کی تھی مگر تا کافی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اک رات جب ان کے ہاں عیش و طرب کی محفل عروں پر تھی۔ سائندہ کو جانے کیا سوچھی کہ رقص چھوڑ کر اس کے گلے لگ گئی تھی۔ وہاں موجود ان سب کی بیٹیوں اور قہقہوں کا گھلا اس وقت گھٹ گیا تھا جب خلیفہ مستقیم نے سائندہ کو ایک جھٹکے سے خود سے الگ کرنے سے بعد زناٹے دار ٹھانپنے سے اس کے حواس واپس لھکانے پر پہنچائے تھے۔

”یہ تھپڑ تمہیں آئندہ بھی میرے قریب آنے سے روکتا رہے گا۔ ہر کوئی ضروری نہیں کہ نفس کا اتنا کام ہو کہ تم جیسی عورتوں کے ہاتھوں کھٹونا بن جائے۔“

اس کے لفظ لفظ میں پھنکا رہی۔ نفرت تھی۔ وہ تن فن کرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ اور اپنے پیچھے ہر جتنی بھرا سناٹا چھوڑ گیا۔ وہ سب اس کی پرہیزگاری اور مضبوط اعصابی کے قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے مگر سائندہ ان کی دل جوئی اور بھردری کے باوجود بھڑکی رہی تھی اور وہ محفل بد مزگی کے باعث یونہی تم کر دی گئی۔ راجو اس وقت بھی مستقیم پر بہت خفا ہوا تھا۔

”ماتا تم زاہ خشک ہو۔ مگر ہمارا بھی کام خراب کر دیا۔ یار مجھے نہیں لگتا اب وہ واپس آئے کبھی۔“

”تو نہ آئے۔ میں لعنت بھی نہیں بھیجتا اس پر۔“

وہ جواب میں اسی شدید لہجے میں فرمایا تھا۔ راجو نے عاجز ہو کر اسے دیکھا۔

”تم کیا سمجھتے ہو خلیفہ مستقیم! اس عورت کے تعلقات صرف ہمارے ساتھ ہیں۔ وہ سیاستدانوں کی بیوی نہیں۔ افسروں کے بھی دل بہلاتی ہے۔ شدید خطرہ مول لے لیا ہے تم نے۔“

اب کے خلیفہ نے جواب نہیں دیا۔ اس نے جانا تھا راجو کچھ اتنا بھی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اگر وہ تمام باتوں کو نہیں گرفتار کر سکتی تھی۔ لھکانے کا پتہ ہی تھا۔ بھلے وہ بہت محتاط تھے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر بیہوش کر کے یہاں لائے تھے۔

”تو اس کا یہی حل ہے کہ تم آئندہ اسے نہ بلوانا۔“

اس کے پاس آسان حل موجود تھا۔ راجو جھجھلانے لگا۔

”ہم ہر کسی پر اعتماد بھی نہیں کر سکتے ہیں۔“

”اعتماد کرنا اتنا ضروری نہیں ہے۔ نہ ہی یہ شیطانی کھیل رہتا ہے۔“

اب کے خلیفہ مستقیم کا لہجہ واضح طور پر طنز یہ ہوا تھا۔ راجو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”مستر خلیفہ مستقیم یہ فطری تقاضا ہے۔ ہماری شادیاں نہیں ہو سکتیں۔ ہم اپنی اس خواہش

نہیں مار سکتے۔“

وہ اس سے بڑھ کر زبردست ہو رہا تھا۔ خلیفہ نے ہونٹ بھیجی لیے۔

”میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ لیکن بات صرف اتنی ہے کہ اگر کوئی کسی برائی سے

چاہے۔“

خلیفہ کے دو بدو جواب دیئے پر راجو کو آگے ہی لگ گئی تھی۔

”بہت ضبط ہے تمہیں خود پر۔ مگر میں دیکھوں گا تم ساری عمر اس پر بیڑ پر قائم رہو گے۔“

اب کہ اس کا انداز خلیفہ کو بھی برا لگ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غضب کی سرخیاں اتر

گئیں۔

”میں کبھی گناہ کا یہ راست اختیار نہیں کروں گا۔ ویسے بھی عورت ذات کی حقیقت میرے نزدیک

اتنی نہیں کہ اسے اس طرح اپنی کمزوری بنالوں۔“

اس کا لہجہ نفرت کی آغوش سے دھک رہا تھا۔ اور اس نفرت سے تو وہ سب آگاہ تھے۔ ہاں اس

وجہ معلوم نہیں تھی کہ وہ کب کسی کے سامنے کھٹا تھا۔ وہ کبھی کسی کو اتنی جرات بھی نہیں دیتا تھا کہ کوئی

کے اندر جھانک سکے۔

”تم گھوڑے پر بیٹھو خلیفہ! میں کرادیتا ہوں لڑکی کو سوار۔“

دیا سمیت گھوڑے کی پشت پر سوار ہونا مستقیم کے لیے مشکل ثابت ہو رہا تھا جسے محسوس

ہی حسام اس کی مدد کے خیال سے آگے بڑھا تھا۔ خلیفہ مستقیم نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کیا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کے لہجہ میں عجیب سی سرد مہر تھی۔ جو حسام کو بہت شدت سے محسوس ہوئی۔ مستقیم

کیفیات سے بے نیاز رکاب میں پاؤں اٹکا کر گھوڑے پر سوار ہوا تھا اور دیا کو کسی ننھی بچی کی

بہت سہولت سے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ ایڑہ اگنے سے قبل اس نے اسی سنجیدگی سمیت

حیران ساتھیوں کو دیکھا پھر راجو کو اپنے ساتھ گھوڑے پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔

”احتیاط لازم ہے۔ جلد واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچو۔ میں منتظر ہوں۔ فی امان اللہ!“

اس نے لگا میں کھینچ کر گھوڑا آگے بڑھا دیا تھا۔

”یہ واقعی خلیفہ مستقیم تھا؟ زاہد خشک متھی پر بیڑ گزار۔“

گھوڑے کے پاؤں کی دور ہوتی آواز کو سننا حسام اسی حیرت زدگی کے عالم میں بولا تھا۔

”نہیں اس کا بھوت تھا۔“

امانت اب بے ذہنت پن سے فہم رہا تھا۔ حسام نے کانڈھے جھٹکے اور جیب میں بیٹھ کر اسے

اشارت کرنے لگا۔ دوسری جانب اپنے مخصوص ٹھکانے پر پہنچ کر خلیفہ نے گھوڑا روک لیا تھا۔ پہلے راجو

اترا۔ پھر دیا کو سنبالے احتیاط سے مستقیم۔

”کیا کرو گے اس لڑکی کا؟“

راجو نے درخت کے تنے سے گھوڑے کی ری باندھتے با آخر اہم سوال کر لیا تھا۔ مستقیم جو

درختوں اور کانڈے دار ہمالیوں سے بچتا آگے بڑھ رہا تھا اس سوال پر تھم کر اسے ٹھٹھنے لگا۔ اس کی

آنکھوں میں گہری سرکراہٹ کارنگ تھا۔

”میں اسے وہاں سے تمہاری بھابھی بنانے ارادے سے مل مانہ لایا ہوں۔ یہ تم سب کے

لیے قابل احترام رہے گی ہمیشہ۔ اس صورت بھی کہ میں مرکیوں، جاؤں۔ باقی سب کو بھی بتا دینا۔“

اس نے اپنی بات مکمل کی اور جنگل کے وسط میں درختوں کو کاٹ کر بنائی گئی اس رہائش گاہ کے

بند دروازے کو کھول کر اندر چلا گیا راجو حیرت و غیر یقینی سے ساکن وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کی آنکھ کھلی تو کتنی دیر یونہی پڑی غائب و مافی کی کیفیت میں ماحول کی اجنبیت کو گنگا رہی۔

سے قلعی یاد نہیں آ سکا تھا کہ وہ کہاں ہے یا اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس نے خلیفہ کی حرکت سے کر

پتے پھرے کو تھم بایا۔ وہ سنکل نوازی پنگ تھا جس پر گاہی پھولوں والی سفید چادر چھپی ہوئی تھی۔ اس

ستر پر وہ بالکل چپت لیٹی ہوئی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر حتیٰ کہ مچت پر بھی سفید رنگ پھیرا گیا تھا۔

کوئیکس گیس سے آگڑ چکا تھا اور اس کے پیچھے پلستر کی دیوار کے بجائے لکڑی کے مضبوط تختے کیلوں کی

دوست سے نظر آتے تھے۔

کمرے کا انگوٹا دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ دروازے کے ساتھ درمیانے سائز کی ایک میز رکھی

ہوئی تھی جس پر موجود ذرے کو سفید رومال سے فحک دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں ایسی کوئی

چیز نہیں تھی جس پر اس کی نگاہ پڑتی۔ اس کے حواس دھیرے دھیرے بحال ہوئے اور ذہن جاگنے لگا تو

داشت کے پردے پر دو دھندلے سے عکس لہرا گئے۔ وہ بولے بولے سہی مگر خود پر بیت جانے والی

شادی کروں گا تم سے۔"

اپنے تئیں اس نے گویا دیا کو مطمئن کیا تھا مگر اسے تو جیسے آگ لگ گئی تھی۔

"میں تم کو کبھی پسند نہ کروں تم پر۔ دو ٹوکے کے معمولی انسان! اوقات کیا ہے تمہاری؟"

اس ڈھنائی کے اعلیٰ مظاہر نے دیا کا دماغ ہی ساکا ڈالا تھا۔ مستقیم کو خود پر بے تحاشہ مضبوط کرنا

پڑا۔ تو چین کے شدید تر احساس نے اس کا چہرہ یکدم بے تحاشہ سرخ کر ڈالا تھا۔

"دیکھو لڑکی کیا نام ہے تمہارا۔"

"جو بھی ہو۔ تم سے مطلب؟ بس مجھے واپس چھوڑ کے آؤ۔"

وہ جوانا پھار کھانے کو دوڑی۔ اس کا غصہ ہرگز رتے لمبے بڑھ رہا تھا۔ صدمت پر طیش اور جنون

برسر غالب آتا جا رہا تھا۔ یہ خیال یہ احساس ہی سنگین تر تھا کہ وہ کسی کی معمولی خواہش کی بھینٹ چڑھا

دی گئی ہے۔

"بہتر یہی ہے کہ اب تم واپسی کو بھول جاؤ۔ مستقیم اک بار جس چیز کو نگاہ بھر کے دیکھ لے۔ جس

کی انجانے میں بھی خواہش کر بیٹھے۔ وہ چیز ہمیشہ کے لیے خلیفہ مستقیم کے قبضے میں آکر اس کی غلام بن

جایا کرتی ہے۔"

"مستقیم کا لہجہ سفاکانہ تھا۔ دیا کے ہٹ دھرم انداز نے گویا بھڑکا کے رکھ دیا تھا اسے ہل بھر

میں۔ دیا کے امساب پر جیسے کوئی طاقتور بم گر کر پھٹا تھا۔ وہ اندر تک ہل کر رہ گئی۔ رنگ فق ہوا مگر وہ

بہر حال اس لمحے خود کو کمزور ثابت کر کے ہمیشہ کی بار اپنے نام کرانا نہیں چاہتی تھی۔ اس اچانک

حادثے نے اسے یکدم کتنا مضبوط اور نڈر بنا دیا تھا۔ ہر خطرے سے کھیلنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ

اپنی صحت پہ خود حیران ہوتی اگر غور کرتی تو۔ جیسی جو بابا بولی نہیں غرائی تھی۔

"میں کوئی چیز نہیں ہوں۔ جیتی جاگتی انسان ہوں۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ مجھے واپس

چھوڑ کر آؤ۔ ورنہ تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔"

اس کے لہجہ کی تندی میں تنبیہ بھی تھی۔ جسے محسوس کر کے خلیفہ مستقیم بے ساختہ مسکرایا۔ اس کی

مسکراہٹ ایسی ہی تھی جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی بے نیکی مگر معصوم فرمائش پر مسکرا دے۔ دیا نے اس

مسکان کو سمجھ کر ہی دونوں کو سختی سے بھیجا تھا۔ خلیفہ مستقیم اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے تکلے قدم اٹھاتا اس

کے نزدیک آ گیا۔ دیا اسے اپنی جانب بڑھتے پا کر اضطراب کی کیفیت میں غیر شعوری طور پر اٹنے

قدموں پیچھے ہٹتی دیوار سے جا لگی تھی۔ اب اس کے اور خلیفہ مستقیم کے بیچ فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

وہ سانس روکے، آنکھیں پھیلائے ہراساں سی بے بس انداز میں اسے نکلنے لگی۔

قیامت سے آگاہ ہوئی تو ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ہوش میں تو آگئی تھی مگر صدمے نے اس

ذہنی حالت مندوش کر کے رکھ دی تھی۔

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت اور بے بسی کے ساتھ ساتھ نمی بھی بہت تیزی سے چھل

چلی گئی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل کچھ مزید ڈوب گیا کہ اس کا دوپٹہ اس کے پاس نہیں تھا اس

مراستہ کی عالم میں خود کو سمیٹنا اور خوف زدہ نگاہوں کو دوپٹے کی تلاش میں دوڑایا۔ جو اسے چنگ

سرہانے پڑا نظر آ گیا تھا۔ اس نے لپک کر اپنی شال اٹھائی اور خود کو اچھی طرح کور کر لیا۔ پھر بستر

اتر کر دروازے کی جانب لپکی۔ دروازہ یقیناً باہر سے بند تھا۔ جسے کھٹکنا تے اور کسی کو مسلسل

پکارتے دو ہچکیوں سے رونا شروع کر چکی تھی۔ اور جب اس کا گلا مسلسل رونے اور چیخنے سے چھل

تھا۔ تب اس نے اس روح میں اترتے سنانے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنی تھی۔ اس سے قبل

وہ سنبھل کر پیچھے ہٹتی جگہ سے کھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔

یہ وہی طویل القامت تھا۔ جس کی آنکھوں میں محض اک نگاہ ڈال کر وہ سہم گئی تھی۔ اس نے

اسے رو بہ رو پا کے اس پر عجیب سی حیرت طاری ہوتی چلی گئی تو بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی۔

"ک۔ کون ہو تم؟ یہاں کیوں لائے ہو مجھے؟"

آنسو پونچھ کر اس نے کتنی لا چاری کیفیت میں سوال کیا تھا۔

"جو کسی کے گھر میں بنا اجازت بھی دھڑلے سے گھس جائیں لوگ انہیں ڈاکو کہتے ہیں۔

البتہ نام میرا خلیفہ مستقیم ہے۔ ہاں کیوں لایا ہوں کا جواب ہے۔ شاید تم مجھے اچھی لگی ہو۔ بس تمہیں

بار دیکھنے کی خواہش میں میں تمہارے گھر والوں کو زحمت دینا نہیں چاہتا تھا۔"

اطمینان و سکون سے کہتا وہ جیسے مبہم سا ہی مسکرایا تھا۔ اور پٹنگ کی پٹی سے ٹک کر اسے بغور

شغل فرمانے لگا۔ کیا شاہانہ انداز گفتگو تھا۔ دیا کے اندر سے غیض و غضب اور اشتعال کی تند فیر

تھی جو سارا خوف اور مصلحت بہا کر لے گئی۔

"گھنیا، خبیث، کہنے انسان! تم جیسوں کو تو لفظ عزت و حرمت کے بچے بھی معلوم نہیں

کے۔ نفس کے اگر اتنے ہی غلام ہو تو پھر کسی ایسی جگہ کا در کھٹکنا یا ہوتا جہاں تم جیسے سیاہ عمل لوگ

ہوس پوری کرنے جاتے ہیں۔"

بے بسی اور لا چاری کی انتہاؤں پر پہنچ کر وہ رو ہانسی ہو کر چیخ پڑی۔ جبکہ دوسری جانب

درجہ اطمینان بھری کیفیت تھی۔

"مگر مجھے کوئی ایسی ویسی تھرو ریٹ نہیں ایک شریف زادی درکار تھی۔ تم اطمینان رکھو

"دیکھو پیاری لڑکی! تمہاری واپسی کے سارے راستے بند ہو گئے ہیں۔ ساری کشتیاں جل گئی ہیں۔ واپسی کو سرے سے بھول جاؤ۔ بس خلیفہ مستقیم کو یاد رکھو۔ اب تمہاری زندگی کو مجھ پر شروع ہو کر مجھ پر ہی ختم ہونا ہے۔ بہتر ہو گا کہ ہنسی خوشی اس حقیقت کو تسلیم کر لو۔ ورنہ مجھے اپنی بات زبردستی منوانا پڑے گی۔ اور وہ طریقہ اتنا مہذب نہیں ہو گا۔ مان جاؤ لڑکی کہ پہلی بار تو مجھے دل نے اکسایا ہے کہ کسی سے محبت کر کے دیکھوں۔"

بات کے اختتام پر وہ اس کے صدمے دکھ اور اذیت کی کیفیت میں ذرا سے کھلے ہونٹوں کو چھو کر دانستہ مسکرایا جبکہ اس کی نظروں کی جنوں خیزی کو سستی اسے گستاخی پر پوری طرح آمادہ پائی دیا کوئی بیسی اور لا چاری کے شدید احساس نے آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا۔ خلیفہ مستقیم نے اسے یوں بکھر کر روتے دیکھا تو گہرا سانس بھر کے فاصلہ بڑھایا۔ وہ پلٹ کر جا رہا تھا جب دیا بھاگ کر اس کے راستے میں آئی تھی۔

"دیکھو۔ یہ قلم مت کرو۔ میں تمہیں تمہاری سب سے عزیز ہستی کا واسطہ دیتی ہوں۔ رحم کرو مجھ پر۔ یہ ذلت برداشت نہیں ہوگی مجھ سے۔ مر جاؤں گی میں۔"

بچوں کی طرح رو کر ہچکیاں بھرتے وہ اس کی منت کر رہی تھی۔ کوئی راہ نہ کھلی پا کر وہ کسی بھی ممکن طریقے سے اس اندھیری ذلت بھری بندگی سے نکل بھاگنے پر کمر بستہ تھی۔ خلیفہ مستقیم نے بھلی نظروں سے اسے کچھ دیر تک دیکھا تھا۔

"خلیفہ مستقیم اتنا بے وقعت نہیں ہے کہ اتنی چاہت اور محبت سے کسی کو اپنانے کی خواہش ظاہر کرے اور وہ یوں بے احتیاطی اور نخوت بھرے انداز میں منہ پھیر لے۔ تمہیں میری اہمیت کا انداز نہیں ہے۔"

اس کے لہجے میں تو جین کے احساس نے تپش بھری تھی۔ ماتھے کی تیوریاں اور آنکھوں سے چھوٹے شعلے دیا کے غیض کو مزید ہوا دینے کا باعث بنے۔

"تو تم کیا سمجھتے ہو کہ میں اتنی اندراں ہوں کہ تم مجھے اپنے نفس کی تسکین کی خاطر اٹھالو اور اسے اپنی خوش بختی سے تعبیر کر کے قہقہے لگاتی پھروں اور سنو تمہاری اہمیت کا ہی تو اچھی طرح انداز ہوا ہے مجھے۔ اک ڈاکو کی کیا حیثیت کیا عزت ہوتی ہے سب کی نظروں میں جانا چاہو گے؟ نفرت سے نگاہ سے دیکھتے ہیں لوگ تمہیں اور ایسا کرنے میں وہ بالکل حق بجانب ہیں تم اسی قابل ہو۔"

وہ کسی آتش فشاں لاوے کی طرح پھٹ پڑی تھی۔ لہجہ کا زہریلا چن اور بلا کی نفرت کے ساتھ تحقیر آمیز استہزاء یہ انداز خلیفہ مستقیم کو آپے سے باہر کر کے رکھ گیا۔ ہاں یہی تو تھی اس کی حقیقت

یہی تھا وہ تلخ سچ جسے اک عرصے تک وہ ہضم نہیں کر پایا تھا۔ اور ان گزشتہ چند سالوں میں جب جب بھی کسی نے اس کے سامنے آئینہ رکھا تو اس سے اپنی صورت کی سیاہی برداشت کرنا دو بھر ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی احساس ذلت کے سبب اس پر خون سوار ہو گیا۔ بچنے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اس نے بنا کسی لحاظ کے اک زمانے کا تھپڑ دیا کے گال پٹے مارا تھا۔

"آئی ڈونٹ کیئر سو بار دیکھیں وہ مجھے نفرت کی نظر سے۔ مجھے سرگز کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ سب لوگ خلیفہ مستقیم کے جوتے کی نوک پر ہیں مگر تم۔ تم مجھ سے لازمی محبت کرو گی۔ ضرور کرو گی۔ اس لیے کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔ اور جو میں چاہوں ویسا ہونا ضروری ہے۔ ہر صورت ہر قیمت پر۔ ورنہ میں آگ لگا دیا کرتا ہوں۔ ہر اس شے کو جو میری مرضی کے مطابق نہ ہو۔ میں تمہیں بھی جھاڑوں کی طرح سناٹا کرنے لگاؤں گا۔"

وہ یقیناً حواسوں میں نہیں تھا۔ عجیب محفونانہ اہلٹا ہوا طیش تھا۔ دیا تو حق دق رہ گئی تھی۔ رونا بھول کر سہی ہوئی خوف سے پھیلی نظروں سے اسے ٹکٹنے لگی۔ پورا جسم خزاں زد و پتے کی مانند کانپتا تھا۔ خلیفہ مستقیم کتنی دیر نہلتا اور گہرے سانس بھر کے خود پر قابو پاتا۔ با۔ پھر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے اس نے اپنی لبورنگ دھکتی آنکھوں کو اس کے ہنوز خائف اور سبے ہوئے چہرے پر ننگا کہ غضبناک گہرے حم آواز میں اسے اگلی تنبیہ کی تھی۔

"میں کل تک کا وقت دیتا ہوں تم سوچ لو اچھی طرح۔ پھر فیصلہ کرنا۔ مگر یاد رہے فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہیے۔ اب میں کل ہی تمہارے پاس آؤں گا۔ کھانا رکھا ہے کھالینا۔"

وہ پلٹ کر باہر نکلا اور دروازہ بند ہو گیا۔

"یہ تمہارا خواب کبھی پورا نہیں ہو گا۔ مجھ سے میری اما، میرا وقار اور میرے والدین چھین کر تم چاہتے ہو میں تمہیں خوشی دوں۔ تم جیسے لیرے کو؟"

اس نے دروازے کے باہر موجود خلیفہ مستقیم کو ہی سنوایا تھا جیسے بہت چیخ کر۔ مگر وہ پلٹ کر اندر نہیں آیا۔ اس نے اس کے دور ہوتے قدموں کی آہٹ سنی اور بے بسی کو اپنا تھیراؤ کرتے پا کر گھٹنوں کے بل زمین پر گر گئی۔ اسے لگ رہا تھا اس کا وجود اپنی زنجیروں سے جکڑ دیا گیا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے جھنجھٹ نہیں کر سکتی۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ وہ بے ساختہ وہ بے اختیار گھٹ گھٹ کر روتی چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ نیم تاریک کمر تھا۔ جس کی واحد کھڑکی باہر کی طرف سے مضبوطی سے بند تھی۔ اسے وہاں محصور ہوئے کتنا عرصہ بیتا تھا وہ حساب رکھنا بھی چاہتی تو یہ ممکن نہیں تھا۔ اس دوران کئی بار اس کے

لے کھانے کی ٹرے لائی گئی۔ لانے والا ہر بار خلیفہ مستقیم ہوتا تھا۔ وہ اسے دیکھتی تو نفرت سے منہ پھیر کے بیٹھ جاتی۔ یہاں تک کہ وہ پلٹ کر واپس نہیں چلا جاتا۔ اس وقت بھی وہ اس کے لوٹ جانے کی خطر تھی کہ وہ قدم بڑھاتا اس کے نزدیک آگیا۔ دیا اپنی جگہ پر کھٹی اور اپنی شال کو کچھ اور مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اس کا چہرہ زرد اور ہراساں تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں اپنا خون خشک ہوتا محسوس کرتی تھی۔ اسے اس وحشی درندے سے بہر حال کچھ بھی اچھی امید نہیں تھی۔

”کیا فیصلہ ہے تمہارا؟“

اس پر نگاہیں نکاتے وہ اس کے سوتے ہوئے چہرے کو بغور دیکھتا ہوا بظاہر رمان سے بولا تھا۔ جواب میں خاموشی تھی۔ نظر اندازی تھی۔ غفلت تھی۔ جو خلیفہ مستقیم کو ساگانے آگ لگانے کا باعث بنی۔

”چلو کھانا کھاؤ۔“

اس نے اتنی زور سے اس کی شال پکڑ کر کھینچی کہ وہ بھی ساتھ تھسکتی آئی۔ اس کی آنکھیں آن کی آن میں خوف کے باعث پھنسنے والی ہو گئیں۔ مگر خلیفہ مستقیم کے چہرے و انداز میں اب نہ کوئی گنجائش تھی نہ نرمی۔

”سنا نہیں تم نے؟ اگر بھوک سے مرنے کا ارادہ ہے تو اتنی آسانی سے کوئی نہیں مرنے لے۔“

وہ حلق کے بل فرمایا تو دیواریں لرز اٹھیں۔

”نہیں کھاؤں گی۔“

وہ بھی چپنی مگر آنسو بہہ نکلے تھے۔ خلیفہ مستقیم کی جارحیت بڑھی۔ ساتھ میں غصہ جھنجھلاہٹ بے بسی اور تکی بھی۔ یہ لڑکی اس کے نزدیک اہم تھی۔ خاص تھی۔ وہ اس پر سختی نہیں چاہتا تھا مگر وہ اسے سختی کا اسرار ہی تھی۔

”پاگل پن پر مت اترو۔ میں نے کہا تمہاری ساری کشتیاں جل گئی ہیں۔“

”پھر مجھے بھی جلاؤ۔ مار دو مجھے بھی۔“

وہ ضبط کھو کر زور زور سے دھڑکی۔ خلیفہ مستقیم کے غصے کی بھڑکتی آگ پر جیسے کسی نے خشک پانی کے چھینے مار دیئے تھے۔ وہ نظریں جھپٹاتا بے ساختہ ہونٹ بھینچ گیا۔

”کوئی خود اپنے آپ کو بھی نقصان پہنچاتا ہے یہ قوف! تم میرے وجود کا حصہ ہو۔ زندگی کی لوہا ہو میرے لیے۔ اتنا بے بس کر دیا تم نے اپنی اک جھلک میں مجھے کہ تمہارے بن جینے کا تصور محال ہو گیا۔ جب ہی تو ساتھ لے آیا تھا تمہیں۔ اپنے اصول اپنے قوانین تو ذکر۔“

وہ کتنی محبت کتنی توجہ سے اس کے آنسو اپنی پوروں پر چن رہا تھا۔ اندازہ دیا نہ تھا۔ لوٹ کر

جانے والا، دیوانگی کی آخری حدوں کو چھوتا، عقیدہ مندانہ سا، مگر دیادک کر فاصلے پر ہوئی تھی۔

”مت چھوؤ مجھے اپنے ناپاک غلیظ ہاتھوں سے۔ مار ڈالا تمہاری اس حرکت نے مجھے۔ اب ساری زندگی خود سے نکالو نہیں ملا سکوں گی۔ جانے دو مجھے۔ میرے ماں باپ نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا کہ اتنی بڑی سزا بھگتیں۔ ایسی ذلت کہیں۔“

وہ اور بھی شدتوں سے رو دی تھی۔ خلیفہ مستقیم نے ہونٹ باہم سختی سے بھینچ لیے۔

”نہیک ہے۔ اب میں تب ہی چھوؤں گا تمہیں جب تم حلال ہو جاؤ گی مجھ پر۔ آج شام کو نکاح ہے ہمارا۔ تیار رہنا۔۔۔۔۔“

وہ بھاری آواز میں بولا۔ دیا جیسے ہوا میں معلق ہو گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ خلیفہ مستقیم نے اس کے خوف کی زیادتی سے مجھد ہو جانے والے انداز کو دلچسپی سے دیکھا اور زور سے ہنس پڑا۔

”کم آن یا ر شادی کا مڑوہ سنایا ہے۔ تم تو ایسے پیلی ہو گئی ہو جیسے دار پر چڑھانے کی بات کہہ دی ہو۔ رنجی اتنا پیار دوں گا تمہیں کہ سارے خدشے اور خوف بھول جاؤ گی۔ بس دلہن بننے کی تیاری کرو۔ اتنا خوبصورت لباس منگوایا ہے کہ تمہارا حسن دو آتھ ہو جائے گا اس میں۔“

”تمہیں کیا پتہ۔ دار پر چڑھنے کے ہی مترادف ہے۔ کاش ان شرمناک حالات سے دو چار ہونے سے قبل ہی مر گئی ہوتی میں۔“

اس نے جیسے اور کچھ سنا ہی نہ تھا۔ زار و قطار روتے ہوئے خود کو کونٹے لگی۔ خلیفہ نے البتہ دھیان دینا ضروری نہ سمجھا تھا۔

”افو۔ اب بس بھی کرو یہ رونا دھونا اور اپنی شادی کی تیاری کرو۔ مجھے رات کو فریش دلہن چاہیے۔“

اس کی بات پر دیا ایک دم سے رونا بھول کر خونخوار نظروں سے اسے حقارت آمیز تاثرات سے بھینچے لگی۔ جس کی بے حد گہری پر شوق نظروں کی تاب لانا بس کی بات نہیں تھی۔

”میں نے کہا تمہیں کہ میں اس سرخڑ کے لیے تیار ہو گئی ہوں؟ میں تمہارے مذموم ارادوں کو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہونے دوں گی سن لو تم۔“

اس کے چہرے سے چمکتی رعونت نکلی اور تنہا کو نکلتا خلیفہ مستقیم تھم سا گیا۔ اس نے ایرواٹھا کر کسی قدر سرد اور تنہی نظروں سے دیا کو دیکھا تھا۔

”کیا کرو گی تم؟ مثلاً کر بھی کیا سکتی ہو؟“

اس کے نزدیک ہو کر چلانے کی پرواہ کیے بغیر وہ تاؤ دلاتی مسکان لیوں پر سجا کر بولا تھا۔ مسکان جو شکست کا احساس بخشی تھی۔ دیا بل کھا کر تھلا تے ہوئے انداز میں آگے بڑھی اور اسی مستقیم انداز میں اسے زور سے دھکا دیا۔ مستقیم اس سے ایسی توقع رکھتا تھا نہ اس حملے کے لیے تیار تھا جیسی سالہ کھڑا کر دو قدم پیچھے ہوا تھا۔ اس کا دھکا لگنے سے اس کے پیچھے پڑی میز پر دھرا گلدان زمین پر ہو کر دو ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ دیا نے چونک کر گلدان کے ٹکڑوں کو دیکھا۔ پھر کسی خیال کے اس کی آنکھوں کی چمک خطرناک انداز میں بڑھی۔ اگلے لمحے جیسے اس میں پارہ بھر گیا تھا۔ وہ بجلی کی تیزی سے حرکت میں آئی اور جھک کر بجلی کی سی تیزی سے گلدان کا ٹوکیا ٹکڑا اٹھالیا تھا۔ اس سے کہ مستقیم اس کے ارادے کی یقینی سے آگاہ ہوتا اس نے اسی جنونی کیفیت کے زیر اثر اپنی کلائی اٹھ بید روی سے کاٹ ڈالی تھی۔

یہ سب کچھ لمحے کے ہزاروں حصے میں ہوا تھا۔ مستقیم تو اس کی کلائی سے فوارے کی مانند خون کو دیکھ کر کئی ٹانہوں کو بھونچکا ہو کر رہ گیا تھا۔ اک دھان پان سی ڈرپوک لڑکی سے وہ کہاں سفاکانہ جرأت کا تصور رکھتا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ حواسوں میں آ کر کچھ کر پاتا دیا نے اپنی دوسری بھی اسی انداز میں اوجھڑ ڈالی۔ مستقیم پہ چھایا یہ سکتا اک دم ٹوٹا۔ وہ ہڑبڑا کر اس پر جھپٹا تھا اور اس دونوں کلائیاں پکڑتے ہوئے اسے ایک زوردار جھٹکا دیتے ہوئے غم و غصے سے لرزتی آواز میں یہی کہہ پایا۔

”یہ... یہ کیا کر لیا ہے الحق لڑکی؟“

اس کی آواز ڈوبتی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر جیسے عظیم نقصان کا تاثر قائم ہو چکا تھا۔

”چھوڑ دو مجھے۔ مار ڈالوں گی خود کو مگر تمہارے سامنے نہ بس نہیں ہوں گی۔“

اس سے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش میں ہکان وہ بذاتی انداز میں چلائی۔ مستقیم شدید سے دو چلد ہوا تھا مگر جواب دیے بغیر ہونٹ بھینچ کر اس کی کلائیوں کے زخموں کی گہرائی جانچنے لگا۔ اس کے زخموں پر اپنے ہاتھ سختی سے جما کر اس نے وہیں کھڑکھڑے چیخ کر امانت کو پکایا تھا۔ اس بعد اس کی جانب متوجہ ہوا تو اسے ہارے ہوئے انداز میں دیکھتا شکست لہجے میں بولا تھا۔

”اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے؟“

اس کی آواز غم کی شدت سے بچنی ہوئی تھی۔ دیا کے چہرے پر استہزاد اور گمیا۔

”اس سے بھی زیادہ۔ کہیں زیادہ۔“

وہ پھنکارنے لگی۔ اور مستقیم اس کے خوبصورت مگر بے رحم چہرے کو تھکاتا رہا تھا۔ جہاں

تھی۔ بے امانی تھی۔ اکتاہٹ تھی۔ امانت دستک دینے کے بعد اندر آیا۔ مگر دیا کی ابتر حالت نے اسے واضح طور پر ششدر کر کے رکھ دیا۔ اس کی سوالیہ و استعجابی نظریں خلیفہ مستقیم کی جانب اٹھی تھیں۔ جو اس بل بے حد منتھل اور نڈھال ہو رہا تھا۔

”اس کی مرہم پنی کرو امانت۔“

وہ بولا تھا تو بس اتنا۔ اس کی آواز ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ ایسے فاصلے پر جا بیٹھا جیسے کچھ بھی ہو جائے اب ہرگز نہیں بولے گا۔ امانت نے سر دھڑا بھری اور اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ جبکہ دیا نے بھی مزید مزاحمت کی نہ ہی اختلاف کہ تسلسل سے بہتے خون نے اس پر نقابست اور خوف طاری کر دیا تھا۔ امانت اپنے کام سے فارغ ہوا پھر اسے کچھ پین ٹکڑے دے کر کھانے کی تاکید کرتا ہوا اٹھ کر غاصوشی سے باہر چلا گیا۔ دیا ساکن اور نڈھال بیٹھی رہی۔ وہ امانت کی طرح اب خلیفہ کے جانے کی منتظر تھی۔ اس پر نقابست کا شدید حملہ تھا اور وہ سونا چاہ رہی تھی مگر خلیفہ کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں تھا۔

معاذ خلیفہ نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اصل اس کی جان اس وقت ہوا ہوئی تھی جب وہ بستر پر اس کے مقابل آ کر بیٹھا۔ دیا نے چوکتے ہوئے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا جس کی گھمبیر چپ مٹی خنہ تھی۔ دیا کے اندر سننا بٹ بڑھنے لگی۔ وہ بے اختیار پیچھے سر کی تھی۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تمہاری ہر بڑی کوشش میری معمولی پیش رفت کے سامنے بے حد حقیر ہے۔ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں ٹھیک ہے میں بھی جبر کا قائل نہیں ہوں۔ مگر کچھ کھیل جبر اور زبردستی میں بھی لطف دیتے ہیں۔ مجھے چھینا جھپٹ لینا برا نہیں لگتا۔ یہ میرا پیشہ بھی ہے۔ تم جانتی ہو؟“

اس کا لہجہ سرد بھی تھا۔ سفاک بھی۔ سنگین و مطمئن بھی تھا۔ بے لحاظ تھی۔ دیا کو اپنے حلق میں کچھ اٹکتا ہوا محسوس ہوا تو وجود پر برف گرتی ہوئی۔ وہ ہر لمحہ جیسے اسی قائل سفاک برف کے جان لیوا بوجھ تلے دب کر ختم ہونے لگی۔

”ک... کیا مطلب؟“

وہ ہراسی کی آخری انتہا کو چھو آئی۔ اس کا رنگ پیلا پڑنے لگا۔ خلیفہ مستقیم نے ایک بھر پار اور معنی خیز نظر اس کے وجود پر دوڑائی۔ پھر اس کی آنکھوں میں اپنی بے رحم آنکھیں گاڑ دیں۔

”مطلب...“ وہ ہنسا پھر اسے بھرپور مگر طنزیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”یہاں ہمارے اس ٹھکانے پر ہر تیسرے دن میرے ساتھی یہ کھیل کھیلتے رہتے ہیں مگر میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج میں بھی برصورت ان فاصلوں کو مٹاؤں گا۔ بہت آزما چکیں تم میرا ضبط۔“

میں نکاح کرنا چاہتا تھا تم سے مگر تم میں شاید پابند ہونا پسند نہیں۔ ایزہ پوش اب میں۔۔۔
اس کی بات پوری سنے بغیر ہی وہ ہچکچاہٹ کر رہی تھی۔ تمام منہ تمام دوصلے گواہ کر
"یا اللہ۔۔۔ اتنا بڑا امتحان؟ میں مر گئیوں نہ گئی؟ ایسا کون سا گناہ تھا جس کی اتنی تڑپی ہو؟
ایسی سخت آزمائش ہے۔۔۔"

خلیفہ مستقیم ہونٹ جھپٹے اسے یوں بے حال بے اوسان روتا دیکھتا رہا تھا۔ پھر رسانیٹ سے
تھا۔
"اسی لیے کہتا ہوں کہ نکاح کر لو مجھ سے۔ کم از کم ضمیر کے بوجھ سے تو آزاد رہو گی۔
مجھے من مانی سے تو روک نہیں سکتی تم۔"

وہ یونہی روتی رہی تھی۔ وہ اسے سمجھا نہیں رہا تھا گویا کند چھری سے اسے ذبح کر رہا تھا۔
سفاک انسان تھا۔ جسے صرف اپنا مفاد اپنی خواہش کی پروا تھی۔ وہ اسے روتے دیکھتا رہا۔ اس
آنسوؤں میں شکست کا رنگ تھا۔ جس مستقیم جیسے زیرک انسان نے محسوس کیا اور چہرے پر فتح
مسکان بکھر گئی۔

☆ ☆ ☆

جو قسمت میں لکھ دیا جائے اسے ٹالا نہیں جاسکتا۔ قسمت جو ازل سے ہی ہر انسان کی طے
گئی ہے۔ پھر وہ کیسے اس سے فرار حاصل کر لیتی۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ رہ ہی نہ
کہ وہ خود کو حالات کے سپرد کر دے۔ اس نے تمام مزاہمت ترک کر دی تھی۔ کہتے ہیں کہ
شریف انسان کے پاس سب سے زیادہ قیمتی شے اس کی عزت ہی ہوتی ہے۔ وہ بھی اس
بچانے کی خاطر نکاح پر آمادہ ہو گئی تھی۔ وہ کام جس کا مام حالات میں اس کے پاس تصور
تھا۔ مگر اب اسے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ خلیفہ مستقیم کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ اس
شک نہیں تھا کہ اس کی حرکتوں کے بعد اس کی سنگین ترین باتوں کی بدولت ہی وہ آمادہ ہوئی تھی
کی آخری دھمکی اور آخری بات۔۔۔ جسے ہر بار یاد کر کے وہ بے تحاشہ روتی تھی۔

"اگر یہ تمہاری ضد ہے تو میں تمہیں واپس بھی چھوڑ آؤں مگر سوچو تمہیں کوئی قبول کرے
نہیں۔ ہمارا معاشرہ بہت بے حس اور سفاک معاشرہ ہے محترمہ! یہاں برے کو جو حقیقتاً برا ہوتا
ہے برا نہیں کہتا مگر جسے حالات برا بنادیں۔۔۔ یہ دنیا کبھی معاف نہیں کر پاتی۔ اس کے ناکر وہ
کے ناکر وہ گناہ ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔ ہمارے طبقے کا المیہ یہ بھی ہے کہ یہ گھر سے بھاگنے والی
بے شرم لڑکی اور انواہونے والی بے بس اور مجبور لڑکی میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا۔ ان کے نزدیک

کی حیثیت ایک برابر ہے۔ سلوک ایک برابر ہے بالکل ویسے جیسے اک طوائف اور اک ڈاکو کو چاہے وہ
چاہے ہو جائیں مگر یہ معاف کرنے پر اس کے سابقہ عمل کو بھولنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اپنی حیثیت کا
یقین کر رہے پھر مجھے بتا دو۔"

وہ اس کے سارے راستے بند کر کے فیصلے کا اختیار اسے سونپ رہا تھا۔ تھا کوئی اس سے بڑھ کر
عالم و خاک۔ دیا کا دل جھٹنے اور سٹپنے لگا۔ وہ فم ناک نظروں سے مگر نفرت کی نظر سے اسے دیکھنے لگی۔
اس وقت پوری روئے زمین پر اس کے نزدیک خلیفہ مستقیم سے بڑھ کر کوئی قابلِ نظرین قابلِ خدمت
نہیں تھا۔ پھر ان کا نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد خلیفہ مستقیم اس کے پاس آیا تو کتنا سرشار تھا وہ من پسند
فتح مندی کے احساس سے۔

"میں تمہاری تیاری کے لیے کسی ماہر یونین کا انتظام ضرور کرتا مگر سویت پارٹ میں کوئی خطرو
مول نہیں یہ مانچا رہا۔ اس بیگ میں تمہارے ڈریس کے علاوہ ضرورت کا دیگر سامان بھی موجود ہے۔
مجھے پورا یقین ہے دیا کہ تم کچھ اور آرائش نہ بھی کرو۔ صرف یہ ڈریس ہی پہن لو تو تمہاری جھگڑا بہت
سے میری آنکھیں خیر ہو جائیں گی۔ آج میری زندگی کا سب سے اہم دن ہے دیا! اور اسے میں
بھر پور طرے سے منانے کا خواہاں ہوں۔ تمہیں ساتھ تو دینا پڑے گا میرا۔ تیار ہو جاؤ ہری اپ!"
وہ چند لمحے رک کر متبسم معنی خیز نظروں سے اسے ٹکٹا رہا۔ پھر اس کی خاموشی کو محسوس کرتا ہوا لگا
کھٹک کر رہا تھا۔

اس راہداری کے آخری سرے پر جو واش روم ہے وہ صرف میرے استعمال میں ہوتا ہے۔ تم
وہاں جا کے فلیش ہو جاؤ۔ اس پورشن میں اس وقت صرف ہم دونوں ہیں۔ تم تیار ہو جاؤ گی پھر ہی
باقاعدہ جشن کا اہتمام کیا جائے گا۔

اپنی بات مکمل کر کے کچھ دیر اس کے تاثرات نوٹ کرتا رہا۔ وہ ساکن و سامت بیٹھی تھی۔ البتہ
آنکھوں کی لمبی پلکوں کی دہلیز پھیلا لگ کر پھر سے گالوں پر اتر آئی۔ جسے دیکھتا خلیفہ مستقیم سرد آدھ بھر کے
رہ گیا تھا۔

"کیوں بھگان کر رہی ہو خود کو؟ دیکھو جب انسان کے پاس اپنی پسند اور مرضی کا اختیار باقی نہ
رہے تو خود کو حالات اور تقدیر کے سپرد کر کے بے فکر ہو جانا چاہیے۔ مجھے اپنے لیے تم بالکل مختلف
انسان یاد کی۔ چلو! کھانا کھاؤ اب شاہباش۔"

اس کے انداز میں محبت بھی تھی اپنائیت بھی۔ وہ جیسے ہر صورت اس کا دھیان بٹاتا، دیکھ دو کرنا
چاہ رہا تھا۔ جو ممکن نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس پل اس کی یہ اہمیت بھی دیا کو خوار بن کر چہرہ رہی

ہے۔ وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔ جیسی بے نیازی کی ہل مارے بیٹھی رہی۔ جبکہ خلیفہ مستقیم اس کا منتظر تھا۔ جب ایسا کوئی ارادہ نہیں دیکھا تو خود بڑھ کر نرے اٹھائی اور بستر پر نکلنے کے بعد اپنے اور اس کے درمیان رکھ لی۔

”کھانا کھاؤ۔“

”میں نے کھانا مجھے نہیں کھانا۔“

اب کے وہ چیخ پڑی تھی مگر مجال ہے جو خلیفہ مستقیم نے برامانا ہو۔ اسی اطمینان سے پلیٹ اٹھا کر سالن نکالا اور خود نوال بنا کر اس کے منہ کی جانب لے آیا۔ دیا جو اس کی جانب متوجہ نہیں تھی۔ اس حرکت پر عین اس لمحے آگاہ ہوئی تو صرف چونکی نہیں سہنا بھی گئی تھی۔

”مم..... میں خود کھا لوں گی۔“

وہ عاجز ہوئی۔ اس کے لہجے میں حجاب آمیز کوفت محسوس کر کے خلیفہ مستقیم مسکرائے لگا۔ اسے ریکس کرنے کا باعث وہ حجاب کی جھلک تھی جو پہلی بار دیا کے انداز سے جھلکی تھی۔ بہر حال اس کے احساس میں یہ رشتہ اپنا آپ منوا چکا تھا۔

”میں بھی کھلا دوں گا تو کوئی حرج کہاں ہے یار! شوہر بن چکا ہوں اب تو باقاعدہ۔“

وہ اسے آنکھ مار کر شریر انداز میں بولا تھا۔ دیا کا رنگ پھر سے فق ہو گیا۔ آنسو جیسے حلق میں گرنے لگے۔ وہ ہرگز کھانا کھانے پر آمادہ نہیں تھی۔ مگر محض اس سے جان چھڑانے کی خاطر چند نوالے زہر مار کرنے پڑے۔ جبکہ وہ اسے لودیتی متبسم نظروں کے دھار میں لیے پیار سے تکتا رہا۔

”بہت اچھی لگ رہی ہو اس طرح میرے احکامات کی تعمیل کرتی ہوئی۔ اسی طرح تعاون کرتی رہنا۔ زندگی بہت خوبصورت گزرے گی بلاشبہ۔“

اس کا شوخ لہجہ معنی خیز بھی تھا ذوق معنی بھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں حسین رنگ تھے۔ دیا کا دل ایک دم سے پھر بھر آئے لگا۔ اس نے فوری طور پر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

”پلیز..... تہا چھوڑ دو مجھے۔“

بھرائی ہوئی آواز میں ملتی ہو کر وہ جیسے کسی بھی پل رو پڑنے کو تیار ہوئی تو مستقیم نے تڑپ اٹھنے والے انداز میں مصنوعی خفگی سے اسے گھور کر دیکھا۔

”نہ نہ..... میری جان! ابھی تو سنتوں کے موسم اترے ہیں۔ ابھی سے تہائی کی باتیں مت کر کہ پچھلے اتنے دنوں سے یہ صورتحال ہے ہماری۔“

اکیلا صبح تک تڑپا مریض شام فم تہا

نہ تم آئے، نہ خند آئی، نہ چین آیا، نہ موت آئی

اس کی چمکتی نگاہوں کی خیر و کن چمک میں شوخ تھاٹھے لہرانے لگے تو دیا کا ضبط بھی جواب دے گیا۔ ایسے بکھر کر آنسو گرے تھے جیسے گلابی ٹمبل پو کرشل کے موتی بکھر جائیں۔ وہ ہونٹ کچلتی تھی اور جیسے اس روپ میں خلیفہ مستقیم کے لیے سراسر آزمائش سمیٹ لائی تھی۔ جائز ملکیت۔ تہائی اور من پسند قربت۔ کیسے ممکن تھا وہ اس بربکا دینے والی صورتحال میں خود پر قابو رکھتا جیسی فاصلہ سمٹا تھا اور وہ کتنی چٹائی کس درجہ توجہ و محبت سے اس کے آنسو اپنے ہونٹوں پر کسی تھک کی طرح چھنے لگا تھا۔ دیا کی اب صحیح معنوں میں جان ہوا ہوئی۔ یہ آزمائش آنا تھی جانتی تھی وہ مگر اتنی جلدی..... وہ ہرگز تیار نہ تھی۔ جیسی بے بسی بپارگی کے ساتھ ساتھ دکھ کے شدید احساس سمیت اس کی گرفت میں زور سے پھڑ پھڑائی۔

”مم..... مجھے ہاتھ لینا ہے۔“

جان چھڑانے اور اس کا دھیان بنانے کو اسے بروقت بہانہ سوچا۔ خلیفہ مستقیم نے سروانچا کر کے اسے دیکھا اور مسکراہٹ دہائی۔

”امیرزنگ! اس کا مطلب تمہیں مجھ سے بھی زیادہ جلدی ہے۔ گندگند! یار سچ بتاؤ کہیں ابھی سے تو مجھ سے محبت نہیں کرنے لگیں؟“

وہ بے حد بے حساب شوخی و شرارت لہجے میں سو کر بولا تو دیا کے رکے ہوئے آنسو پھر سے بہہ اٹھے تھے۔ اور خلیفہ مستقیم پہ چھائی ترنگ اور سرسختی اترنے لگی۔ گہرا سانس بھرتا وہ اسے چھوڑ کر سیدھا ہوا۔

”جاؤ..... میں جانتا ہوں جان چھڑانا چاہتی ہو مجھ سے۔ مگر الحق لڑکی یہ ممکن کہاں ہے؟“

اب وہ سنجیدہ تھا۔ سنجیدہ تو دیا بھی تھی بلکہ غمزہ اور رنجیدہ بھی۔ جواب دینے بنا رخ پھیر کے کھڑی رہی۔ مستقیم نے خود اس کا لباس نکالا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے واش روم تک لے کر گیا۔

”جان مستقیم جلدی کرنا۔ سب ہمارے منتظر ہیں سنو..... کہیں تمہارے ارادے تو خطرناک نہیں؟“

وہ رکا تھا اور اسے بغور دیکھنے لگا۔ انداز تشویش زدہ تھا۔ ایسا کہ دیا بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

”خودکشی کا..... یا پھر اندر بند ہو کر بیٹھ جانے کا۔ دیا اک بات یاد رکھنا۔ مستقیم ہارنے کے لیے نہیں بنا۔ اگر تم نے کچھ بھی غلط کیا تو..... بہت برا ہوگا۔ اتنا کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

سے لڑاؤ تے اور تحائف دیتے رہے۔
 "آج کی رات کو ہم نے خوبصورت بنانے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہمیں امید ہے بھر جانی آپ کو یہ سب پسند تو ضرور آئے گا۔"
 امانت نے پھر بلند آواز میں اسے مخاطب کیا اور فل سائز ڈیک کا جن آن کرنے سے پہلے مسکرایا تھا۔

"بھابھاجی یہ کاغذ خلیفہ مستقیم کی جانب سے آپ کو ڈیڈی کیٹ کیا جا رہا ہے۔ واضح رہے۔"
 اس کے ساتھ ہی نہ صرف ڈیک کا شور اٹھا تھا بلکہ وہ سب بھی منہ سے آوازیں نکالتے بھنگڑا ڈالنے لگے تھے۔ خلیفہ مستقیم نے گردن موڑ کر مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ آنکھوں میں حیرانی کا تاثر لیے یہ تماشا ملاحظہ کر رہی تھی۔

"اچھا ہے نا سب؟"

اس کا متوجہ کرنے کا بھی اپنا انداز تھا۔ اپنا کاغذ اس کے کاغذ سے دھیرے سے دھیرے سے نکل رہا تھا مگر وہ بے خیال تھی پوری طرح مل کر رہ گئی اور خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"یہ سب کچھ رہے ہیں ہماری جوڑی بہت حسین ہے۔ کیا خیال ہے کچھ تصویریں نہ ہو جائیں۔ روپیے تو تم نے مجھے دیکھنا نہیں ہے۔ شاید تصویریں دیکھ کر جان سکو کہ ہم دونوں کا کپل کتنا پرفیکٹ ہے۔ یوں۔۔۔ جیسے اک دو بے کے لیے بنے ہیں ہم۔"

اس کا لہجہ سرشاری اور شمار لیے ہوئے تھا۔ اس کی مچلتی مسکان اس کی شوخ نظریں سب اس کی خوشی اور دیا کی دانگی بربادی کی گواہ تھیں۔ دیا کا دل نیچے گہرے پاتال میں گرنے لگا۔ عظیم نقصان کا احساس دل و جان کو گہرے ڈالنے کا باعث بننے لگا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کی نمی سے چمکنے لگیں۔

محاسن اور راجہ مفس چھوڑ کر بھاگتے ہوئے آئے اور خلیفہ مستقیم کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔
 "یہ محفل آپ کے ہی اعزاز میں تھی ہے جناب! کچھ حصہ آج آپ بھی ڈال لیں۔"

وہ ہنسنے لگی پس و پیش کے ان کے ساتھ بھنگڑے میں شامل ہو گیا۔ وہی گانا پھر رہا تھا۔

کوئی دل پہ قابو کر گیا اور عشقا دل میں بھر گیا
 آنکھوں آنکھوں میں وہ لاکھوں گلاں کر گیا اوے
 رہا میں تو مر گیا شیدائی مجھے کر گیا کر گیا
 رہا میں تو مر گیا، شیدائی مجھے کر گیا کر گیا

دیا سا کن نظروں سے اس کی خوشی اس کی تریک دیکھتی رہی اور اپنا دل خون ہوتا محسوس کرتی

وہ اسے سرزنش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں یکا یک پھر دیکھنے لگی تھیں۔ دیا کو اس سے خوف محسوس ہوا تو بچنے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ کسی قدر فاصلے میں اسے سامنے سے دھکیل کر واش روم میں پھرتی گئی۔ دروازہ اک دھماکے سے بند ہوا تھا۔ مستقیم ذرا سا کھسیا کر رہ گیا۔

اور جب وہ اس سرخ لباس میں اس کے سامنے آئی تو اپنے انداز کی تمام تر بے دلی، یا سیدھا سوز کے باوجود اس لباس کی خیرہ کن چمک دمک سے بڑھ کر اس کے اپنے سراپے کی خوبصورتی اور نزاکت کمال درجے کی غضب ڈھاری تھی۔ خلیفہ مستقیم کو اس سے نگاہیں ہٹا کر دھواں ہو گیا تھا۔
 "مائی گاڈ۔۔۔ تم خوبصورت ہو میں جانتا تھا۔ مگر اس قدر حسین ہو یہ تو ہرگز اندازہ نہیں تھا۔"

وہ لپک کر آیا تھا۔ اسے سہارا دیا اور اسے چلنے میں دشواری کا باعث بننے اس کے لپٹنے کو اس سے تھوڑا سا اٹھالیا۔ دیا جو پہلے ہی رو رو کر گنڈ حال تھی۔ اس کا بازو اپنی کمر کے گرد مائل محسوس کر کے خود کو اس کی پرحدت پتاہوں میں پا کر بالکل شل ہو کر رہ گئی۔ اسے لگا تھا وہ اسی لمحے ضبط کھو کر حواس بھی کھو دے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ابھی اسے بہت سے تکلیف دہ مرحلے طے کرنے تھے۔

☆ ☆ ☆

یہ ایک کھلا میدان تھا۔ جس کے درمیان میں آگ کا بڑا لاؤ روشن کیا گیا تھا۔ اونچی بلند دیواری کی منڈیروں پر ٹوٹا کچی بکھرا ہوا تھا۔ ان کے پار دیوینکل درخت تاریکی میں ڈوبے سا کھڑے تھے۔ فضا میں جنگلی حشرات الارض کی آوازوں کی ہیبت تھی۔ یہاں باری کی کیوں کی خوشبو گھرائی ہوئی تھی۔ لاؤ پہ دو سالم بکرے بھونے جا رہے تھے۔ لاؤ کے گرد بہت خوبصورت ترتیب کے ساتھ کرسیاں بھی تھیں۔ مستقیم اسے سہارا دیئے اپنے ہمراہ لایا تو اس کے ساتھیوں نے بھنگڑا ڈال کر "ساڈے گھر آئی بھر جانی" کی تائیں اڑا کر اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ خلیفہ مستقیم نے اسے ایک کرسی نرمی و احتیاط سے بٹھا دیا۔ وہ یوں اسے چھو رہا تھا۔ ایسے ہاتھ لگا رہا تھا جیسے وہ موم سے بنی یا کھڑکی سے بنائی گئی ہو۔ جسے ذرا سی سختی نقصان دے سکتی ہے۔ اس کا سسکتا ہوا دل آنسوؤں میں ڈوبنے لگا۔
 "گو کہ میرا زخم ابھی بھرا نہیں ہے بھابھاجی مگر میں آپ کو خوف کرتا ہوں۔ آج سے آپ ہمارے ماں بہن کے درجے پر فائز ہوئیں۔ خلیفہ مستقیم ہمارا لیزر نئی نہیں ہمارا ایسا شیر ہے جس کے ہاتھ ہمارے طاقت کچھ بھی نہیں۔ نئی زندگی کے اس آغاز پر ہماری تمام دعائیں اور نیک تمناؤں آپ کے نام۔"

امانت نے باواز بلند اعلان کرنے کے انداز میں کہا تھا۔ اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے سامی کے طور پر کچھ دیا تھا۔ مستقیم منع کرتا رہ گیا مگر وہ سب باری باری آ کے اسی طرح اسے دیا

رہی۔

اب دل چاہے خامشی سے ہونٹوں پر میں لکھ دوں پیاری سی باتیں کئی
ہو کچھ پل میرے نام کمرے کرے میں بھی اس کے نام لکھوں ملاقاتیں کئی
پہلی ہی بکٹی میں بن گئی جان پر، نیناں نیناں اس دل پر چھا گئے

اب جاؤں کہاں پہ یہ دل رکا ہے وہاں پہ
جہاں دیکھ کے مجھے وہ آگے بڑھ گیا اوسے
شیدائی مجھے کر گیا کر گیا
ربا میں تو مر گیا شیدائی مجھے کر گیا

وہ اک وجہ کی کیفیت میں تھا جیسے، گانے کے بول حسب حال یوں تو وہ سب کے سب
اونچے لمبے قدوں کے بھرپور سراپے کے مالک تھے مگر اس میں شک و شبہ نہیں تھا کہ خلیفہ مستقیم ان میں
سب سے نمایاں تھا ہر لحاظ سے۔ وہ بہت وجہ بھی تھا اور طویل بھی۔ اس نے پہلی بار دھیان
اسے دیکھا تب ہی یہ انکشاف بھی ہوا تھا۔ یقیناً شادی کے سلسلے میں یہ اہتمام تھا کہ نہ صرف بالوں
کننگ کرائی گئی تھی بلکہ تازہ شیو بھی اس کے چہرے کو نکھار کے رکھ گئی تھی۔ خدو خال کی دلکشی اور
انگیزی پوری طرح اجاگر تھی۔ صاف ستھری رنگت گفتگو کے انداز اس کے تعلیم یافتہ ہونے کی بھی
کھاتے تھے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ اس راستے پہ دانستہ آگیا تھا یا کوئی اور محرک؟ وہ بنا چاہے۔ بنا خواہ
اسے دیکھنے اسے سوچے گئی جبکہ وہ گنگنا رہا تھا۔

موسم کے آزاد پرند سے ہاتھوں میں ہیں اس کے

یا وہ بہاروں کی ہے
سردی کی وہ دھوپ کے جیسی
گرمی کی شام کی ہے
میرے پیار کا موسم بھی ہے
گئے میری محرم بھی ہے

جانے کیا کیا تو آنکھوں میں وہ پڑ گیا اوسے
ربا میں تو مر گیا شیدائی مجھے کر گیا کر گیا
کوئی دل پہ قابو کر گیا اور عشقا دل میں بھر گیا
آنکھوں آنکھوں میں وہ آنکھوں مچاں کر گیا اوسے

وہ بے حد خوش تھے اور اب بسنا ہوا گوشت کھانے میں مصروف تھے۔ ساتھ میں شراب کی بوتلیں
کھل رہی تھیں۔ دیا کا دل گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا تھا جب ایک نرے اٹھائے خلیفہ مستقیم اس کی
جانب آگیا۔

”خود کھو کی یا میں ہی کھاؤں؟“

اس کی آنکھیں مسکرا کر پھینچ رہی تھیں۔ دیا نے جلتی آنکھوں سمیت منہ پھیر لیا۔ وہ اس کے
مقابلہ بیٹھا بھی کتنی بھرپور کیسا چھایا ہوا لگ رہا تھا۔ دیا تو بالکل گڑبڑا لگتی تھی اس کی ایسی نمایاں ہوتی
ہائٹ کے سامنے۔ اس کی ذہنی رو جیسے ٹپکنے لگی۔

”اونٹ کی طرح قد نکال رہی ہے۔ کیا آسمان کو ہاتھ لگا کر دم لے گی۔“

امی کو پتہ نہیں کہ اسے بڑھتے دیکھ کر ہول اٹھنے لگتے اور بابا کو امی کی نظر لگ جانے کا خدشہ
واقع ہو جایا کرتا۔

”ہر وقت نہ تو کا کریں بیگم میری بیٹی کو۔“

”اوپر۔“ امی کو کیا پتہ۔ اسارٹ اور لمبی لڑکیاں ہر جگہ کیسے نمایاں ہوتی ہیں۔ آپ کا لُج آ کر
میری نور دیکھیے گا۔ لڑکیوں رشک کرتی ہیں میری ہائٹ پر۔“

وہ اترا کر ابھی اور بابا کا سیر وں خون بڑھ جاتا۔ جیسی امر کی تائید میں لمحہ بھر کی تاخیر نہ کرتے۔

”تو اور کیا۔ تمہاری ماں کو کیا پتہ بیٹے!“

وہ بھی ساتھ مل کر امی کو زچ کرنے لگتے اور وہ کتنا زچ ہو بھی جایا کرتی تھیں۔

”بس کائنات ہی ہے یہ نور۔ اسے شادی بھی کرنی ہے اس کی کہ نہیں؟ اتنا اونچا کا اپنے
خاندان میں تو کوئی نہیں۔ یہ تو سب مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئی۔ ہے کوئی تک چھوٹ ہو رہا۔ ہے اس کا
قد۔“

امی بھی کہاں با۔ ماننے والی تھیں۔ دیا بابا کے سامنے جھینپ جاتی۔ جبکہ ان کا اطمینان قائم دائم
رہتا۔

”بے فکر ہو۔ اس کے لیے ہر قسمیں نہیں ڈھونڈنا۔ جس اللہ نے میری بیٹی کو پیدا کیا ہے اسے قد
دیا ہے اسی نے اس کا جوڑ بھی اتارا ہو گا۔“

”کبھی ایسا نہ ہو جو کامیاں قد میں ان سے چھوٹا ہو۔ پھر کتنی عجیب لگے گی نا ان کی جوڑی۔“

ڈیٹان کھی کھی کر کے ہنسنے لگتا اور وہ جس کی جاتی۔ پک جھپک اسے مارنے کو دوڑتی۔

”خیر داد۔ منہوس۔ یہ بات دوبارہ نہ کہنا۔ کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے۔“

ذیشان کے ساتھ لائیب بھی دانت نکالنے لگی۔

”بھوکیا جی جی تمہیں چھوٹے قد کے مرد پسند نہیں؟“

”نہیں لیکن میرے ساتھ تو مجھ سے زیادہ بائٹ کا ہی بندہ سوت کرے گا۔“

وہ شرما کر کہتی اور مسکرائے جاتی۔ گلابی چہرے پر کتنے حسین رنگ بکھر جاتے تھے اور ان رنگوں کو

دیکھتے ذیشان اور لائیب با آواز بلند دعا مانگا کرتے۔

”یا اللہ پاک ہماری بھوک کو مال اینڈ پیمنٹ سم ولہا عطا فرما نا آمین۔“

”تم آمین۔“

وہ شرارت سے کہتی اور سب کھٹکھٹا کر ہنس پڑتے۔ فائر کی آواز پہ وہ ہز بزا گئی تو احساس ہوا پورا

چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اسے احساس ہوا دعا مانگتے وقت دعا کی کاملیت کا خیال رکھنا کتنا ضروری ہوا

کرتا ہے۔ کاش یہ شخص اتنا شاندار اور مکمل نہ ہوتا مگر اچھا اور نیک انسان ضرور ہوتا۔

”چلو آؤ۔ اب ان کی بد تمیزیاں بڑھیں گی ہی۔“

فلینڈ مستقیم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی نظروں کا مرکز اب وہ نہیں راجو وغیرہ تھے۔ جو فل مستی

کے موڈ میں تھے۔ اک دوسرے پہ شراب پیچھتے اور شرارتیں کرتے ہوئے۔ دیا نے بالکل مزاحمت نہیں

کی۔ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اک راہداری سے گزرا کر وہ اسے جس کمرے میں لے کر آیا تھا وہ اس کمرے کی نسبت کھلی

تھا، جس میں اب تک دیا کا قیام تھا۔ کمرے کا ماحول نیم تاریک تھا۔ جس کے دروازے سے قدر

رکھتے ہی مستقیم نے ٹائٹ بلب روشن کر دیا تھا۔ گزیار کی شکل کا یہ سرخ بلب تھا جو عام ٹائٹ بلب کے

مقابلے میں بہت کم روشنی دے رہا تھا۔ اتنی کم روشنی کہ کمرے میں دور تک دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔

سامنے بستر پر جانے کس رنگ کی چادر تھی وہ نہیں جان سکی کہ پورا بستر گلاب کی پتیوں سے ڈھکا

ہوا تھا۔ ماحول میں گلاب اور مویہ کی مسکور کن مہک تھی۔ اس کا دل آنے والے لمحات کے خیال سے

ڈوبنے لگا۔ وہ اتنے مضبوط اعصاب کی تھی نہ ہی خدا کی خاص ہستی۔ پھر اتنی بڑی آزمائش۔ اس کا دل

جانے کس کس مال سے سکھنے لگا تو وہ موتی پھر اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ جنہیں مستقیم

دیکھا اور اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ دھر کے اپنا مقابل کر لیا تھا۔

”ایسا مت کرو دیا! تم میری اندھیری زندگی میں واقعی روشنی بن کر داغ ہوئی ہو۔ مجھے اس غم

کو خوشی سے محسوس کرنے دو۔ میرے ساتھ اس طرح ریٹکس فیل کرو جیسے کوئی بھی نئی نویلی دلہن اپنے

شوہر سے پہلی بار مل کر سکتی ہے۔ میں نے تمہیں جس طرح بھی حاصل کیا ہے مگر اتنا یقین رکھو کہ

تمہیں اپنی قربت اپنی محبت سے نہال کر دوں گا۔ ایک بار۔ بس ایک بار تم میرے نام ہو جاؤ۔ پھر

بے فکری ہی بے فکری ہے۔ یونوات دیا! میں نے اپنی اب تک کی زندگی میں ہر طرح کی عورت کو

دیکھا ہے۔ پاس سے گزرنے والی عورت کا بھی شجر بائیں ہٹا سکتا ہوں۔ چائنا ہوں شریف عورت

کچے رنگوں کی طرح نہیں ہوتی کہ ہاتھ دھوے اور رنگ مناسب۔ وہ تو جب رنگتی ہے تو کاڑھے رنگ

میں رنگتی ہے۔ کبھی نہ اترنے والے کچے رنگ۔ تمہارے بھی لڑکی کو اسی لیے تو شریک سفر کیا ہے جان

مستقیم کہ تم جیسی عورت سے کسی قسم کی بے وفائی کا خطرہ نہیں ہوتا اور تمہیں پتہ ہے۔ جب کوئی عورت

کسی مرد سے بے وفائی کرتی ہے تو گویا مرد کی سب سے بڑی توہین کرتی ہے۔

اس کی بے وفائی اس بات کا اعلان ہوتی ہے کہ اس مرد میں کوئی کمی تھی۔ جو اس نے کسی

دوسرے میں ڈھونڈنا چاہی۔ اور کم از کم میں تو یہ توہین انور نہیں کر سکتا۔“

وہ کہتے رہا۔ دیا صدم بگم بیٹھی رہی۔ گویا کچھ نہ ہو نہ سمجھا ہو۔ مستقیم نے اسے بغور دیکھا پھر

منکرانہٹ و با آواز اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیا لے میں لے لیا۔

”ادھر دیا! یہ نی طرف یار! اتنا بھی کیا ترزا نہیں ہوں۔ اک دور تھا جب بہت لڑکیاں مرقی

تھیں میری وہاں بہت پہ۔“

وہ کسی قدر شرارت سے کہہ رہا تھا۔ دیا کی بے بسی کی انتہا نہ رہی تھی جیسے جیسے آنکھوں کی سطح پہ

چمکتی نمی گالوں پر پھیل آئی۔ جسے مستقیم نے ہونٹوں سے سمیٹا تھا۔ پھر درمیانی فاصلہ سمیٹتے ہوئے اس

کے بے حد نزدیک آ گیا اور جو جھل سرگوشی اس کی سامتوں میں اندلی تھی۔

”آج یہی قربت میں رونے والی لڑکی آنے والی کل میں میری پناہوں میں آسودہ بھی ضرور

ہوگی ان شاء اللہ۔“

دیا کے اندر تک انظر اب بھرنے لگا۔ وہ جتنی وحشت زدہ تھی مستقیم اسی قدر کیڑے رنگ ہو رہا تھا۔

اس کا جو جھل لبہ کچھ اوپر جو جھل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اس کے آنسو پھٹتا تھا۔

میرے چاہتوں کا گھانا کر

میرے چاہتوں کا گھانا کر

میرے چاہتوں کا گھانا کر

میں نے کب کہا مجھے پیار دے

وہ سراپا اللغات تھا۔ محبت و عقیدت تھا مگر اس کے لیے امتحان تھا۔ سزا تھا آزمائش تھا بس۔ ہٹاک تھا۔ مطلب پرست تھا۔ اور کچھ بھی نہیں۔ وہ سو گیا مگر دیا کی ساری رات آنکھوں میں کئی تھی آنسو آہیں سسکیاں کرو نہیں بدلتے بدن نوٹنے لگا تھا۔ گریہ و زاری سے آنکھیں جل رہی تھیں۔ یہ تھا اس کا نصیب؟

اس نے بار بار مرتبہ سوچا اور جی چاہا وہ حازیں مار کر روئے۔ جنوں کی آخری حد سے گزر جائے دل پھٹ جائے۔ برا احساس سے نجات تو حاصل ہو۔ خلیفہ مستقیم کے لیے یہ قربت جتنی بھی سرشاری آسودگی اور تسکین کا باعث ہو۔ اسے تو ایک ہی احساس ملا تھا۔ پامالی کا احساس، وہ جیسے خود سے نکالیں چار کرنے سے قاصر تھی۔ وہ مرد تھا۔ اظہار میں بڑا بے شرم۔ وہ بے بس عورت تھی۔ پامال اور گھائل ہوتی ہوئی۔

وہ روتی رہی۔ فجر کا وقت اسے جاگتے ہوا۔ مگر اس کے دل میں نماز کی ادائیگی کا خیال تک نہ لگا۔ اتنی ہی شاکی تھی وہ صرف اپنے نصیب سے نہیں نصیب لکھنے والے رب سے بھی۔ یہ اس گمراہی کی طرف پہلا قدم تھا۔ حالانکہ شب کے اختتام پہ وہ ہمیشہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرتے کرتی تھی۔ مگر اس وقت فطری کے بھرپور احساس سمیت پڑی سکتی رہی۔ قسمت سے شاکی ہوتی رہی اور پھر جانے کب سو گئی۔ یہ سوئے بغیر کہ اس کا رب ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کا منتظر ہے کہ مانگے اور وہ عطا کرتا چلا جائے۔ اسے مانگنے والے ہاتھ بہت محبوب ہیں۔

یہ اس کی شادی کی اگلی صبح تھی۔ جب وہ انھی تو خلیفہ مستقیم کمرے میں نہیں تھا۔ اسے دیکھنے کوئی خواہش بھی نہیں تھی دیا کے اندر۔ بستر میں جیسے لیٹی تھی یعنی رہی۔ اعصاب پہ سستی اور کسالت کے ساتھ یاسیت کا غلبہ تھا۔ وہ جیسے خود سے بھی روٹتی ہوئی تھی۔

”انہ جاؤ بیگم صاب! آج ناشتہ اکٹھا کریں گے ہم۔“

وہ اندر آ گیا تھا۔ اب اس کا لطف کھینچ کر باقاعدہ واپار رہا تھا۔ دیا نے ان سنی کی تھی اور وہ ویسے پڑی رہی۔ خلیفہ مستقیم نے گہرا سانس کھینچا پھر پائنتی سے گھوم کر اس کے پہلو کی جانب آگئے لیکن وہ لطف میں اس کے ساتھ آن گھا تھا۔ دیا کو سرا سیدہ کرنے کا باعث اس کی جوار میں تھیں۔ وہ جیسے تڑپ کر نہ صرف فاصلے پہ ہوئی بلکہ بستر سے ٹھل گئی۔ مستقیم اس کی بے پرواہی دیکھتا ہستے ہوئے دو براہوئے لگا۔

”دیکھا اپنی بات منوانے کے کتنے گرا آتے ہیں مجھے۔ محبت کرنی سیکھ لو لڑکی ہم سے۔“

ایک آنکھ دبا کر وہ جتنے شریر انداز میں بولا تھا۔ دیا کی غم و غصے اور تنفر سے اس قدر بری حالت ہونے لگی۔ حد تھی یعنی بے حسی کی۔ اس کا بس کہاں چلتا تھا سوائے آنسو بہانے کے۔ اور خلیفہ مستقیم اسی قدر تھکا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ کتنی دیر کچھ بولنے کے قابل نہیں ہو سکا تھا۔

”کیوں اتنا رو رہی ہو دیا! ابھی سے سارے آنسو بہا لو گی تو میری موت پر کیا کرو گی؟“

اس کا لہجہ عجیب تھا۔ دکھ کی گہری آغج سے کچھلتا ہوا۔ اذیت و کرب سے بوجھل۔ مگر دیا کی جھنجھلاہٹ اور فطری اس بل کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ جیسی بغیر لحاظ رکھے اس پہ چڑھ دوڑی۔

”اگر تمہیں اپنی موت کا ایسا ہی گہرا یقین تھا تو میری زندگی برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

تنفر سے بھرپور۔ تھیک آ میز حقارت زدہ لہجہ۔ خلیفہ مستقیم کے وجہ چہرے کو یکدم کتنا پھیکا کر کے رکھ گیا تھا۔ ایک سکتے کی سی کیفیت طاری ہوئی تھی اس پر۔ شاید اسے دیا سے اس درجہ بے مروتی اور فطری کی توقع نہیں تھی مگر اس نے خود کو سنبھال لیا اور کھسیا کر ڈرا سا ہنسا تھا۔

”میں نے سوچا تھا کہ

ایسا کرتے ہیں تم پہ مرتے ہیں

ہم نے یوں بھی تو مر ہی جاتا ہے“

اور دیا رو ہانسی ہوتی چلی گئی تھی۔

”یہاں سے چلے جاؤ خلیفہ مستقیم! اور نہ میں کچھ کر گزروں گی بتا رہی ہوں۔“

وہ آنکھیں نکال کر چیخی اور خلیفہ بجائے خائف ہونے کے اس پر فدا ہوتا چلا گیا تھا۔

”کر گزرو جو کرنا چاہتی ہو۔ مارنا چاہتی ہو مجھے مار ڈالو۔ اف تک نہیں کروں گا قسم سے۔ آزمائش شروع۔“

وہ اسے بازوؤں میں بھر کے کتنے رمان سے گویا تھا اور دیا کچھ کبے بغیر ہڈ حال انداز میں اس کے سینے پہ سر رکھے بے تحاشہ روتی چلی گئی۔ خلیفہ مستقیم نے اس کے سر کو بہت محبت اور نرمی سے چھوا پھر بے حد رمانیت سے گویا ہوا تھا۔

تھک و محوم نہیں تھکے کو بھلا کیا معلوم

تیرے چہرے کے سے یہ سادہ سے اچھوتے سے نقوش

میرے خیالات کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں

تیری زلفیں، تیری آنکھیں، تیرے عارض، تیرے ہونٹ

کبھی انجان سی معصوم خطا کرتے ہیں

خلوت بزم ہو یا جلوت تہائی ہو

تیرا پیکر میری نظروں میں ابھر آتا ہے

کوئی ساعت ہو کوئی فکر ہو کوئی ماحول

مجھ کو ہر سمت تیرا حسن نظر آتا ہے

دھوپ میں سایہ بھی ہوتا ہے گریناں جس دم

تیری بانہیں میرے میری گردن میں اتر آتی ہیں

"مجھے آزما لو دیا! میں ہمیشہ تمہیں یونہی چاہوں گا۔ تم ہمیشہ میرے لیے خاص رہو گی۔ پلیز مولا

ٹھیک کر لو اب اپنا۔"

وہ ہنستے تھا اور دیا تھکتی جا رہی تھی۔ وہ فریض ہوئی تو مستقیم نے اسے ناشتہ دیا تھا۔ اس کے بعد

کچھ دوا کھائی اور سہارا دے کر پھر سے بستر میں لٹا دیا۔

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے میں جانتا ہوں۔"

اس پر خلاف برابر کرنے کے بعد وہ مسکرا کر کہتا اس کا ماتھا چوم کے خود باہر چلا گیا۔ دیا نے جلتی

ہوئی آنکھیں موند لیں۔ وہ اتنی غائب محسوس کر رہی تھی کہ اب آنسو بہانے کی ہمت بھی نہیں رکھتی

تھی۔

☆ ☆ ☆

"اس ملائے اور اس گھر کا میں بے تاج بادشاہ ہوں دیا! یہاں مستقیم کا حکم چلتا ہے۔ سب کچھ

میرے سمیت صرف تمہارا ہے۔ یہاں تم جیسے چاہو اپنی مرضی سے رہو۔ کسی کی ہمت نہیں کہ مداخلت کر

جائے۔ تم ملکہ ہو یہاں کی۔"

قطار در قطار تین کرکڑے درختوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے مستقیم نے اسے مخاطب کر لیا تھا۔

وہ صبح اٹھ کر باقاعدگی سے جاکنگ کیا کرتا تھا۔ آج زبردستی اسے بھی ساتھ گھسیٹ لایا۔ دیا نے سن کر

بھی نظر انداز کر دیا۔ اسے اس کی باتوں سے مطلب تھا نہ دلچسپی۔ مگر مستقیم برا نہیں مانتا تھا۔ نہ

اس کی ناگواری کو نہ نظر اندازی کو۔ وہ واقعی اس کے لیے یکسر مختلف انسان ثابت ہوا تھا۔ سراپا محبت۔

سراپا عاجز۔ یہ اس کا انوکھا اور دلکش روپ تھا۔ مگر دیا اسے بس اک بے رحم اور بے حس و کھنور ڈاکو کے

حوالے سے ہی جانتی تھی۔ یہی نقش گہرا تھا۔ وہ اسے ہی گہرا رکھنا چاہتی تھی۔ یا پھر وہ اس سے نفرت

کے علاوہ کوئی دوسرا شے دوسرا خلق استوار کرنے پر آمادہ تھی نہ تیار۔ جیسی بے حسی اور بے لیاپا چاہتی تھی۔

"تمہیں پتہ ہے دیا! محبت اپنا آپ ضرور منواتی ہے۔ مجھے یقین ہے میں اک دن تمہیں اپنی

محبت سے جیت لوں گا۔"

وہ چلتے چلتے رکا اور اس کے سامنے اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ دیا نے اسے اب کے دانستہ

نظر انداز کیا اور کتہہ کر دھنکا چاہا۔ مگر خلیفہ مستقیم نے پھر پک کر اس کا راستہ روک لیا تھا۔

"بتن مرضی اس نظر اندازی کی مار مار لو دیا! مگر تم مجھے ہر راستے پر اپنا منتظر پاؤ گی۔"

اس کا لہجہ اطمینان چھلکا تا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں تھانک کر کسی درجہ شوخی سے کہہ رہا تھا۔

جواب دیا کی نظریں سپاٹ تھیں سپاٹ رہیں۔ البتہ لہجہ زمانے بھر کی تنگی اور نفرت کے ساتھ کدورت بھی

سمیٹ لایا تھا۔

"زندگی ہر بار تمہاری من پسند سوغات تمہاری جھولی میں ڈالے یہ ضروری تو نہیں۔ خوش فہمیوں

کا دائرہ اتنا وسیع مت کرو کہ پھر مایوسی کا سامنا کرنے پر ٹوٹ پھوٹ کے مرحلے سے گزرنا پڑے۔

میں بتا چکی ہوں تمہیں میرے دل میں تمہارے جیسے گھنیا انسان کے لیے ہر گز بھی کوئی گنجائش نہیں ہے

اور ایسے شخص کو میں اپنی ذات سے خوشی دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ جس نے مجھ سے میرا سب کچھ

چھین لیا ہو۔ میرے اپنے رشتے، میرے احساسات یہاں تک کہ میری شناخت بھی۔

وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر بنگ اٹھی تھی اور خلیفہ مستقیم بے چین، بے قرار ہونے

لگا۔ وہ جتنا اسے بہانے، جوڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی قدر ناکامی ہوا کرتی۔ بے بسی نقطہ عروج پہ

تھی۔

"مر۔ نے کی حد تک شرمندگی محسوس کرتی ہوئی جب یہ خیال دامن گیر ہوتا ہے کہ میں ایک ڈاکو

کی بیوی ہوں۔ کاش مرگئی ہوتی میں اس سے پہلے ہی۔

وہ سسک سسک کر بے حال ہوئی جاتی تھی۔ مستقیم گم صم کھڑا تھا۔ اس کے دل میں عجیب سا

ظلال چٹکیاں بھرنے لگا۔ شاید نہیں یقیناً وہ اس لڑکی کے ساتھ واقعی زیادتی کر گیا تھا۔ کوئی بھی باعزت

لڑکی اس کی شہت میں خوشی محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ وہ واقعی مفاد پرست تھا۔ اس نے صرف اپنا سوچا۔

اس لڑکی کے نفع نقصان کو سرے سے نظر انداز کر ڈالا۔

"تم بھول کیوں نہیں جاتی ہو اس سب تلخ حقیقت کو۔ تم سمجھو یہ بھی تو کر سکتی ہو دیا! وہ لڑکیاں

بھی تو سمجھوتہ کرتی ہیں جن کے سسرال والے سخت مزاج ہوتے ہیں۔ ان سے ان کے والدین سمیت

ساتھ بڑے شے چھڑا دیتے ہیں۔ مگر وہ اپنی گزشتہ کو بچانے کی خاطر یہ قربانی دیتی ہیں۔"

اس کا انداز ناسخا تھا اس کے باوجود دیا کو جیسے آگ لگ گئی تھی۔ اس نے سرخ آنکھوں سے

”چمک مت کر یا ر! اسے میں نے نہیں بلوایا۔ خود آئی ہے یہ۔ بیشک پوچھ لے۔ تیرے سامنے بیٹھی ہے۔“

شاہد جو اس کی طرف ہی متوجہ تھی اور بہت زیادہ گہری حیرانی سے اسے تنک رہی تھی دانستہ کھجاری۔

”خیریت بڑے چمک رہے ہو۔ قسم سے دل ڈانواں ڈول ہو گیا ہے میرا۔“
وہ ہنس رہی تھی۔ خلیفہ مستقیم کو کھین شیوہ کیمنے کا پہلا تجربہ تھا اس کا اور بہت دلکش وہ واقعی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”تمہیں منع کیا تھا یہاں آنے سے۔“

خلیفہ کا وہ بے حد برہم ہو رہا تھا۔ انداز کی سنجیدگی خوفناکی میں ڈھل رہی تھی مگر وہ کہاں خانہ ہونے والی تھی۔

”تم سے ملنے، تمہیں دیکھنے آئی ہوں۔ خبر ہی نہ تھی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ قسم سے قیامت لگ رہے ہو اور سنو خواخوہ کی پابندیاں نہ لگایا کرو سمجھے۔ کچھ دے نہیں سکتے تو منواؤ بھی مت بس نہیں رو سکتی میں تمہارے بغیر۔“

وہ اٹھ کر خنوس انداز میں اس سے گلے ملی تھی۔ خلیفہ کی تمام تر ناگواری کے باوجود۔ اور جب خلیفہ نے اپنی سابت رکھائی وہ بے اعتنائی سے اسے جھٹکے سے خود سے الگ کیا وہ دکھ بھری ہنسی ہنسنے لگی تھی۔

”ابھی تک ویسے ہو۔ کھنور، بے حس اور پتھر۔ کبھی میرا دل کرتا ہے تمہیں بدعادوں مستقیم! تمہیں کسی سے ویسی ہی جینے مرنے والی محبت ہو جائے جو مجھے تم سے ہے۔ تم بھی ویسے ہی ترپو جیسے مجھے تم ترپاتے ہو۔“

اس کے کوسنوں کو خلیفہ نے کہاں اہمیت دینی تھی مگر راجو ضرور بے ڈھنگے انداز میں ہنسنے لگا تھا۔
”سمجھ لو شاہل پھر تمہاری آدمی بدعاد پوری ہوئی ہے۔ محترم کو عشق تو ہو گیا ہے مگر یہ ترپنے والے نہیں ہیں۔ شادی کر کے موج اڑا رہے ہیں۔ بہتر ہے اب تم بھی امانت بیچارے کی محبت کو شرف قبولیت بخش دو۔“

راجو کی بات نے سچ معنوں میں شاہل کو دھچکا لگایا تھا۔ وہ شاکد ہو کر ٹکڑ ٹکڑیوں کو تکتے گئی۔ خلیفہ مستقیم ازل سے بے نیاز تھا جبکہ راجو کی آنکھوں کا یقین اس کا دل اذیت سے بھرنے لگا۔
”یہ سچی ہے مستقیم؟“

مستقیم کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

”مگر میں یہ قربانی کیوں دوں؟ کیوں کروں یہ اک ڈاکو کے لیے سکری فائز؟ مجھے تم نے میرے والدین سے مانگا نہیں۔ شرمناک انداز میں مجھے اپنے ساتھ اٹھا لائے۔ لوٹا ہے مجھے میرے بابا! امی، دادی، بھائی اور بہن کیسے کیسے نہ ترپتے ہوں گے۔ میرے نام سے۔ انہیں صبر نہیں آتا ہو گا لوگوں کی نظریں، ان کی باتیں کیسے سہی ہوں گی انہوں نے۔“ ان باتوں کا تمہیں بھلا لگا اندازو۔“

وہ اتنی مشتعل تھی کہ اسے دھکا دیتے ہوئے چینی۔ خلیفہ مستقیم اسے ہونٹ بھینچے دیکھتا رہا۔ دیا کہ البتہ اشتعال تھا نہ تم وہ خنوس، جیسی مزید اسے کھری کھری سنائے گئی۔

”مگر تم کیوں سوچو گے۔ مرد جو ٹھہرے۔ تمہارے لیے کسی بھی عورت کو یوں اپنی انا اور مردانگی کی جینٹ چڑھا دینا بے حد معمولی بات ہے۔ بہت زعم ہے نا تمہیں اپنی طاقت، اپنی وجاہت کا جیسی تم نے مجھے یوں پامال اور بے مول کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی۔ فیصلے کی تلوار سے فزائ کر تے تمہیں ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ تم کیا جانو تمہارے اس سفاکانہ عمل نے مجھے کیسے کیسے نہیں ترپایا اور زندہ درگور نہیں کیا۔ مگر میں بتاؤں کہ تم قابل محبت نہیں قابل نفرت ہو۔ مت رکھو مجھ سے محبت کی طمع۔ تم وہ ہو جس نے اپنی اسی مردانگی کے زعم میں مجھے سولی پر لٹکا دیا ہے۔ دو گھڑی کی محبت کے عوض میری کی وفاداری و اعتبار کی خواہش رکھتے تمہیں شرم تو نہیں آتی ہوگی۔ تم نے غور کیوں نہ کیا خلیفہ مستقیم تمہاری اس جبری قربت میں میرے لیے سوائے اذیت کے اور کچھ نہیں ہے۔

بات سنو خلیفہ مستقیم عورت امرت کا چھلکتا پیالہ نہیں ہے کہ جب چاہا اسے ہاتھ میں پکڑ کر اسے لگا لیا۔ نہ پر فیوم کی بوتل کہ اٹھایا اور خود پر تہی بھر کے چمڑک لیا اور مہکنے لگے۔ سوچنا کبھی کہ وہ ایک دل رکھتی ہے روح اور احساسات رکھتی ہے۔ اسے بھی سمجھنے کی ضرورت ہے خاص طور پر تم پر نفس پرست بے حسوں کو۔

بات کے اختتام تک وہ ہنسنے کے روتی پلٹ کر اندر بھاگ گئی تھی۔ خلیفہ مستقیم ایسے کھڑا جیسے پتھر کا ہو گیا ہو۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے دھیان میں اندر آیا تھا۔ وہاں فرشی نشست پر راجو اور امانت کے ساتھ شاہل کو دیکھ کر جوئے بغیر نہیں رہا۔ صبح پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہوئی تھیں۔ اس کی کڑی نظریں امانت پر تھیں جو ان نظروں کا مفہوم سمجھتا ہو اسی تیزی سے وضاحت پیش کرنے لگا تھا۔

”میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔“

”وہ اسے دیکھ نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ شامک کا دل خون ہونے لگا۔“

”میں انتظار کر لیتی ہوں۔ جب تم۔“

”بڑا۔ ہے۔ ادا صل۔ میں کبھی تمہاری امید پر پورا نہیں اتر سکتا۔“

اس کا انداز بڑھتا تھا۔ وہ آج بھی اسی طرح تھا۔ بے حس اور مغرور۔ جیسی تو وہ بے تحاشا دوری

تھی۔ اپنی۔ ہے۔ اتنی پر۔ امانت اسے چپ کراتا عاجز ہونے لگا۔

”یہ وہ بہت خوبصورت ہے؟“ مجھ سے بھی زیادہ۔“

اس نے آنسو پونچھتے سسکیاں بھرتے سوال کیا۔ امانت سرد آؤ بھر کے متاثرانہ نظروں سے اسے

دیکھنے لگا۔

”خلیفہ مستقیم جیسے بندے کی چوائس صرف حسن تو نہیں ہو سکتا احمق لڑکی! ایسا ہوتا تو وہ کبھی تمہیں

نہ ٹھہراتا۔“

امانت کے متاثرانہ انداز پر اس کی دیکھری میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”وہ پارہا ہے یہ اس کے ماتھے پہ لکھا ہے۔ جو خلیفہ صاحب نے پڑھا اور شادی کر لی۔“

وہ بذاتی انداز میں چلائی۔ امانت نے اسے تادمی نظروں سے گھورا۔

”خلیفہ مستقیم اپنی مرضی کا مالک ہے شامل! تم اپنی فرسٹریشن یہاں نہیں نکالو۔ وہ خفا ہو گا۔ بہتر

ہے تم واپس چلی جاؤ۔ پھر کبھی آ جاؤ۔ آؤ چھوڑ آؤں میں تمہیں۔“

امانت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔ وہ نڈھال سی اٹھی تھی۔

”کیا آؤں گی دوبارہ یہاں آ کر۔ کیا بچا ہے بھلا اب باقی۔ اک کام کرو گے؟ مجھے اس کی

تدفیق سے ملے۔“ چاہے دور سے سہی، اک نظر دیکھوں تو سہی اس کا نایاب انتخاب۔“

شامل کے انداز میں عجیب سی حسرت اور نارسانی کا احساس اتر آیا تھا۔ وہ بے بسی کا خالص رنگ

جو یکطرفہ محبت کا خاسا ہوا کرتا ہے۔ بیجان اور لازمی جزو ہوا کرتا ہے۔

”خلیفہ مستقیم! اس بات کو پسند نہیں کرے گا شامل! تم ڈسٹرب ہو۔ چلی جاؤ اب بہتر ہے۔“

امانت نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے سمجھانا شروع کیا وہ گہرا سانس بھر

کے سر کو فنی میں جنبش دینے لگی۔

”راستہ ہی نہیں۔ سرمایہ حیات بھی کھو گیا ہے امانت! تم جانتے تو ہو اس ایک شخص کی خاطر

میں نے۔“

وہ جیسے رو پڑی تھی یہ سوال کرتی ہوئی۔

”تم نے شادی کر لی۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“ کون ہے وہ لڑکی؟ اگر تمہیں کرنی تھی تو پھر میں کیا

نظر نہ آتی تمہیں۔ بولو۔“

فہم۔ غصے اور رنج کی شد یہ کیفیت میں وہ اس کا گہرا بیان پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ کتنا فنی تھی

اسے احساس ہی کہاں رہا تھا۔

”وہ تمہارے جیسی نہیں ہے۔ تمہارے جیسی عورت۔ مجھے ڈیرہ بھی نہیں کرتی تھی۔ پھر تم نے

ہو سکتی تھیں اور سنو۔ آج کے بعد اس قسم کی امتحانہ جہ باتیت دکھانے کی غلطی نہ کرنا۔ آخری پارہ

کر رہا ہوں۔“

خلیفہ مستقیم کا فرامانا ہوا لہجہ جیسے شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے جھٹک کر وہ تضرع بھرے انداز میں

پلٹ کر چلا گیا۔ شامک مشہور فلم سنا رہی تھی۔ حسن ایسا کہ لگتا تھا ہاتھ لگنے سے میلی ہو جائے گی۔ وہ امانت

جاننے والی تھی۔ امانت کے توسط ہی خلیفہ مستقیم سے ملاقات ہوئی تھی اور پہلی نگاہ میں ہی اللہ جل

اسے خلیفہ مستقیم میں کیا بھاگ گیا تھا کہ یوں سب کچھ اس کی خاطر داؤ پر لگا دیا تھا۔ اپنا کیریئر اور

چھوڑ کر وہ وہیں ان کے ذریعے پر آ گئی تھی۔ ہر دم امانت کے ساتھ لگی وہ دراصل خلیفہ مستقیم

صدقے واری ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں ان کا سردار ماکھا تھا۔ خلیفہ کو شامل کے یوں ساتھ آ رہے

اعتراض ہوا تھا مگر وہ اپنی بات منوانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مگر جب اسے شامک کے جہ بات

ارادوں کا پتہ چلا تب وہ خاص طور پر اس سے بدکنے لگا۔

پھر جب سرداری کا تاق اس کے سر پہ سجا تو سب سے پہلے اس نے شامک کو وہاں سے چلا

تھا۔ اس بات پر بہت ایشو بھی اٹھا تھا۔ امانت بہت بھڑکا تھا اور بدگمان بھی ہوا تھا۔ مگر خلیفہ کسی طور

عورت پہ اعتماد کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ان کا اختلاف اتنا بڑھ گیا تھا کہ امانت شامک کی

سے ان کا گروپ چھوڑنے کے ورپے ہو گیا تھا۔

”یہ تمہارا ذاتی فیصلہ ہو گا امانت! مگر میں اپنی جگہ سے نہیں ہلوں گا۔ یہ عورت صرف اس

ہمارے ساتھ رہے گی اگر تم اس سے نکاح کرو گے۔ مجھے صرف اسی صورت میں انکار نہیں ہو گا۔“

اور ان کے دیگر ساتھیوں نے بھی خلیفہ کے فیصلے کا ساتھ دیا تھا۔ شامک نے امانت سے

کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

”تم کیوں نہیں کر لیتے مجھ سے شادی خلیفہ مستقیم!“

وہ اس کے سامنے سوالی بنی کھڑی تھی اور خلیفہ مستقیم کے چہرے پر کڑھکی چھا گئی۔

”سمجھدار کو اشارہ بھی کافی ہوتا ہے۔“

دیانے نے ہنسی منی ناک چڑھا کر نخوت سے جتلیا۔

گو یا ”اشاروں کو سمجھتی ہو تم؟“

وہ پکا یک شوخ ہوا۔ پھر اسی قدر شریر انداز میں اس کی جانب جھک کر سرگوشی میں بولا تھا۔

”محبت سے اشارہ کب کر گی جان مستقیم!“

نیوی بیوسوٹ میں اس کی سرخ و سفید رنگت انگارہ کی مانند دھبہ کی سی تھی۔ شعلہ تھا اس کا حسن

جو ہلا کر خاکستر کرتا تھا۔ وہ بھی خاک ہونے کو تڑپ رہا تھا۔

”قیامت تک بیٹھے رہنا انتظار میں۔ حسرت ہی رہے گی ان شاء اللہ!“

وہ اتنا چڑی تھی کہ بے ساختہ چیخ پڑی۔ مستقیم نے تھم کر اسے کچھ دیر بغور دیکھا تھا۔ پھر لا پرواہ

انداز میں کاندھے اچکاتے ہوئے اسے ایک دم سے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

”میں انتظار کرنے والوں میں نہیں ہوں۔ گواہ رہو۔ سوتے میں ڈسٹرب نہیں کیا۔ ال منیرؤ

ہونے کا طعن بھی نہیں دے سکتیں۔“

وہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ گویا اپنی کامرانی پر سرشار ہو۔ جبکہ دیا کے اندر غضب کا طیش، قیامت خیز

مراحت ابھری تھی۔ مستقیم اس کے پھرے ہوئے انداز کو دیکھتا حیران ششدر ہونے لگا۔ وہ ہر

صورت اس سے اپنا آپ چھڑا لینے کے درپے تھی۔ زبانی کلامی جیسے مرضی طبیعت صاف کر لیتی تھی وہ

اس کی۔ مگر اس طرح اس انداز میں اس نے کبھی مستقیم کی نفی نہیں کی تھی۔ ایسا احتجاج پہلے کبھی دیکھنے

میں نہیں آیا تھا۔ وہ اسی باعث ٹھٹھک گیا تھا۔

جب تمہارے پاس ہر قسم کی عیاشی کے مواقع تھے تو میری زندگی کیوں برباد کی؟ بولو؟“

وہ اس کی گرفت ڈھیلی پاتے ہی سرعت سے اس کا حلقہ توڑتی بستر سے اتر کر دور کھڑی ہوئی

غرائے کے انداز میں بولی۔ مستقیم تو جیسے حق دق رہ گیا تھا۔

”میں سمجھا نہیں؟“ وہ چکرایا ہوا لگ رہا تھا۔

دیانے شے برساتی نظروں سے اسے دیکھا اور آتش دان کے قریب صوفے پر جا بیٹھی۔

”اتنے معصوم ہونا تم۔“ اس کے پھٹکار ڈالنے والے انداز پہ مستقیم ہونٹ بھینچ گیا۔

”جو بھی شکایت ہے۔ بہتر ہے مکمل کر اظہار کرو۔“

”پھر کیا کرو گے تم؟“ اس نے طنزیہ نظروں کی کاٹ سے اسے چھیرنے کی کوشش کی۔

”غلط فہمی دور کروں گا تمہاری یار!“ ان نظروں کے جواب میں وہ وضاحت دیتا جھنجھلایا۔

”بھول جاؤ سب۔ وہ تمہاری منزل تمہارا ٹھکانہ کبھی نہیں بن سکتا تھا۔ وہ اور مزاج کا آدمی

ہے۔ ہم سب یہ بات بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔“

شائیل کی آنکھوں میں بے بسی نفی کی صورت چمکنے لگی۔ وہ سر جھکا چکی تھی۔ انداز کی یاسیت بے

گہری تھی۔

”میری امید پہلے کب ٹوٹی تھی جواب نونے گی۔ اسے بتا دینا میں پھر آؤں گی۔ اس وقت

چلو میرے ساتھ۔ اکٹھے ڈرنک کریں گے۔ ساتھ دو گے نامیرا؟“

اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ امانت کچھ کہے بغیر اس کا ہاتھ پکڑے اس کے ساتھ ہولیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سارا دن سرد ہوا نہیں چلتی رہی تھیں۔ فضا میں تیرتا کبرا موسم کی شدتوں کا گواہ تھا۔ اسی حساب

سے رات سرد اور بریلی تھی۔ باہر ہواؤں کے جکڑ چلتے تھے۔ غنایت ہوائیں درختوں کے پتوں کو ہلکی

خضر رائے دیتی تھیں۔ فضا کی نفی گویا اس بات کا اعلان کرتی محسوس ہوتی تھی کہ رات کو بارش ہوگی۔

کمرے میں خوشگوار حدت تھی۔ چنگ پر وہ ڈبل پائی کا کبل اوڑھے سگریٹ سنی لیتی تھی مگر جسم پھر بھی

ٹھنڈک کے باعث اکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جنگل کی یہ سروی بڑی جان لیوا ثابت ہو رہی تھی اس کے

لیے۔ مستقیم نے کچھ دیر قبل آتش دان میں آگ دھکائی تھی۔ جب ہی کمرے میں میٹھی میٹھی پر حدت

فضا کا تاثر قائم ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا۔ آتش دان روشن تھا۔ اور کمرے میں

موجود قلعے اندھیرے پر تاریخی روشنی کا آتش سا خوابناک تاثر بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ خلیفہ کو بستر کی

جانب آتے پا کر اس نے بے رخی کے ساتھ پھر سر تک کبل کھینچ لیا۔

”ابھی تک خفا ہو مجھ سے تم؟“

اس کے برابر آ کر وہ بے حد نرمی سے اس کے بال سہلانے لگا۔ دیانے نے بے حد تنفر بھرے انداز

میں اس کا ہاتھ زور سے جھٹکا تھا۔

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے دنیوں سے خفا یا ناراض ہونے کی۔“

اس کا انداز ہچکچکا ہوا بے حد نرم و خفاپن لیے تھا۔ مستقیم نے مسکراہٹ دہائی۔

”پھر ہر روز میرے آنے سے پہلے کیوں سو جاتی ہو۔ جبکہ جانتی بھی ہو کہ میں تمہیں ڈسٹرب

نہیں کر سکتا۔“

وہ شکوہ کر رہا تھا۔ مگر بے حد محبت سے۔ مان سے۔

”مجھے ہرگز بھی کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے تمہارے گلے کا پارہ ہوئے اب مگر جاؤ کہ یہ جھوٹ ہے۔ اونہ بڑی صفائی پیش کرتے تھے کہ میں ایسا نہیں ہوں۔ میرا ساتھی کرتے ہیں یہ کام۔“

دو چنچ رہی تھی۔ سلگ رہی تھی۔ مستقیم نے گہرا سانس بھر کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ سرخ چھیدر بستر پر بیٹھ کر سگریٹ ساگنے لگا۔ دیا جو اس کی جانب سے وضاحت کی منتظر تھی اس درجہ بے نیازی بھٹنے لگی۔ اس نے تپتی نظروں سے اسے دیکھا۔ دیا کا دل اسے بھی ساتھ ہی آگ لگانے کا چاہا۔ بڑا دھوکے باز تھا وہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے۔

”اب بولتے کیوں نہیں ہو تم؟“

اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ جیسی منٹیاں بھیج کر چلائی۔ اس کے صبح اور نو فیز چہرے پر بے بسی تھی۔

”میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے دیا۔“

”تم بکو اس کرتے ہو۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ جھوٹے ہو۔“

دیا نے درمیان میں نوکا اور بھڑک کر پھنکاری۔

☆ ☆ ☆

دوسرا حصہ

خلیفہ مستقیم نے ہونٹ بھیج کر جیسے خود پر ضبط کیا۔ اس قسم کی بد تمیزی اسے نہم کرنا دشوار ہوا کرتا تھا اب مگر یہ لڑکی اس کی بات الگ تھی۔

”یہاں آؤ واپس۔“

خاصی تاخیر سے اس نے بے حد سنجیدگی سے اسے پکارا تھا۔

”مجھے کچھ دیر یہیں بیٹھنا ہے۔“

دیا نے آنسو صق سے اتار کر نروٹھے پن سے جواب دیا۔ خلیفہ مستقیم اسے دیکھ کر رو گیا۔ وہ اس کی تپتی ضدی اور بہت دھم دھوری تھی۔

”گب تک“ مجھے سوتا بھی ہے۔“

”تو سو جاؤ۔ مجھے لوری سنا کر تو نہیں سلاتا تمہیں۔“

وہ بھلا اٹھی۔ تنہا غم آ رہا تھا اسے مستقیم پر۔ جبکہ وہ پتہ نہیں کیوں زور سے ہنس دیا تھا۔

”اس سے بھی بڑھیا کام کرتی ہو۔ جو مجھے شمار سے بھر دیتا ہے۔“

اس کا لہجہ استانی کی حد تک بے لگام اور بے مہار تھا۔ تمام تر غصے کے باوجود دیا کا گلابی مائل سین و دلخیز لب انقوش سے سجا چہرہ اس کھلی بات پہ ایک دم سے دھک کر سرخ ہوا۔ اس کی لاپنی چٹکیں لرز چٹکیں۔ وہ چہرے کا رخ پھیر گئی۔ کانوں سے جیسے دھواں نکلنے لگا تھا۔ اس کی نظریں ہی ایسی تھیں۔ سے سر تا پا رنگ دیا کرتی تھیں۔

”یار بیوی پہلے مجھے سلا دو۔ پھر وہاں بیٹھی رہنا۔“

اس نے گہرا کش لے کر سگریٹ پھینکا اور جیسے بیزار ہو کر انھہ کر بیٹھتے ہوئے اسے پکارا۔ دیا نے کسکی نظروں سے گھورا۔

”خلیفہ! مجھے تنگ مت کرو۔ میں آل ریڈی ڈسٹرب ہوں۔“

اس نے برہمی و ناگواری دبائے بغیر کہا تو مستقیم نے ہونٹ بھیج لیے۔ پھر اس نے دوبارہ اپنا منہ لٹک دھرایا اور کروت بدل کر لیٹ گیا۔ دیا اسے بکا ہے دیکھتی بلکہ گھورتی رہی اور کھستی

"اچھی۔"

”یار دنیا سے اٹھنے کو کہہ رہی ہو تو پلیز ذرا ٹھہر جاؤ ابھی۔ اکیچہ لی میں نے ابھی تو تمہیں بتی ہجر کے دیکھا بھی نہیں ہے۔“

وہ کسی قدر بوجھل آواز میں کہتا اس کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا۔ دیا کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

”یہ کیا جتنیڑی ہے؟“ پرے ہنو۔“

وہ اسے دھکیلتے کے انداز میں بناری تھی۔ خلیفہ مستقیم آہستگی سے فہم دیا۔

”اس جتنی ہی میں سارا مل دخل رومانس کا ہے جان مستقیم او یسے دکھایا کیوں تھا مجھے؟“

"خراے مت لو۔ مجھے نہیں آتی خیندا اس طرح۔"

دیانے نہ چاہتے ہوئے بھی وضاحت دی۔ آخر جان بھی تو چھڑانا تھی۔ وہ اسے کسی خوش فہمی میں بھٹا کرنے کے حق میں نہیں تھی۔

”جو تم ہمارا نہیں لیتے۔“

وہ تسلیم خم کر کے مسکرا دیا اور اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ نہپٹائی گئی۔

”مستقیم! کیا فضول حرکت ہے۔ چھوڑ دیجئے۔“

اس نے جبر پور احتجاج میں چیخ کر کہا تھا۔ مگر اس پر انہوں نے ہوا تھا جیسے۔“

”گئی تھو۔ اس وجہ سے نہیں جگایا مجھے؟ میں جانتا ہوں میری بیوی بہت پیارے اور نرم دل کی مالک ہے۔ مجھے اتنی سختی سے ڈانٹا تھا۔ اب ازالہ کرنا چاہتی ہے۔ کہیں مجھ سے محبت سی تو محسوس نہیں کرتے تھی۔“

اس کا انداز شوخ و شنگ تھا۔ وہ اس پر جھکا سوال کر رہا تھا۔ دیا نے دکھ بھری نظریں اٹھاؤ۔ اس کا پرکشش چہرہ اب حد نزدیک تھا۔ شرارت آمیز تبسم سے چمکتی شوخ نگاہیں اور دل آویز مرکان سے بکے ہونٹ۔ وہ خوش تھا۔ بہت خوش وہ اک بار پھر جیتنے جو چاہ رہا تھا۔ دیا کے دل میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ ایسی آگ میں وہ اسے جلائے کے درپے ہونے لگی۔ آخر وہ وہی صرف کیوں جلے۔ گھن اور نفرت کا شعلہ احساس اب تھا اس کے اندر سے جو سب کچھ بہا کر لے جانے کے درپے ہو گیا۔

”پھوڑا کے پھوڑا“

وہ چینی اور پیمبروں کا پورا زور اٹھا کر اسے دھکیلتی اس کی گرفت سے چل کر نکل گئی۔ اگلے لمحے وہ چھانگ مار کر بستر سے کودی تھی۔ مستقیم تو اس کے اس درجہ شدید رد عمل پر بھونچکا رہ گیا تھا۔ نازک مہاراجہ اور ریشمی آنکھوں کے بالوں کے ساتھ بنا دوپٹے کے وہ کیسی قیامت ڈھارہی تھی۔ مستقیم کا رومینک

زندگی خاک نہ تھی

رہی۔ بار بار وہی اک منظر نگاہ کے سامنے آن ٹھہرتا تھا۔ جب وہ بے حد خوبصورت عورت اس
 دیکھتے دیکھتے مستقیم کے گلے لگ گئی تھی۔ کیسا بے تکلف انداز تھا۔ آخر وہ پہلی بار تو اس بے
 مظاہرہ نہیں کر رہی ہوگی۔ اس نے ہونٹ بھیج لیے۔ اگر وہ آج راتہ بھٹک کر ادھر نہ آتھتی تو اس
 کا بید بھی نہ کھلا اس پر۔ اسے مستقیم سے پہلے سے زیادہ نفرت محسوس ہونے لگی۔ کتنا ظالم تھا وہ
 دیر وہ جس بیٹھی اپنی قسمت کا ماتم کرتی رہی۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی بستر پہ آئی کہ کرسی پر اک
 سے بیٹھنا بھی اک آزمائش تھی مگر سکون یہاں بھی کہاں تھا۔

وہ سوتے میں خزانے لینے کا عادی تھا اور دیا بے آرام ہوا کرتی۔ اس وقت بھی مسکرا کر خزانے۔ اسے کروٹوں پر کروٹیں بدلنے پر مجبور کرتے رہے۔ اسے ایک دم سے لاسب یاد آگئی۔ اس بات کو یاد کرتے اسے پتہ بھی نہ چلا وہ کب رو پڑی تھی۔ اس کی بد دعا اسے لگ گئی تھی۔ وہ واقعی خراب لیتا تھا۔ دیا نے آنسوؤں سے دھندلائی نظروں سے اسے دیکھا۔ بے خبری اور سکون کی خیندہ اس کا ایسا بد معاش اور غلط انسان نہیں لگتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس اس کے خوب رو بے تحاشہ حسین چہرے عجیب سی ملاحظہ۔ نرمی اور روشنی سی پھیلی تھی۔ جو اسے حسین سے حسین تر بنا کر دکھا رہی تھی۔ لاشعری ہوئی گھنی چٹکوں والی بادامی آنکھیں، کثرت سگریٹ نوشی کے باعث منافی پڑتے سرخ ہونٹ، چیشانی پر بکھرے ریشمی بال اور شیر جیسا مضبوط اپنی لبان ترنگا غضب کی مردانگی سمیٹ دراز سر۔ تو کہیں بھی کمی نہیں تھی۔

”آؤ۔ کاش! یہ اتنا جندسم نہ ہوتا۔ مگر ایک مہذب انسان ہوتا۔“

اس کا دل ماتم کناں رہا۔ جانے کتنی دیروہ یونہی روتی رہی۔ دل کا بوجھ ذرا سہی کم چلا۔ یہ رونا تو عمر بھر کا تھا۔ اس نے بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

”میرے چہرے پر بھی رولوں۔ تڑپ لوں۔ اب میری قسمت نہیں بدل سکتی۔“

اس نے مایوسی اور تنفر سے سوچا اور ایک بار پھر کروٹ بدلی۔ مگر مستقیم کے خزانے اس طرح زنج کر کے رکھ گئے تو جھنجھلا کر اُبھرتے ہوئے اسے دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑ ڈالا۔

”میرا چہ تا بھی رولوں۔ تڑپ لوں۔ اب میری قسمت نہیں بدل سکتی۔“

اس سے مایوسی اور تنفر سے سوچا اور ایک بار پھر کروٹ بدلی۔ مگر مستقیم کے خزانے کی طرح زینج کر کے رکھ گئے تو جھنجھلا کر اٹھتے ہوئے اسے دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑ ڈالا۔

”ک۔ کیا ہوا؟ خیریت؟“

"ک۔ کیا ہوا؟ خیریت؟"

وہ ہڑا کر جاگا آواز اور آنکھیں دونوں ہی خمار آلود تھیں مگر سرخ آنکھوں میں وہی
ساتھ تشویش کا بھی رنگ گہرا تھا۔ دیا پاؤں ایک انکشاف بہت شدت سے ہوا۔ کہ اس کی آنکھیں
سے زیادہ گہری اور خوبصورت ہیں۔ وہ بے اختیار ان حواسِ حسیں کی صفایت سے
صفت آنکھوں سے نظریں چھانگتی۔

موڈ بری طرح غارت ہوا۔

”اب کیا ہوا ہے تمہیں؟“

وہ غصے سے کہتا اٹھ کر بیٹھا۔ دیا کے چہرے کے زاویے بگڑنے لگے۔

”جب تمہارے پاس اپنی طلب پوری کرنے کو میرے ملاوہ بھی ذرائع ہیں تو ضروری نہیں کہ مجھے اس آزمائش سے دوچار کرو۔“

وہ پچھکار کر بولی۔ خلیفہ نے بے ساختہ ہونٹ جھنجھے۔ گویا وہ اس بات کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

”میں تمہیں بتا چکا ہوں دیا کہ میرا اس سے“

”میں بھی تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے تمہاری بات کا اعتبار نہیں۔ بہتر ہے دور رہو مجھ سے۔“

وہ سمجھنے کو اس کی مانند ترقی چٹکی۔

”تمہاری بے شرمی بہت اچھے انداز میں کھلی ہے مجھ پر۔ اپنے ساتھیوں کے سامنے کس وجہ سے اسے گلے لگائے کھڑے تھے۔“

اس کا جانا ہوتا لہجہ طنز یہ بھی تھا مسخرانہ بھی۔ خلیفہ مستقیم نے ٹھنڈا سانس کھینچا۔

”تو گویا مختصر مدہ جاسوسی کر رہی تھیں میری۔“

وہ جیسے ایک دم کسی نتیجے پر پہنچ کر مسکرایا۔

”اونہ۔ میرے جوتے کو بھی ضرورت نہیں۔“

دیا نے انھما سانا ک نھوت سے سکڑ کر بولی تھی۔ خلیفہ مستقیم نے ابرو اٹھا کر بغور اس کے تاثرات جانچے۔

”پھر اعتراض اور جھڑاس بات پر کر رہی ہو؟ گلے لگانے پر یادوستوں کے سامنے لگانے پر؟“

اب وہ جیسے خود بھی اسے مزید جاننے کا ارادہ باندھ چکا تھا۔ وہی ہوئی۔ مکان گواہ تھی اس بات کی۔ جسے دیا نے دیکھا تو آگ لگ لگ گئی تھی اسے۔

”مجھے کسی بات پر اعتراض نہیں۔ تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔“

اس نے یکا یک لافلتی اور بے نیازی اڑھ لی۔

”ہاں مگر صرف تمہارے معاملے میں۔“

مستقیم نے اس کی جانب پیش رفت کی اور پھر اسے بانہوں میں سمیٹا۔ وہ تو جیسے مایہ ہے کہ اس کی مانند چلی تڑپ تھی۔

”چھوڑو مجھے۔ خبردار جو ہاتھ لگایا۔ اس کے پاس جاؤ اب بھی۔“

”کہا تا میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ویسے یہی معاملہ کیا ہے؟“ چیلنس ہو رہی ہو؟“

مستقیم کو لطف آنے لگا تھا اسے سنا کر چمیز کر۔ وہ چپ چاپ اس سے اپنا آپ چھڑاتی رہی۔

”یہ چیلنسی تو محبت کی علامت ہو کر رہی ہے۔ جی بتاؤ مجھ سے محبت کرنے لگی ہو؟“

مستقیم نے اس کے ہر لمحہ غصے سے سرخ پڑتے چہرے کو شرارتی مگر گستاخانہ نظروں سے دیکھا۔

”رہو خوش منی میں جتنا۔“

وہ اس سے اپنا آپ چھڑا کر فاصلے پہ جانیٹھی۔ اور حقارت بھرے انداز میں کہا۔

”یہاں واپس آؤ بستر پر دیا!“

اب کی بار وہ بولا تو اس کا بے حد سنجیدہ لہجہ اسی قدر ٹھہرا ہوا تھا۔ مگر دیا نے کہاں پر واہ کی۔

”نہیں آؤں گی۔ کیا کر لو گے؟“

”زبردستی کروں گا۔ بیوی ہو تم میری۔ میری خواہشات اور ضروریات کا خیال رکھنا تمہاری

اولین ذمہ داری ہے جسے بھول رہی ہو تم۔“

وہ بیٹے اسے جتا رہا تھا۔ لہجہ میں اب کے ناراضی بھی تھی۔ اور خلیفہ ہی تھی بھی۔ دیا پھر نے

گئی۔

”جانتی ہوں اور میں نے رکھا تھا تمہاری ضرورتوں کا خیال۔ تم گواہ ہو کہ میں نے کبھی ہاتھ نہیں

جھٹکا تھا تمہارا اپنی تمام تر نفرت و ناپسندیدگی کے باوجود۔ مگر اور نہیں خلیفہ مستقیم! اگر تمہاری تسکین اور

کے بھی سامان موجود ہیں تو میں کیوں یہ مشقت سہوں۔“

وہ بھرائی آواز میں چیخنے لگی تھی۔ خلیفہ مستقیم اسی قدر بد مزہ ہوا۔

”کہوت میں کہہ چکا ہوں میرا اس سے ہرگز بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔“

وہ بری طرح جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگا۔

”یقیناً کس کو ہے تمہاری بات کا۔“

وہ جواباً کبر سے مسخر سے بولی۔ خلیفہ مستقیم کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے اس

غصے میں بڑھ کر اسے پکڑنا چاہا تھا کہ وہ تیزی سے اچھل کر پھر فاصلے پر بولی۔

”ہرگز بھی زبردستی نہیں ہوگی مستقیم اور نہ تم جھگڑو گے۔“

اس نے دھمکانے کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا تو خلیفہ مستقیم کا چہرہ تو جین اور سبکی سے سرخ

پڑنے لگا۔

”چیلنج نہیں کرو دیا! خواجوا معاملہ مت بکا رو۔ شاباش بات مانو میری۔“

وہ پکار کر اسے سمجھانے لگا۔ دیا نے اسی تفرامیز انداز میں زور سے سر جھٹک دیا۔

”چیلنج تو میں نے کر دیا ہے۔ مجھے ایسے شخص کے لمس سے بھی نفرت ہے جس کی اسی مٹتی حرکت کو میں مجھ کا جنون سمجھ کر سمجھوتہ کر رہی تھی۔ دل میں گنجائش پیدا کر کے تمہیں قریب آنے سے نہیں روکا۔“

وہ بے حد تیز لہجے میں بول رہی تھی۔ خلیفہ مستقیم احساس شکست سے پاگل ہونے لگا۔

”تمہیں پتہ ہے نا، کہ میں ہارتا نہیں ہوں۔ بے کار الجھ رہی ہو مجھ سے۔“

اب کے اس نے بھی اپنی صفائی دینے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور مقصد کی بات کی۔

”اب تم بارو کے مستقیم! دیکھ لینا۔“

دیا کے لہجے میں جوا یا تاؤ دلائی کیفیت تھی۔ تمسخر تھا۔

”او کے فائن! ابھی پھر چل جاتا ہے۔“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کی جانب آیا۔ انداز بے حد جاہانہ تھا۔ دیا بے اختیار پیچھے سرکی۔

”خبردار خلیفہ! اک قدم بھی میری جانب مزید نہ بڑھانا۔ میں بتا رہی ہوں میں ہرگز لحاظ نہیں

کروں گی۔ سنا تم نے؟ اب کوئی مجبوری نہیں ہے میرے ساتھ یہ بات تم بھی جانتے ہو۔“

وہ بدستور پیچھے ہٹتی اسے باور کرانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

”سن لیا۔ جو کرنا ہے کر لو۔“

”خلیفہ مستقیم نے اس کی کھائی پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھینچا۔ دیا اس صورتحال کے لیے خود کو تیار

کیے ہوئے تھی۔ جیسی پلک جھپکتے میں فروٹ کی نوکری سے جھپٹ کر چھری اٹھالی۔ اس کی یہ حرکت

خلیفہ کی نظر میں نہیں آسکی تھی۔ جیسی وہ اسے گرفت میں لے چکا تھا۔ دیا نے چھری والا ہاتھ بلند کیا۔

خود کو نشانہ بنانا چاہتی تھی مگر اس کوشش میں ناکام اس طرح ہوئی کہ خلیفہ نے بالکل اچانک اس کا

پھیر لیا تھا۔ چھری اس جھونک میں پوری قوت سے مستقیم کے ہاتھ کو کاٹتی چلی گئی تھی۔ خلیفہ تو حق

ہوا ہی تھا خود دیا بھی چکر اسی گئی۔ بلکہ بوکھلاہٹ دیکھنے والی تھی۔ خلیفہ کی گرفت ڈھیلی پڑی تھی۔

ششدر سا کبھی دیا کبھی اپنے زخمی ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ دیا کا سارا غصہ سارا مظننہ بھی ہوا ہو چکا تھا۔

سکتے زدہ ہی اس کے کئے ہوئے ہاتھ سے سرعت سے بے خون کو پھرائی آنکھوں سے دیکھتی تھی۔

”رک کیوں گئیں؟ آج ساری حسرتیں نکال لو اگلی پچھلی۔ ہاتھ نہیں پکڑو گا تمہارا، ویسے

جبکہ یہ وار کیا ہے۔ شہرگ کانٹیں یا پھر پیٹ میں مار دیتیں۔ لہجوں میں کام تمام ہوتا اور تمہاری جان

پہنچی۔“

وہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے بہت رसान بہت چٹل سے بات کر رہا تھا۔ نہ غصے میں تھا نہ ناراض۔ اس

سے برعکس سرد مہری تھی لہجے میں۔ دیا کا فٹ چہرہ صغیر ہونے لگا۔ وہ ابھی تک خوفزدہ آنکھوں سے اس کا

پہتا خون دیکھ رہی تھی۔ معادہ سنبھلی اور بستر پہ پڑا اپنا گلہابی دوپٹہ لپک کر اٹھایا۔ اس کے ہاتھ پہ لپٹنے

لگی۔

”مم۔ میں نے تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہا تھا۔ مم۔ میں تو۔۔۔ بلیوی میں تو۔۔۔“

”میں جانتا ہوں۔“

وہ اس کی بات کاٹ کر بہت جذب سے گویا ہوا۔ دیا نے خشک ہر نثر پہ زبان بھیری۔ ”بہت

مہراکت ہے۔ خون ضائع ہو رہا ہے خلیفہ۔“

اس کے انداز میں گھبراہٹ و تشویش تھی۔ مستقیم کچھ کہے بغیر اسے دیکھ گیا۔ جو کچھ دیر قبل مگر

عقرب روپ میں تھی۔ اللہ جانے کون سا اصل تھا۔ مگر یہ بہت پیارا لانا تھا اسے۔

”اب کیا کرو گے؟ اسپتال جانے میں تو۔۔۔“

”کیا آنکھوں میں تمہاری اس فکر مندی اور تشویش سے دبا محبت کرنے لگی ہو مجھ سے؟“

اس کی پریشانی تشویش گھبراہٹ سے بالکل برعکس بات کر رہا تھا وہ۔ دیا گم صم سی ہو کر آنسو بھری

آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”چلو خیر ہے۔ اس آزمائش میں نہیں ڈالتا تمہیں۔ امانت ہے نا۔ میں اس سے مرہم پنی کرالیتا

ہوں۔ تم پریشان نہیں ہو۔“

”اس سے سرچھک کر غری سے کہتا پلٹ کر باہر نکل گیا۔ دیا چادر تھپت کر اوڑھتی اس کے پیچھے

لپکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

”بہت مہراکت تھا یا راتنی بے احتیاطی؟ ہوا کیا تھا؟“

امانت اپنا میڈیکل باکس کھولے اس کے ہاتھ کو نالگے لگا رہا تھا۔ جو انگوٹھے کے درمیان سے

آدھی تھیلی تک کٹ چکا تھا۔ امانت نے اس کی خاموشی کے جواب میں جب بے خیالی میں قیسری

مرحہ سوال کیا تو خلیفہ مستقیم کی معنی خیز نظریں بھر پور شرارت لیے دیا کی جانب اٹھ گئیں۔

”یاد یہ رازداری کی بات ہے۔ تمہاری بھابی خفا ہوگی اگر تفصیل بتا دی تو۔“

دیا اس جواب پر بے اختیار ہونٹ بھیج گئی۔ اس کا چہرہ گلہابی سے یکنفرت سرخ پڑ گیا تھا۔ کچھ

کہے بغیر وہ ایک بھٹکے سے انہی تھی کہ امانت کو مسکراہٹ پہنچاتے اس نے دیکھ کر صاف سبکی محسوس کی تھی۔

”نمبر و جان من! اکٹھے چلتے ہیں۔ مت سمجھو یہ معرکہ ختم ہو گیا۔ وہیں سے آغاز ہو گا اور یقیناً فتح آپ کے شوہر نامہ دار کی ہوگی۔ ان شاء اللہ۔“

اس کا لہجہ شوخ تھا۔ مجال ہے جو اتنے گہرے زخم کی تکلیف کا احساس ہو اس کے چہرے پر اس کے کسی انداز میں۔ دیا کا بس نہیں چلا۔ اس کا منہ بند کر دے کسی طرح۔ وہ سخت غصے میں چہرے پختی کمرے میں واپس آئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ بھی چلا آیا۔ دیکھنے اور ناراضی کے اظہار کو منہ پھیر لیا۔

”آ جاؤ بیوی! تم سے مجھے ابھی دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔“

وہ دھپ سے اس کے مقابل آکر بیٹھا۔ پھر اسے آنچ دیتی متبسم نظروں سے دیکھا تھا۔

”یار قسم سے کتنے رنگ ہیں تمہارے۔ مگر سچی بات ہے ہر رنگ پہلے سے جدا مگر بے حد حسین۔ سچی باتوں تم مجھے اب بھی بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اس وقت تو اور بھی زیادہ لگ رہی تھیں جب میرے لیے فکر مند تھیں۔“

”مجھے بے حد چپ لگتے ہیں وہ مرد جو اپنے پرستار اپنے فریڈز سے شیر کرتے ہیں۔“ وہ تلخی سے گویا ہوئی۔ ناراضی کی وجہ جان کر خلیفہ مستقیم نے کاندھے جھٹک دیئے تھے۔ آنکھیں شرارت بھرے انداز میں پٹکنے لگیں۔

”تو تمہیں بس یہ بات اچھی نہیں لگی؟ باقی سب تو ٹھیک ہے نا؟“

وہ اس کی آنکھوں میں اپنی متبسم آنکھیں گاڑے گویا تصدیق کر رہا تھا۔

”غلام خیال ہے۔ میں ابھی بھی اپنی پہلی بات پر قائم ہوں۔“

اس نے فروٹھے پن سے جواب دیا تو خلیفہ مستقیم نے ٹھنڈا سانس بھر لیا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا نرمی سے۔ ہلایا اور ہونٹوں کے قریب لے جا کر کسی قدر محبت سے چوما تھا۔

”دیا! کسی بھی عام عورت کو فریب دینا اسے اپنی جانب متوجہ کرنا کسی مرد کے لیے وہ بھی خواہ

مرد کے لیے ہرگز مشکل کام نہیں۔ مگر وہ عورت جس سے وہ مشق کرتا ہے۔ اس میں اسے سچے موقبل

کی سی جھلکاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ پھر تو جس عورت سے مرد مشق کرتا ہے وہ ہی اس کے لیے دنیا کی

سب سے حسین عورت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے سامنے دنیا کی ہر خوبصورتی ماند پڑنے لگی ہے۔

اس کے لیے اسی ایک عورت میں پوری دنیا سمٹ کر آ جاتی ہے اور یہ عورت شاملہ جسے تم نے آنا

میرے ساتھ دیکھا۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے تم سے بہت پہلے میری زندگی میں شامل ہو چکی ہے۔

مگر میں نے تب بھی اسے کبھی اہمیت نہیں دی۔ پھر اب بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ خود مجھے پسند کرتی ہے۔ مجھے اپنی جانب مائل کرنے کو اس قسم کی حرکتیں کرنا اس کا معمول ہے۔ اس کے باوجود کہ اسے کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس بات کی گواہی تمہیں یہاں کا ہر فرد بھی دے گا اور خود شاملہ بھی اگر تم چاہو تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں۔“

وہ کتنے رساں کتنی نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ گویا اسے اپنے حق میں رام کر رہا تھا۔ دیا نے ہونٹ بھیجے لیے۔ دل نہ بھی مانتا تھا تب بھی اس نے مزید بحث نہیں کی۔

”جناب آپ کو یقین آیا میری بات کا؟ تم میرے لیے وہ عورت ہو جو مجھ پر قرار پاتی ہے۔ جس میں ستاروں کی روشنیاں پھونکتی ہیں۔ میں تمہاری آمد سے قبل تک تمہارے انتظار میں خود کو سنبھال کر رکھتا رہا ہوں۔ تم خود سوچو دیا! اگر تم پارساتھیں تو میں کیسے پلید ہو سکتا تھا۔ اللہ کا وعدہ ہے۔ پاک عورتوں کے لیے پاک مرد۔ یار تمہیں مجھ پر اتنا شک کیوں ہے؟ مجھے تو تمہاری معصومیت پا کبازی پہ ذرا براہ بھی شب نہیں کہ انتخاب ہی اس میں پر ہوا تھا تمہارا۔“

وہ مسکرا کر اسے معتبر کر رہا تھا۔ دیا کی لانی پلکیں جھٹک گئیں۔ وہ حیران تھی۔ گم صم بھی۔ وہ کتنی خوبصورت باتیں کرتا تھا۔ اتنا غلط انسان ہو کر بھی۔ اس کا یقین کس درجہ پختگی رکھتا تھا۔ اسے عجیب سی شرمندگی نے آن لیا۔

”چلو آ جاؤ۔ سوتے میں رات بہت ہو گئی ہے۔“

”وہ اندھ کڑا ہوا تھا۔ پانی کے ساتھ در در رفع کرنے والی دو الیتا ہوا اسے مخاطب کر کے بولا۔ دیا اب بھی کچھ نہیں بولی۔ آ کر بستر پر اپنی جگہ لیٹ گئی۔

”یہاں آ جاؤ۔ میرے کاندھے پر سر رکھو۔ ورنہ مجھے لگے گا تم ابھی تک مجھ سے خفا ہو۔“

دیا نے پھر اسی خاموشی سے اس کی بات مان لی۔ مستقیم اس کی آنکھوں میں جھانک کر نرمی سے مسکرایا۔ دیا اس کی قاتل مسکان سے خائف ہوئی بے اختیار نظریں چراگنی تھی۔

☆.....☆.....☆

لا یعنی سوچیں اس کا دماغ خراب کرنے لگی تھیں۔ انہی سوچوں سے پیچھا چھڑانے کو اس نے خود کو مصروف کرنا من سب سمجھا۔ کمرے کی صفائی کا ہی اس نے پہلے ارادہ باندھا۔ بستر کی چادر جھاڑ کر بچھائی جو پہلی محسوس ہوئی تو اسے اتار دیا۔ الماری سے دوسری دھلی ہوئی سفید چادر نکال کر بچھا دی۔ فرنیچر پر موجود گرد کو صاف کیا۔ پھر جھاڑو اٹھا کر فرش صاف کیا۔ اسی کام سے فارغ ہوئی تو کمرے سے نکل آئی۔ اسے بہر حال مصروفیت چاہیے تھی۔ جو عجیب و غریب سوچوں سے چھٹکارا بخش دے۔

”آج تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔“

وہ اس کے قریب آگیا اور اسے پیچھے سے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

”کمرے میں جاؤ۔ کام کرنے دو مجھے۔“

اس کی آنکھوں میں شوخ رنگ لہراتے پا کر دینے ناگواری دہائے بغیر برہمی سے کہا۔

”ویسے کام کرتے تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ رینلی۔ سنا ہے جو بیوی شوہر کے دل پہ حکومت کرتا

چاہتی ہے وہ بی بی اس کا گھر بھی اچھا سنبھالتی ہے۔ یہ بدلا ہوا انداز۔ یہ کپڑا مائزنگ اسٹائل کہیں مجھ سے محبت تو نہیں ہو رہی۔“

اس کا شریر انداز لگاوت آمیز تھا۔ دیا کا موڈ اس ہر وقت کی راگنی سے خراب ہوا تھا۔

”قیمت تک آس لگائے پیٹھے رہنا۔ حسرت لیے ہی مرو گے۔“

وہ ہنسنے لگی۔ خلیفہ مستقیم کو یہ بھی لفظی چیمیز چھانڈتا لطف دیتی تھی وہ اس قدر سلتی مگر اس وقت اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ دیا کا یہ ٹیکھا اور ترش انداز اسے ہر بار یہی باور کراتا تھا کہ اس کی ہر کوشش شدید ناکامی سے دو چار ہو چکی ہے۔ اس کی محبت بے اثر رہی ہے۔ وہ ہونٹ جھپٹے خاموش کھڑا خود پر ضبط کرتا رہا۔ خود کو کمپوز کرتا رہا۔ اس سے قبل کہ کوئی مزید بات کرتا بشیر نے آکر مداخلت کر دی تھی۔

”صاحب! آپ کو امانت صاحب بار ہے ہیں بڑے کمرے میں۔“

خلیفہ مستقیم نے گہرا سانس بھر کے دیا کو دیکھا اور ماحول کا تناؤ کم کرنے کو دانستہ مسکرانے لگا۔

”انور! غلام سماج کو کیسے خبر ہو گئی۔ میں اس وقت یار دلدار کے پاس ہوں۔ چلو یار آتا ہوں میں۔“

وہ دیا پہ حسرت زدہ نگاہ ڈالتا ہوا سرد آہ بھر کے لمحہ بھر کو اس کے پاس تھا۔

حاصل عشق کیا بتاؤں میں

قرب بویا تھا جبر کائنات میں

دینے اس کے لہجے کی تشنگی اور اضطراب کو صاف محسوس کیا تھا مگر کوئی تاثر چہرے پر نہیں آنے دیا وہ ہونٹ جھپٹتا ہوا پلٹ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ تب دینے سکھ کا بھرا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایم آلود ہوتے موسم نے سردی کی شدت میں ایک دم کچھ مزید اضافہ کر دیا تھا۔ کئی دنوں بعد آج جو پٹنلی تھی۔ وہ بھی کمزور اور مدھم سی۔ اس نے سویٹر پہنا۔ گرم شال لپیٹی۔ موزے جڑھائے اور

ایک طرف آہٹ محسوس کی تو راہ داری عبوری کر کے اسی جانب آگئی۔

اندر جھانکا تو اندازہ ہوا کچن ہے۔ کوئی رخ پھیرے کھڑا جلتے اسٹوپ کچھ پکانے میں مصروف

تھا۔ دیا متوجہ کرنے کو دانستہ کھنکھاری تو وہ جو کوئی بھی تھا بے ساختہ پلٹا۔ اسے دیکھا تو گھبرا کر بوکھلا کر

سلام کیا تھا۔ وہ اٹھا۔ تیس سال کا ایک درمیانے قد کا ٹھڈ کا لڑکا تھا۔

”کیا کر رہے ہو یہاں؟“

اس کے لہجے میں غیر محسوس انداز میں ماکانہ حقوق در آیا۔ جسے خود اس نے بھی غالباً محسوس ہی

کیا تھا۔

”میں بشیر ہوں جی! یہاں کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور صفائی وغیرہ کی ڈیوٹی ہے میری۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ اب تم نکلو کچن سے۔“

اس نے نرمی مگر قطعیت بھرے انداز میں کہا تو بشیر کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیل گئیں۔

”جی۔۔۔۔۔“

اس کے انداز میں غیر فنی واضح تھی۔

”انور۔۔۔۔۔ بھی آج سے کھانا میں پکاؤں گی۔ فکر نہ کرو۔ تمہاری نوکری نہیں چھوٹے گی۔ چھو

کے پاس حرام کا پیسہ بہت۔۔۔۔۔ تمہیں تنخواہ دیتے رہیں گے۔“

وہ طنز یہ کہتی اسے کچن بدر کر کے خود اس کی جگہ پہ کھڑی ہو گئی۔ جو لمبے پہ موجود کو کمر میں جھانکا

گوشت کا سالن بننے کے مرحلے میں تھا۔ وہ مصالحہ بھونسنے لگی۔ ساتھ میں کچن میں دیگر سالانہ

اشیاء کا بھی جائزہ لینے میں مصروف رہی۔ ضروریات زندگی کی خوراک کا اتنا وسیع ذخیرہ موجود پا کر

کے ہونٹوں پر تلخ مسکان بکھر گئی تھی۔ اس کے لیے سلا دہنریاں الگ کی تھیں۔ ساتھ میں سالن

کرتے وہ سلاؤں کاٹنے لگی۔ جب ہی وہ کھنکھارتا ہوا اندر چلا آیا تھا۔ دینے گردن موڑ کر محض ایک

اس پر ڈالی پھر اسی لا تعلق انداز میں اپنا کام کرنے لگی۔

”میں واپس آیا تو تم کمرے میں نہیں تھیں۔ فطری گھبراہٹ میں جھٹا ہوتے ہر جگہ دیکھا

تب بشیر نے بتایا تم یہاں ہو۔ تمہیں کیا ضرورت ہے اس مشقت میں پڑنے کی۔“

وہ اس کے نرم سفید مومی ہاتھ بہت محبت سے تھامتا ہوا بے حد جذب سے کہہ رہا تھا۔ دیا

سپاٹ تھا سپاٹ رہا۔

”کھانا کب تک کھاتے ہو تم لوگ؟“

اس سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ نخوت سے پوچھ رہی تھی۔

باہر نکل آئی۔ اسے پتہ تھا ان سب کے ساتھ آج مستقیم بھی دیر تک سوئے گا کہ کل کی رات خلیفہ مستقیم سمیت سب ویسے بھی غائب رہے تھے اور ابھی کچھ دیر قبل لوٹے تھے۔ وہ جان سکتی تھی یہ جانا کس مقصد کا جانا تھا۔ دل میں دہشت و دھمکوری لپٹنے لگا تھا۔ ایک اور گھر بد باد ہونے جا رہا تھا اور وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر رہی تھی۔ بہت چاباؤ ہن بٹ جائے مگر وہ سو نہیں پاتی تھی۔ اور ساری رات آنکھوں میں کات دی۔ رات کا جس پل آخری پہر بھی اختتام پذیر تھا جب ان کی آنکھیں سنائی دی تھیں۔ خلیفہ مستقیم اندر کمرے میں آیا تو اسے کھڑکی کی جانب رخ پھیرے دیکھ کر چونکا۔

”آج جلدی اٹھ گئیں تم؟“

وہ اسے متوجہ کرنے کو کھٹکارا۔ دیا نے خلیفہ سا چومک کر لہ بھر کو گردن موڑ کر اسے دیکھا ضرور مگر کوئی تاثر دیے بغیر پھر سے سیدھی ہو گئی۔ خلیفہ مستقیم نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیے۔ وہ ساکن کھڑی رہی۔

”میں رات بھر نہیں سوئی ہوں۔“

اس کے لہجے میں طنز نہیں بے بسی تھی۔ لاچاری اور کرب تھا۔ مستقیم بہت زور سے چونکا۔

”کیوں؟“

اس کا انداز استغہامی ہی نہیں الجھن آمیز بھی تھا۔ مگر وہ کسی احساس کے تحت یکدم پر جوش آ گیا۔

”ارے..... کہیں تم میری کمی تو محسوس نہیں کر رہی تھیں۔ یا یہ تو بہت ہی اچھی تبدیلی ہے۔ تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہونے لگی ہے۔“

رات بھر جاگی نیند کے کنارے سرخ ہوتی آنکھوں میں امید کی روشنی کا اجلا پن کتنی سرعت سے پھیل گیا تھا۔ چہرہ جوش و مسرت سے تھماتا ہوا تھا۔ مگر دیا کا موڈ ہنوز آف تھا۔ بلکہ کچھ مزید بگڑ گیا۔

”کہاں گئے تھے تم؟“

وہ دانت چس کر اذیت کے پل صراط طے کرنے لگی۔

”یار! جانتی تو ہو تم۔ روزی روٹی کے ویلے.....“

”بکو اس مت کرو۔ بہت بڑے جھوٹے ہو تم! لوٹے ہو لوگوں کو اور سمجھتے ہو تم نے کمانی کیا؟“

”یہ؟“

وہ پھٹ پڑی تھی۔ خلیفہ مستقیم نے ختم کر سنجیدگی کی نگاہ سے اس کا یہ لال بھوکا چہرہ دیکھا۔ مگر اسانس کھینچا اور بستر کی جانب بڑھتے ہوئے کسی قدر رمان سے گویا ہوا تھا۔

”تمہیں شکر ادا کرنا چاہیے۔ الٹا بھگڑ رہی ہو۔ ریلی بیوی آج پولیس کے ہتھے چڑھتے چڑھتے رہ گئے ہیں۔ بڑی مشکل سے جان بچی۔ ورنہ آج لازمی بیوہ ہو جائیں تم۔“

تکلیف سے لپٹتے ہوئے وہ اپنے تئیں اسے بہت ہولناک خبر سنارہا تھا۔ دیا کے چہرے پر زہر پھیل کر رہ گیا۔

”کاش ایسا ہو جاتا۔ کسی طرح سہی۔ جان تو چھوٹ جاتی تم سے۔“

اس کا دماغ غم و غصے کی زیادتی سے اٹل رہا تھا۔ جیسی ہرگز الفاظ کی عینگی پہ دھیان نہ دیا۔ مگر مستقیم کا رنگ ضرور پہلے بے تحاشا پیلا ہوا پھر اسی لحاظ سے سرخ پڑ گیا۔ ایسے گلنے لگا اس کی آنکھوں سے ابھی خون فٹک پڑے گا۔

”اتنی نفرت کرتی ہو مجھ سے دیا!“

وہ خاصی تاخیر سے بولا۔ تب بھی اس کا لہجہ مدھم اور ستا ہوا تھا۔ بلکہ کسی حد تک بے حد عجیب۔ دیا نے جواباً لفظ کیے بغیر پھر آگ اگلتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا اور ہونٹ سکڑ لیے۔

”آخر کیسے یقین کرو گے اس ایک بات کا تم؟“

اس کا لہجہ ہنوز طنز کی آگ میں جھلسا ہوا تھا۔ خلیفہ مستقیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جھنڑ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے ایک نیبتا چھوٹا مگر جدید طرز کار یا الور نکال کر اس کے آگے بستر پر پھینک دیا۔

یہ لوزڈ ہے شاید اس وقت اس میں چار پانچ گولیاں ہیں۔ تمہیں پوری اجازت ہے۔ تم مجھے مار کر اپنی اس حسرت کو پورا کر لو۔“

وہ خط ناک حد تک سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ دیا نے اسے تنفر سے دیکھتے ہوئے نخوت بھرے انداز میں رہنمائی کی۔

”مسٹر خلیفہ مستقیم! مجھے ایسا کرنا ہوتا، تو خود کو تمہارے ہاتھوں پا مال ہونے دیتی؟“

یہ سب ترین لہجہ مستقیم کو بیدردی سے کاٹ کر رکھ گیا۔ اس نے بہت شدت سے ہونٹ سمجھنے لیے۔ ایک بار پھر اسے بہت زیادہ ضبط کرنا پڑا تھا خود پہ قابو رکھنے میں اکھڑے چٹکے ترش تاثرات لیے کھڑی یہ لڑکی اپنی تمام تر بد تمیزی، گستاخی اور بے لگائی کے باوجود اسے بہت عزیز، بہت پیاری تھی۔

”میں نے نکاح کیا ہے تم سے دیا!“

اس نے صرف دفاع نہیں کیا۔ احتجاج بھی بلند کیا۔ عجیب سی بے بسی چھٹک رہی تھی اس پل اس کے چہرے سے۔

”ہاں بالکل! لیکن واضح رہے گن پوائنٹ پر۔“

”ہاں بالکل! لیکن واضح رہے گن پوائنٹ پر۔“

”ہاں بالکل! لیکن واضح رہے گن پوائنٹ پر۔“

”ہاں بالکل! لیکن واضح رہے گن پوائنٹ پر۔“

”ہاں بالکل! لیکن واضح رہے گن پوائنٹ پر۔“

وہ زور سے پھٹکاری۔ اور خلیفہ مستقیم لا جواب ہو کر رہ گیا تھا۔ دیا اسی خفیہ موڈ میں کمرے نکل گئی۔ کچن میں آکر ناشتہ تیار کیا اور پھر کمرے میں واپس آگئی۔ وہ کمرے کے بل لینا شاید اس کا مقصد تھا۔ دیا نے اس پر نگاہ غلط انداز ڈالے بنا اپنے جوتے پہنے اور دروازے سے نکل آئی۔ اس کا بیرونی دروازے کی جانب تھا۔ یہاں فطری حسن جا بجا نکھرا ہوا تھا۔ سرو قامت سرسبز و شاداب درخت، ہری بھری گھاس، ڈھیروں کے حساب سے جنگلی پھول، تاحہ نگاہ پھیلی ہریالی، پر محفل سریلی آوازیں، پھولوں کی دلغریب بھینی بھینی خوشبو، سب سے بڑھ کر تنہائی اور خاموشی۔

وہ ایک درخت کے چوڑے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ دل بے حد اداس تھا۔ آنکھوں کے گوشے نم ہوتے جا رہے تھے۔ زندگی کا ایسا رخ سامنے تھا جس کا ہر پہلو تکلیف دہ تھا۔ وہ خود غم و غم کی چادر اوڑھنے کی کوشش میں بلکان ہوتی جاتی تھی مگر حقیقت کی کرینا کی ہر طرح سے اپنا احساس تھی۔ اس کا دل چاہا کسی مہربان کاغذ پر سر رکھ کر بہت سارا روئے۔ سکون اور نیند سب کچھ حرام ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار یہ بے بسی ایسے اہلکارانہ احساس میں ڈھلتی کہ اس کا جی چاہتا جی مستحکم قتل کر دے۔ کیسا نفس پرست انسان تھا۔

خود غرض، سفاکی اور بے حسی کی انتہا تھی اس ظالم شخص کی کہ محض اپنے مردانگی کے غرور کی کسی کی خاطر پسندیدہ ہستی کو جیسے بن سکا حاصل کر لیا۔ ملکیت کا ٹھکانہ اپنے منہ پر بھرے میں فیہ والا۔ فتح کے اظہار کے لیے غرور کی حد، برتری کی انتہا کہ ایک جیتے جاگتے وجود کو استحقاق کی نظر میں جکڑ کر بے بس کر دیا جائے۔ یہ ملکیت کا ظالمانہ طریق کار ہی اسے وحشت زدہ رکھتا تھا۔ غرور، کسانا رہتا۔

"رونے کے لیے یہ جگہ کچھ ایسی بھی محفوظ اور متاثر کن نہیں کہ تم جب جی چاہے منہ لگا لیا یہاں چلی آؤ۔ بتا بھی چکا ہوں پہلے کہ یہ جنگل خطرناک اور خونخوار قسم کے جانوروں سے بھرا ہوا ہے دیا! تمہیں آخر مجھ سے میری ہر بات سے اختلاف کر کے کیا تسکین ملتی ہے بتاؤ؟"

سوکھے چوں پر پہلے اس کے قدموں کی بھاری آہٹ ابھری تھی۔ پھر خفا خفا آواز بھی گونجی۔ اٹھی۔ دیا نے آنسو بھری مگر جھنجھلائی نظروں سے اسے بے دریغ گھورا۔ کمرے میں مجلسی بدرنگ گدا جس میں سے خشک زمین کے توڑے ہوئے ٹکڑے جھانک رہے تھے۔ وہ مضبوط قدم جمائے اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑا تھا۔

"تم آخر میری جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے ہو؟"

وہ بد مزگی سے چبھتی۔

"اللہ سے دعا کرو۔ وہ سچ الدعا ہے۔ جی بھر کے بددعائیں دو۔ اس بار بج گئے ہیں۔ اگلی بار دھرم سلامت واپس نہ آئیں۔ ہمیشہ کے لیے جان بھی چھوٹ جائے گی اور تمہارے دامن پر کوئی داغ بھی نہیں پڑے گا۔"

مکالمی رنگ کے لباس میں ملبوس خود بھی گلابی گلابی نظر آتی یہ کچی کلیوں سی نازک لڑکی جو پہلی نگاہ میں ہی دل موہ چکی تھی اب اس کا دل قدم قدم پہ توڑنے لگی تھی۔ اس کے جنگ آمیز انداز پر جواباً وہ بھی خفیہ موڈ میں آکر بولا تو دیا نے اسے بہت طنز یہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"اگر میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو آج یوں قسمت کو نہ رو رہی ہوتی۔"

بات تلخ تھی تو لہجہ تلخ ترین۔ خلیفہ مستقیم نے ہونٹوں کو باہم بھینچ کر اپنا طیش دبایا۔ پھر قدرے توقف سے بولا تو لہجہ اس کے ضبط کا گواہ یعنی دھیما اور مدہم تھا۔ نرم تھا۔

"اندر چلو دیا! بہت تھکا ہوا ہوں میں۔ اس وقت یہاں تمہارا پہرا نہیں دے سکتا۔"

"تو مت دو۔ کہا کس نے ہے ایسا کرنے کو۔ جاؤ سوؤ جا کے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ جو کر سکتے ہو کر لو۔"

اس نے ہونٹ سکڑ کر برہمی سے جواب دیا تھا۔ لہجہ گستاخی اور ہٹ دھرمی سمیت بہت تیز بھی تھا۔ خلیفہ مستقیم اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ برامانے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا جیسی ہارے ہوئے انداز میں ٹھنڈا سانس کھینچتا۔

"کر تو بہت کچھ سکتا ہوں مگر کرنا نہیں چاہتا۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ

ناحق قبضہ نہ کیجیے خود پر

آپ اپنے نہیں ہمارے ہیں

"اس کی بھاری سنگتات بہت دیا نے بے اعتنائی سے چہرے کا رخ پھیر لیا۔ گویا وہ اس کی بات پر ہرگز کان نہ دہرنے پہ آمادہ نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے ظالم لڑکی! مینو جب تک تمہارا جی چاہے، مجبوری ہے، دل کا معاملہ جو ہوا مگر اک بات دھیان سے سن لو۔"

وہ رکا پھر گہری بے حد آنکھ دیتی ہوئی نظروں سے ہوا کے دوش پر اڑتی اس کے بالوں کی موٹی ٹوٹوں کو دیکھتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

کسی جائے نہ جھوٹے کی رقابت ہم سے

ہوا سے کہہ دو تیرے رخسار سے ہٹ کر گزرے

اس ذومعنی لہجے پہ دیا کسی طرح بھی اپنی بے نیازی اور کھنور پن کو قائم نہیں رکھ سکی۔ اس کا چہرہ گلابی سے سرخ ہوتا ہوتا ہٹانے لگا۔ وہ اسے دیکھ نہیں رہی تھی مگر نظروں کا ارتکا محسوس کر کے دیکھتی جا رہی تھی۔ خلیفہ مستقیم اس کے سینہ سامنے سفیدے کے چوڑے سنے سے فیک لگا کر ٹانگیں سیدھی کر کے تقریباً نیم دراز ہو گیا۔ جبکہ دیا اس کی اس حرکت پہ ایک ہل کو ششدر رہ گئی تھی۔ خود وہ گرم کپڑوں میں گرم شال کے ساتھ سویٹر بھی پہنے ہوئے تھی۔ پھر بھی سردی اتنی شدید تھی کہ گویا ہڈیوں میں موت گودے کو بھی ہمار ہی تھی۔ مگر اس کے برعکس خلیفہ مستقیم نے اس وقت جینز پہ صرف بنیان پختی ہوئی تھی۔ یعنی جیسے تھا ویسے ہی اس کی تلاش میں اٹھ کر چلا آیا تھا۔ اس نے ترجمہ لگا ہوں سے اس کے آہنی وجود کو دیکھا جو جتنا بھی مضبوط سی بہر حال گوشت پوست کا ہی بنا تھا۔ سردی تو اسے بھی لگ رہی ہوگی مگر.....

”کیا یہ واقعی مجھ سے ایسی بے بس کر دینے والی محبت کرتا ہے؟“

اس نے پہلی مرتبہ اس نکتہ پہ سوچا اور کچھ عجیب سے احساسات کا شکار ہونے لگی۔ اور محض اس سے اس سے وابستہ احساسات سے دھیان ہٹانے کو رخ پھیر لیا۔ جانے کتنی دیر بیت گئی۔ پتہ نہیں اپنا ضبط آزماری تھی یا اس کا

اب وہ چھینکنے لگا تھا۔ مگر استقامت ہنوز اپنی جگہ تھی۔ آسمان پر بادل مزید گہرے ہو رہے تھے سورج کی جو جھلک نظر آئی تھی وہ بھی مکمل طور پر بادلوں کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ ہواؤں کی شور و سردی بھی بڑھنے لگی معادیا نے خشک چوں پر سرسراہٹ سنی۔ مگر رخ پھیرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن اس وقت اس کے حلق سے بے ساختہ کرناک چیخ نکل گئی تھی۔ جب کسی درخت کی شاخ جھولتے بن مانس نے ایک دم سے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ کچھ اور بھی زور سے چیختی متوجش ہوئی اتنی تیزی سے چیخے ہوئی کہ توازن کھو کر سر کے بل نیچے گری گئی۔

خلیفہ مستقیم جو اونگھنے لگا تھا اس کی چیخ کی آواز پر ہڑا کر سیدھا ہوا۔ اور صورتحال سمجھتے ہی ہٹ رہا تھا۔ انھوں نے انھوں کے چہرے پر کچھ ایسا دیکھا۔ ساتھ ہی جیب سے ہاتھ نکال لیا تھا۔ مگر فائر کرنے کی نوبت نہیں آ سکی۔ بن مانس قلا نہیں بھرتا آن کی آن میں گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔

”آ۔ یو او کے؟ چوٹ تو نہیں لگی کہیں تمہیں دیا؟“

وہ واپس پلٹتا ہوا اس کے نزدیک آ کر کتنی فکر مندی کس درجہ تشویش سے سوال کر رہا تھا۔ وہ ہلکا ہلکا ہوا تھا۔ مستقیم نے نرمی سے اسے سہارا دے کر اٹھنے میں مدد دی۔

”آئی ایم سوری یار! پتا نہیں کیسے آنکھ لگ گئی میری۔“

کوئی تصور نہ ہونے کے باوجود وہ کتنا شرمندہ تھا اور معذرت کر رہا تھا۔ دیا نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور اٹھنے کے بعد کپڑے جھاڑتے ہوئے خوفزدہ لگا ہوں سے جنگل کی سمت دیکھنے لگی۔ جبکہ مستقیم اسے دیکھ رہا تھا۔

”آؤ اندر چلو پلیز!“

وہ اسے اب بھی کچھ جتنا بے بغیر نرمی سے اسے قائل کر رہا تھا کہ اس پر دہشت کے غلبے کو محسوس کر چکا تھا۔ اپنا ہاتھ ڈھارس بندھانے کو اس نے دیا کے شانے پر رکھا تو جانے کس جذبے کے تحت وہ سر کر اس کے بالکل نزدیک آ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے از خود ان فاصلوں کو گھٹایا تھا۔ مستقیم خوشگوار حیرت میں گھر کر اسے بٹکنے لگا مگر وہ متوجہ نہیں تھی اور ہنوز سہمی ہوئی تھی۔ خلیفہ مستقیم یونہی اسے اپنے بازو کے تلے میں سینے اندر لے آیا مگر وہ بند روم کے دروازے پر آ کے رک گئی تھی۔

”تم جاؤ اندر..... مجھے کچن میں کچھ کام ہے۔“

مستقیم کی سوائے نظروں سے نظریں پھیر وہ آہستگی سے کہتی آگے بڑھ گئی۔ تازہ چائے بناتے اس نے آلیٹ اور پرائے بھی تیار کیے تھے۔ چائے کا گ اور اب اٹھے۔ ٹرے میں ناشتے کے لوازمات بیٹ کر کے اس نے ٹرے اٹھائی۔ جس وقت وہ دوبارہ کمرے میں آئی مستقیم کھیل میں دہکا تقریباً فٹوگرافی میں جا چکا تھا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ کر اس کا کھیل کھینچا۔

”اٹھو۔“

”کیا ہے یار زیدی؟“

مستقیم نے سرخ دھکتی ہوئی آنکھیں کھول کر ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔

”ناشتہ کرو پہلے۔ پھر سو جانا۔“

وہ اس کی نثار آؤد آنکھوں کی جاہ کن سرانگیزی سے نظریں چرا کر ہوئی۔ مستقیم نے کسلندی سے سر کوٹائی میں چھنٹ دی۔

”نہیں! جی نہیں مجھے بس سونے دو۔ بہت تھکن ہے۔“

وہ پھر کھیل میں گھسا۔ آواز فینڈ کے غلبے کے باعث کچھ اور بھاری اور گھمبیر ہو کہ جیسے ماحول پر دیا نے بھی کوئی فکروں جاری کرنے لگی۔ دیا نے اس کا پھر کھیل گھسینا اور اسے جھنجھوڑنا چاہتی تھی مگر کھلائی ہاتھ رکھتے ہی حرارت محسوس کر کے بے ساختہ چوک کر اسے بغور دیکھنے لگی۔

”پہلے ناشتہ کرو اور تمہیں بخار کب سے ہے۔“

اسے فکس سے مس نہ ہوتے پا کر اب کی مرتبہ دیا نے غصے میں سارا کھیل گھسیٹ لیا۔ مستقیم کو سرد

آہیں بھرتے ہوئے کسی مگر اٹھنا پڑا تھا۔

”پہلے زخم لگاتی ہو۔ پھر مرہم رکھتی ہو۔ میری بیوی بہت انوکھی ہے یار! مگر مجبوری یہ ہے کہ پیاری بہت لگتی ہے ظالم!“

اس کے ہاتھ سے مگ لیتے ہوئے وہ اسے زچ دیتی نظروں سے نکتا بظاہر ہنس کر کہہ رہا تھا۔ جانے کیوں جڑ بڑی ہو گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی اسے آخر اس سے ہمدردی کیوں محسوس ہوئی۔ دیر اس سوال کو لے کر الجھتی رہی۔ جبکہ مستقیم اسے گہری نظروں سے دیکھتا ناشتہ کرتا رہا تھا۔

”آ جاؤ زوہد! کر لو ناشتہ تم بھی یار! حسرت لے کر نہ مری جاؤں کہ میری بیوی کبھی مجھے اس کا ہی سمجھ لیتی۔“

وہ اسے دعوت بھی دے رہا تھا تو اپنے مخصوص شوخ و خشک بے حد رو مینک انداز میں۔

سے دیا کی جان جلتی تھی۔

”تم نے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا؟“

وہ ابھی تک اس سوال کے جواب میں چکراتی تھی۔ اپنا دھیان بنانے کو بولی۔

”کون سی بات جان من!“

اس کی سرخ زوروں سے بھی خوابناک آنکھوں میں استعجاب تھا۔ دیا کچھ اور جھنجھلا گئی۔

تو فی۔

”جب سے تمہیں دیکھا ہے یار! میں سمجھتا تھا تمہیں حاصل کر لوں گا تو دل قرار پالے گا۔“

بھی میری طرح پاگل ہے۔ دیکھو اب تمہاری محبت، تمہاری توجہ، تمہاری چاہت کا طلبکار ہے۔ بات کرنے کی؟ نرا دیوانے کا خواب۔“

پتہ نہیں وہ کتنا سنجیدہ تھا۔ البتہ اس کی نظروں میں عجیب سی تقنی ضرور تھی۔ دیا نے بے تحاشہ غصے سے گھورا۔

”پھر فضول گوئی۔“

مستقیم کو جیسے کسی نے ہنر دے مارا ہو۔ ایسے ہی تڑپا تھا وہ۔

”ہاں۔۔۔ تم تو فضول گوئی ہی کہو گی۔ ظالم کشور لڑکی وہ کیا کہا ہے کہ کسی شاعر حضرت نے ہی خوب کہا ہے کہ۔“

خاک ہو جائیں گے ہم

تم کو خبر ہونے تک

وہ جیسے کرا رہا تھا۔ دیا جھنجھلا کر رہ گئی۔

تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ گویا پتھر سے سر پھوڑنا۔ بہر حال امانت سے کہو تمہیں دو ادے۔ شام تک طبیعت بہتر ہو ہی جائے گی۔

وہ غصے سے کہتی اٹھنے لگی تھی کہ جب بڑی سرعت سے مستقیم نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”یہ توجہ۔۔۔ یہ ہمدردی اور یہ احساس مندی۔ یار اگر میں خوش فہم نہیں ہوا تو یہ محبت کی ابتدائی ہے نا؟“

وہ سر سمی رہا تھا۔ مگر روشن آنکھوں میں آس کے کتنے ویپ جل رہے تھے۔ دیا نے ہونٹ بھیجی لیے۔ وہ کتنی دیر منتظر رہا مگر اس کی چپ نہیں ٹوٹی۔ یہاں تک کہ مستقیم کی آنکھوں کے جلتے سارے ویپ ایک ایک کر کے بجھ گئے۔ اس نے گہرا سانس سانس بھرا پھر ٹرے سے چائے کا گک اٹھا کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

”ایک گھونٹ ہی بھر لو۔“

دیا اس عجیب و غریب مطالبے پر حیران رہ گئی۔ گک تیز۔ دھاتی خالی تھا۔ محض پینڈے میں توڑی سی چائے تھی۔

”کیوں؟ یہ تم کہ ہے جو لازمی پیوؤں میں۔“

وہ دبی طرح چڑ گئی۔

”تم تم۔۔۔ سمجھو کے پنا لو۔ میرا مقصد تو تمہیں اپنا مچھونا کھانا ہے۔ سنا ہے اس سے مجھ۔ بڑھتی ہے۔“

وہ ہرگز بھی فیہ سنجیدہ نہیں تھا۔ دیا جو چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ سر جھٹک کر طنزیہ مسکرائی۔

”محبت ہو کی تو بڑھے مسٹر مستقیم! پہلے محبت تو پیدا کریں۔“

اس کا انداز ایسا تھا کہ مستقیم کا چہرہ ادھواں ہو کر رہ گیا۔ وہ کچھ دیر یونہی اسے نکتا رہا تھا۔

”محبت کیسے بڑھے گی دیا!“

”مجھ سے ایسے فضول سوال مت۔ پوچھا کرو۔“

اس نے زور دے پٹ سے دھکا دے کے انداز میں جواب دیا اور اسے دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔ مستقیم ساکن بیٹھا رہ گیا تھا۔

”اب طبیعت کیسی ہے؟“

وہ بستر کے نزدیک رکھی کرسی پر آ بیٹھی۔ مستقیم نے انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کمر پہ نکلے رکھ

قربت کی تیری پیاس ہے ویسے تو ٹھیک ہوں
اک درد دل کے پاس ہے ویسے تو ٹھیک ہوں
مگر ہو کچھ امید تو ہو جاؤں پر سکون
اک بے وجہی آس ہے ویسے تو ٹھیک ہوں

دیا تو بیسے پوچھ کر پچھتاہی تھی۔ مستقیم کے لہجے میں خفیف سی شرارت، ازلی شوخی کے ساتھ اک
ان کہا سادہ، سچی تھی۔ اس کا بیسے بس ہی نہ چلتا تھا۔ ورنہ کسی بچے کی طرح رو کر ہلک کر کسی بھی طریقے
اسے من لینا۔ اپنے حق میں ہموار کر لیتا۔ دیا نے کچھ دھیان سے بغور اسے دیکھا۔ اس کا لہجہ، اس کا
انداز گفتگو۔ انہی بیٹھنے کا مہذبانہ انداز اسے بار بار چونکا تا جا رہا تھا۔

”بڑے کچھ لگتے ہو۔ اپنی کوالیفیکیشن بتاؤ گے۔“

مستقیم کو اس سے اس سوال کی کہاں تو قیاس تھی۔ جیسی چونک کر اسے دیکھا۔ پھر بے ساختہ نظریں
چراغ گیا۔ ورنہ۔ چہرے پر جیسے ان ایک ساتھ کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ ہر رنگ اذیت اور کرب میں ڈوبا
ہوا تھا۔

”مجھے اک چائے کا کپ مل سکتا ہے؟“

وہ بات بدل گیا تھا، انتہ۔

”میں تمہاری نوکرائی نہیں ہوں سمجھے؟“

اپنی بات کا یوں نظر انداز ہونا اسے تنگ پا کر گیا تھا۔ مستقیم نے اس کے لال بھوکا چہرے کو دیکھتے
ہوئے پشیمان سربراہت چھپائی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بیوقوفی تو ہونا۔“

”جس پہ مجھے سرف شرمندگی ہے۔“

وہ جو باغرائی مستقیم یکدم ساکن ہو کر رہ گیا۔ اک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر وہ اٹھ کر کمرے
سے نکل گیا۔ دیا بعد میں بھی کتنی دیر جھلکتی رہی۔ ہونٹ کچل کچل کر زخمی کر لیے۔ آنکھوں میں بے تحاشا
کئی مڑتی جا رہی تھی۔

دو پہر کا کھانا بنا کر اس نے بشیر کو بتا دیا تھا۔ بشیر ہی ان کا کھانا دوسرے کمرے میں لگا تھا۔
بہت کم امانت وغیرہ کے سامنے جاتی۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی۔ اس حصے کی جانب وہ سب
آنے سے گریز کرتے۔ بشیر کو بھی وہ ضرورت کے وقت آواز دیتی تب ہی وہ ادھر آتا تھا۔
بھی اسی حصے میں باقی سب کے ساتھ ہوا کرتا۔ یہ سب اسے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔
کے لیے یہ سہولت کا خیال رکھنے والا خلیفہ مستقیم ہی تھا۔

کیلے ہاتھ دوپٹے کے پلو سے خشک کرتی وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو مستقیم کو ہنوز سوئے
اس عجیب سی وحشت ہونے لگی۔ دن داخل رہا تھا۔ وہ صبح کا سویا ہوا تھا پھر طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی
اس کے کہنے کے باوجود ضدی ایسا تھا کہ وہ انہیں لی تھی۔

”اپنے ہاتھ سے کھلا دو۔“

اسے اس کا مطالبہ یاد آیا۔

”میرا بھی دماغ خراب نہیں ہوا۔ پتہ نہیں کب چھوڑ دے یہ امتحانہ حرکتیں۔“

وہ اتنا بھنائی تھی کہ اسے سخت سناٹے لگی۔

”امتحانہ حرکتیں دیوانے کرتے ہیں۔ میں بھی تو دیوانہ ہی ہوں تمہارا۔“

مجال ہے جو اس کی سخت اور غصیلی باتوں سے ماتھے پر شکن آئی ہو۔ اتنی ہی محبت سے جواب

تھا۔

”مرضی ہے تمہاری! تکلیف تمہیں کاٹنی پڑے گی۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔“

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ دیا اپنے کام میں مصروف اس کے بعد سے جو وہ سر تک کھلے

اب یہ وقت آ گیا تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی تشویش گھیرنے لگی۔

”مستقیم۔“

اس نے آگے بڑھ کر اسے بے ساختہ پکارا۔ جواب نہ ارد۔ اس کے دل کو جیسے بے کلی

لیا۔ جیسی چیز سے جھک کر اسے زور سے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔

”افو۔ کیا ہو گیا ہے یار! سو تو لینے دیا کرو۔“

اس کی مدھم آواز بے حد بوجھل تھی مگر دیا کو تو اس کی آواز سن کر سکون سا آنے لگا تھا۔

سربراہاننے والی وحشت کو جیسے کوئی کنارہ ملا۔ اس میں کیا شک تھا کہ اس نکل بیابان میں اک

وہی آشنا وہی محرم تھا۔ اسے کچھ ہونے کا خیال بھی دیا کہ اندر سربراہان کی بھر۔ تا تھا۔ اس کے

لگا کر تے تھے تو وہ وہی تھا۔ ورنہ وہ ان کی کچھ نہیں لگتی تھی۔

میں۔ کتنی آسودگی تھی اس تکمیل میں وہ بلا جھجک دیا سے بھی اظہار کر جاتا۔

”سنا تھا محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ سو فیصد سچ ہے۔ بلاشبہ اس پر کس کو اختیار نہیں۔ پہلے سنا تھا اب سمجھا ہے تو لگتا ہے جو سنا تھا وہ سچ ہے۔ جو ہونے پہ آجائے تو خلیفہ مستقیم کو بھی دیا کے حرم میں جکڑ دیتی ہے۔ اور اگر مزید مہربانی کرے تو دیا کو بھی خلیفہ مستقیم کا اسیر بنا سکتی ہے۔ مجھے اپنے دل پہ اختیار نہیں دیا! وہ دن بھی آئے گا جب دیا کو خلیفہ مستقیم سے عداوت نہیں رہے گی بلکہ عداوت محبت میں بدل جائے گی۔“

اور جواب میں وہ اتنی غمزہ تھی کہ کچھ نہیں کہہ سکی، کچھ بھی دل نہیں سا۔ بس اس کی دونوں آنکھوں سے شفاف پانی کا ایک ایک قطرہ اٹھ اور پلکوں پر آ کر رک گیا۔

پھر اسی شام کے بعد جو رات آئی اس میں وہ کہیں جانے کو تیار تھا۔ وہ کیا سب ہی اور دیا کا دل مٹھی میں آ گیا۔ وہ اس مذموم ارادے کو جانتی تھی اور لخت لخت ہوئی باقی تھی۔

”اپنا خیال رکھنا۔ میں جلد آ جاؤں گا۔“

کمرے سے جانے سے قبل وہ لمحہ بھر کو اس کے پاس رک کر کال سہااتے بولا تھا۔

”سب جا رہے ہوں؟“ وہ سوالیہ ہوئی۔ مستقیم کے گردن بلانے پر ہونٹ بھینچ لیے۔

”بشر ہو گا یہاں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“

”کیا اچھوڑ کے جا رہے ہو مجھے اگر جو میں بھاگ گئی؟“

وہ سکتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے طنز کر گئی تھی۔ خلیفہ جو دروازے کی جانب مڑ چکا تھا

چمک کر پلٹا اور پھر بے تحاشہ ہنستا چلا گیا تھا۔

”اب کوئی خطرہ لاحق نہیں رہا ہے جان مستقیم! میں جانتا ہوں ایسا نہیں کرو گی تم!“

اس کے لہجے میں جو تھا وہ دیا کو تو جین سے سرخ اور فحالت سے بوجھل کر کے رکھ گیا۔ مستقیم

واپس پلٹا اور اس کے قریب آن ٹھہرا اور جھک کر اسے شانوں سے قہام لیا۔ وہ پوری طرح متوجہ تھا۔

دیا دانستہ اس کی جانب بٹکنے لگی۔

”میں نے کہا تھا نام سے دیا! یاد کرو کہ اک بار میرے نام ہو جاؤ۔ پھر بے فکری ہی بے فکری

ہے۔ اب تم میرے نام ہو گئی ہو۔ صرف میری ہو۔ میرے رنگ میں رنگ گئی ہو۔ اب کوئی خدشہ کوئی

خطرہ ہی نہیں۔ میں تب بھی جانتا تھا کہ تم جیسی لڑکی سے بے وفائی کا خطرہ نہیں ہوتا۔ مجھے اندھا اعتماد

تھی تو تھا تم پر جواب مزید پختہ ہوا ہے۔“

اور دیا اس اندھے اعتماد اس درجہ سرا ہے جانے پہ سن نہیں رہی تھی۔ کیا یہی نہیں تھی اصل

مجھ کو خیال ہے کہ تو میرا خیال ہے اے مرکز خیال تیرا کیا خیال ہے

آتا ہے تو خیال میں کتنے خیال سے مجھ کو تیرے خیال کا کتنا خیال ہے

وہ کروت کے بل بہت خاموش کم صم یعنی ہوئی تھی۔ جب مستقیم اس کے پیچھے آ کر لینا لگا

کے کاندھے پر سر رکھا کر آہستگی سے مگر متبسم لہجے میں کٹلتا یا تھا۔ وہ کسمپاسی اور اس کے حصار سے

چاہا۔ مستقیم نے اس کوشش کو ناکام بنایا اور اس کی کمر میں بازو مائل کر کے مزید خود سے قریب کر لیا

وہ دیکھی اور چہرے پر بے بسی جگ گئی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ جنہیں مستقیم نے دیکھا تھا اور

یونہی بکٹا رہا تھا۔

”خفا ہوا بھی تک؟“

وہ اس کی نرم پلکوں پر ہونٹ رکھ کر سرگوشتی میں پوچھ رہا تھا۔ دیا کے اندر موجود بے بسی

میں وحلی اور بھٹکی آنکھیں برس پڑیں۔ مستقیم نے سرد آہ بھری تھی۔

اک شام ڈھلے تم جس کے ملو بس اتنی حسرت کافی

تم ساتھ رہو، سانسوں میں بسو تم پاس رہو، ہانپوں میں

بس اتنی عنایت کافی ہے تم دل میں رہو، دھڑکن کی طرح

خوابوں میں رہو یادوں کی طرح اتنی بھی محبت کافی

اتنی بھی محبت کافی ہے

عجیب انوکھی خواہش تھی۔ وہ پھر بے خود ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر اسے ہانپوں کے گھیرے

سمیٹنے وہ اپنی وارھکیوں کے قصے سنانے میں مصروف تھا۔ اور دیا کے اندر نرم بھم برسات ہونے لگی

شرم سے زیادہ اس کا اس ناگوار قربت میں اذیت سے برا حال ہوا کرتا۔ وہ مرد تھا۔ اظہار کے

میں بہت بے شرم اور بے باک۔ وہ عورت تھی۔ لمحہ لمحہ کنتی اور پامال ہوتی ہوئی بے بس عورت

آنسوؤں پہ اختیار تھا۔ سوتی بھر کے بہائی۔

جبکہ خلیفہ مستقیم کو من پسند قربت مخمور و مسکور کر دیتی۔ اس کے اندر باہر آسودگی ہوتی۔

عورت کا لمس کتنا دل آویز اور کس درجہ ہوش رہا ہوتا ہے یہ وہ اچھی طرح جان چکا تھا۔ کیسا کھل

دیا کا۔ مہبوت کر دینے والا۔ اتنا سحر کار کہ زاہد خشک بھی بہک جائے۔ وہ تو پھر عام سا انسان تھا۔

لگتا دیا کی جانب دیکھنا گویا سورج سے آنکھ ملانا ہے۔ پہلی بار تو وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہی جیسے

اثر سے منجمد ہو گیا تھا۔ ایسی تشنگی اندر اٹھی تھی جس نے سیرابی کی خواہش سے بے حال کر دیا۔

عالم برزخ میں جھلستا بدن جیسے کسی جھرنے کے نیچے آ گیا تھا۔ کتنا سکون تھا اس کی زلفوں کی

محبت۔ کیا یہی نہیں تھا اصل اعتماد۔ وہ لمحوں میں اسے معتر کر گیا تھا۔ میں ممکن تھا اپنے دعوے کے مطابق اس پر بھی کر لیتا۔ وہ اندر سے خائف ہونے لگی۔ جیسی اس کے ہاتھ زور سے جھٹک دیئے۔

”اب جاؤ۔ ورنہ میں پوری تمہیں؟“

وہ چٹختی۔ گویا اس کیفیت سے چھٹکارا نہ پا کر ہی جھنجھلا گئی۔ مستقیم شرارتی انداز میں دھیرے سے ہنس دیا۔

”اگر کسی برے انسان میں بھی کوئی اچھائی دیکھیں یا محسوس کریں تو اس کی تعریف میں ممکن ہے اچھائی کے جذبے کو تقویت دے کر پروان چڑھا دے۔ اسی بہانے تعریف کر دو میری۔ دل خوش ہو جائے گا۔“

وہ اسے چمیز رہا تھا۔ دیا اس درجہ درست قیافہ پہ صرف ششدر نہیں ہوئی۔ خائف بھی ہو گئی جیسی رخ پھیر لیا۔ یہاں تک کہ وہ مایوس ہوتا پلٹ کر چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا

دونوں انسان ہیں تو پھر کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

وہ گنگناتے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑا شیو بنا رہا تھا۔ آئینے میں دکھائی دیتی دیا پہلی گویا اس کی ساری توجہ مرکوز تھی۔ جس کا ارادہ آج کپڑے دھونے کا تھا شاید۔ جیسی بستر کی چادریں اور پردے تک اتار کر ڈھیر بنا رہی تھی۔ مستقیم شیو سے فارغ ہوا تو کپڑے اٹھائے واش روم میں جا گھسا۔ نہاؤ کر سیاہ لباس میں کھراستہ صاف شفاف روپ لیے باہر آیا تو دیا بڑے نب میں سرف گھولے کپڑے بھگور رہی تھی۔

”کیسا لگ رہا ہوں نیوی! ابھی تابی دیا کرواؤ کی بندی!“

وہ اس کے عین سامنے جم کر کھڑا ہوا پوچھ رہا تھا۔ دیا نے بے خیالی میں نظر اٹھائی۔ سلیقے سے بنے بال جن میں ابھی نمی باقی تھی۔ خوشبوؤں میں مہکتا لباس۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی اپنی عفت دینے والی وجاہت۔ وہ کچھ دیر واقعی نظریں نہیں ہٹا سکی۔

”دیکھا تم پر بھی تھل گیا تا میرے حسن جہاں سوز کا جادو۔“

اس کے کھٹکھٹاتے انداز پر دیا نہ صرف چوکی بلکہ عفت سے بھی سرخ پڑ گئی تھی۔ جیسی بے ساختہ نظر چرائی۔

”شوہر کی تعریف کرنے میں بہر حال کوئی گناہ نہیں ہوتا مومن لوگو! اور کچھ نہیں تو کبھی دل کی

رکھ لیا کرو۔“

اس کے لیے میں شرارت ہی شرارت تھی۔ دیا رک گئی اور اسے برہم نظروں سے دیکھا۔

”ہر کوئی ظاہری خوبصورتی پر جان دے ضروری نہیں ہے مسٹر خلیفہ مستقیم! تم ظاہری طور پر جتنے بھی پرکشش ہو مگر مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ تم باطنی طور پر بے حد غلط اور برے انسان ہو۔ مجرم ہو۔ لیسرے ہو۔ کاش تم شکل صورت کے لحاظ سے جتنے بھی بد صورت ہوتے مگر ایک۔ مدھرے ہوئے انسان ہوتے۔ مجھے تمہیں قید لینے میں تامل نہ ہوتا۔“

وہ دھلنے پہ آئی تو ہمیشہ کی طرح بنا لحاظ کیے بولی تھی۔

”ایزیک! تم تو فلسفہ بھی بہت اچھا بولتی ہو یا را!“

بغیر شرمندہ ہوئے وہ داد دینے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ پھر سگریٹ ساگنا کر دانستہ اس کے منہ پہ دھواں چھوڑا۔ مقصد اسے تنگ کرنا تھا مگر دیا کو زور کی ابکائی آ گئی تھی۔ سرعت سے پیچھے ہٹنے کی کوشش میں وہ بڑکھڑائی گئی۔ مستقیم نے بروقت نہ سہارا دیا ہوتا تو یقیناً گر گئی ہوتی۔

”دھیان سے میری جان! کیا ہو گیا؟“

اس محبت سے تمام کر خود میں سموتا ہوا وہ نرم گرم انداز میں بولا تھا۔ دیا نے اس کے بازوؤں کا حلقہ توڑ کر فاصلے پہ جاتے ہوئے گہرے سانس بھرتے ہوئے جیسے خود کو کپڑے کرنے لگی۔

”سگریٹ بند کرو۔ اس کی اسمیل سے میرا دل الٹ رہا ہے۔“

اس کے چہرے پر بیزارگی و اکتاہٹ ثبت تھی۔ خلیفہ نے کچھ چوکتے ہوئے بغور اسے دیکھا پھر فی الفور سگریٹ بجھا ڈالا۔

”خیریت ہے دیا! اس سے قبل تو سگریٹ کی اسمیل سے تمہاری ایسی کیفیت نہیں ہوئی۔“

”نہیں ہوئی تو اس کا یہ مطلب ہے ساری زندگی ہو بھی نہ۔“

جواباً وہ تقریباً جھلائی۔ اس کے ہر انداز سے بے پناہ درشتی جھٹک رہی تھی۔ خلیفہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں اک اسرار پوشیدہ تھا۔

”ہاں بالکل ضروری نہیں کہ ہو بھی نہ۔ یعنی خوش خبری تو انسان کو کسی بھی وقت مل سکتی ہے۔“

اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ جس پر دیا نے مطلق دھیان نہیں دیا نہ غور کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ خلیفہ اس سے مزید اس موضوع پر کھل کر ضرورت بات کرتا اگر جو اس وقت اسے حسام کا بلاؤ نہ آ جاتا۔

جیسا کہ کچھ بات میں چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”ہاں۔ مگر تمہیں کیسے پتا؟“

”مجھے ہی تو پتا ہے میری جان! کہ تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔“

جو باوجود چپکا تھا۔ خوشی و انبساط کے بے پایاں احساس سمیت جھوم سا گیا۔ جبکہ دیا اک لمحے کو چھرا سی گئی۔ اسے لگا تھا اس کے اعصاب پر کسی نے طاقتور بم پھینک دیا ہو۔ وہ اک سکتہ کی کیفیت میں تھا اسے اپنی پٹنی آنکھوں سے نکلتی رہی تھی۔ اسے اپنی ٹانگیں ہی نہیں اپنا پورا وجود شل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے جان سے انداز میں دھب سے وہیں گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ مگر یہ پہلا موقع تھا کہ مستقیم کا دھیان اس کی بجائے اس خوشخبری کی جانب تھا۔ جسکی اس کی بدلتی کیفیت نوٹ کیے بغیر بھڑکی سے اٹھا۔

”اتنی بڑی خوشی ہے، میں سب کو بتاتا ہوں۔ آج تو جشن ہو گا۔“

وہ اسی جوش و خروش سے کہتا باہر جانا چاہتا تھا کہ دیا کا یہ سکتہ ایک دم چھٹا کے سے ٹوٹ گیا۔

”بات سنو! ابھی کیا کہا تم نے؟“

اس نے درستی سے استفسار کیا تھا۔ اسے ابھی بھی گویا اپنی سماعتوں پہ شبہ تھا۔ یا پھر وہ شبہ میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ مستقیم کے البتہ گمان تلک بھی اس کی کیفیت کی دیگر گوں حالت تھی نہ اس کے احساسات کی۔ جسکی اس سرخوشی کے انداز واپس اس کے پاس آ گیا۔ پھر اس جوش مسرت سے مسکرا کر بولا تھا تو آنکھوں کی مہکان پل پل چل رہی تھی۔

”تمہیں بھی بہت اچھا لگا نا؟ یہ خبر ہی ایسی ہے کہ بار بار سننے کو جی چاہے۔ مائی لوہین یو آر ہنگامٹ دو مائی کنڈ۔“

وہ اس کی گھبراہٹ، شہنائی متوحش آنکھوں میں جھانک کر ہنستے ہوئے بولا تو دیا جیسے بالکل بے جان ہوتی چپچپ کی جانب چپت ہوئی تھی۔ مستقیم کے لیے اس کی پیلی پڑتی رنگت تشویش کا باعث بن گئی۔ جسکی کتنا غبرایا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

”دیا! آؤ! آؤ! آؤ! تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے؟“

وہ ایک دم اس کے سرد پڑ جانے والے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دباے اضطراب بھرائی نظروں سے اسے تکتا کتنی پریشانی سے سوال کر رہا تھا۔ دیا نے آنسوؤں سے چھلکی اجنبی نظروں سے اسے دیکھا اور ایک دم سے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”تم کہو۔ ابھی جو تم نے کہا وہ جھوٹ ہے۔ سب غلط ہے۔“

اسی شام چوبیس بجے کے آگے سالن پکاتے ہوئے دیا کو پھر اسی انداز میں ابکائیاں آنے لگیں۔ سالن کے نیچے آنچ بھی دھیمی کیے بغیر وہ منہ پر ہاتھ رکھے کچن میں ہی سنگ کے اوپر جھک گئی۔ صبح سے وہ کام میں لگی تھی۔ جو معمولی سا ناشتہ کیا تھا وہ بھی کب کا ہضم ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود قے تھی کہ رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ دیا کو خوف محسوس ہونے لگا کہ اس کی انتڑیاں بھی شاید اس کے منہ کے راستے باہر آ جائیں گی۔ بشیر جو کسی کام کی غرض سے ادھر آیا تھا۔ اسے یوں حال سے بے حال دیکھ کر اٹنے قدموں بھاگا۔ جسکی اگلے چند لمحوں میں ہی مستقیم کسی قدر بدحواسی کے عالم میں دوڑتے ہوئے قدموں سے اس کے پاس آیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے یونہی سنگ پر جھکی ہوئی تھی۔

”دیا۔ دیا! کیا ہوا جانم؟“

اس نے پیچھے سے اس کے وجود کو بازوؤں کے گھیرے میں لے کر اپنی طرف رخ پھیرا۔ اس کی حالت نے جیسے مستقیم کا دل مٹھی میں لے کر بھینچ ڈالا۔ سرخ چہرہ آنسوؤں سے جل تھل تھا۔ دھنک بے تحاشا زرد۔ وہ جیسے لمحوں میں غرق ہو گئی تھی۔ مستقیم نے اپنے ہاتھ سے اس کی آنکھیں اور گال پونچھے۔

”طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو کیا ضرورت تھی یہاں کھڑے ہو کر کام کرنے کی۔ اپنا خیال پھینک

کیوں نہیں رکھتی ہو۔ کتنا منع کرتا ہوں یوں خود کو ہلکان کرنے سے۔“

اسے ساتھ لگاتے ہوئے نرمی سے ڈانٹ دیا تھا۔ دیا کو بے حد نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ نہیں بولی۔

”آؤ۔۔۔۔۔ اب اندر چلو۔“

وہ اسے یونہی ساتھ لگائے پلٹا تو دیا نے بے اختیار کمزوری عزاحت کی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ سالن جل جائے گا۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ ایسا تو کچھ دنوں سے ہو رہا ہے۔“

اوکے۔۔۔۔۔ اس کا بازو ہٹا کر وہ نحیف سی آواز میں کہہ رہی تھی۔ مستقیم اب کے چونکا۔ اسے اس کی

کی کیفیت از سر نو یاد آئی تو بغور اسے دیکھا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے کچھ دنوں سے؟ یعنی دو مینٹنگ؟“

وہ کچھ بے چینی کچھ اشتیاق کی ملی جلی کیفیت کے زیر اثر بولا تو دیا نے اس کے بدلے ہوئے

و انداز پہ دھیان دیئے بغیر سر کو بے دلی سے اثبات میں جنبش دے ڈالی۔ جبکہ اس کے برعکس

کیفیت ہی بدل گئی۔ آنکھیں چمکیں اور جوش مسرت سے رخسار تھما اٹھے۔

”اور کیا محسوس کرتی ہو۔ مثلاً چکر وغیرہ بھی آتے ہیں نا؟“

وہ اسے کانٹھوں سے تھام کر زبردستی اندر لے آیا تھا۔ دیا اس کے سوالوں پر کتنی حیران

وہ اسے کانٹھوں سے تھام کر زبردستی اندر لے آیا تھا۔ دیا اس کے سوالوں پر کتنی حیران

وہ اسے پاٹھوں کی طرح جھنجھونڈنے لگی۔ مستقیم حیران تو ہوا مگر اسے بے ساختہ اپنے حصار میں لے کر نرمی سے تھپکنا مسکرایا۔

”نہیں دیا ایہ سچ“

”سچ یہ سچ ہے؟“

وہ مچل کر تڑپ کر اس کے حصار کو توڑ کر فاصلے پر ہوتی اور پھپک کر رہ پڑتی۔

”اگر یہ سچ ہے تو سنو۔ مجھے نہیں چاہیے یہ بچہ۔ میں ایک ڈاکو۔ ایک شیر۔ ایک کوا گے بڑھانے کا گناہ نہیں کر سکتی۔ مجھے اک سپہ لیا نہیں جتنا۔ کیا بنے گا وہ بڑا ہو کر؟“ ایک بچہ کیا پہچان ہوگی اس کی۔ اک شیر۔ کی اولاد کہلائے گا۔ وہ؟ بولو جواب دو مجھے خود غرض پرست ظالم بے حس انسان! سوچو ذرا۔“

وہ اتنی وحشت، اتنی بے قراری سے روئی تھی کہ مستقیم کو اسے سنبھالنا دشوار ہونے لگا۔ وہ خود اس بل دیا کے اتنے شدید رد عمل کے جواب میں گہرے ذہنی کرب سے دوچار ہو گئی۔ دیا کے الفاظ نہیں نوکیلے خنجر تھے جو اس کی رگ جاں میں جا اترے تھے اور اسے بیدردی سے کاٹ رکھ گئے تھے۔ ہونٹ جھپٹے، منہ کے کڑے مرحلے طے کرتے اس نے بھری موج کی طرح تڑپتی دیا کو اپنے بازوؤں میں بھینچا اور بستر تک لے آیا۔ جو چیخ چیخ کر بڑھال تھی مگر اشتعال ختم ہو گیا تھا۔ مگر اب یک دم اس کے بازوؤں میں نیم جان سی ہوتی جھول گئی تھی۔ مستقیم نے احتیاط کے اسے بستر پر لٹایا اور کبل اوڑھا دیا۔

وہ چہرے پر آنسوؤں کے نشان لیے بچکیاں بھرتی اور سسکتی رہی۔ مستقیم اسے دیکھتے اذیت کی ان دھکی ٹکوار سے کنارہ ہا۔ پھر آہستگی سے پلٹا تو انداز میں صدیوں کی تحکین نمایاں تھی۔

اونچے اونچے درختوں کے پتے سرد ہوا کے جھونکوں سے سرسراتے تو رات کے ستارے عجیب سا شور پیدا ہونے لگتا۔ وہ اتنا مضطرب تھا کہ اس غصہ کی سردی کا بھی گویا احساس ہوتا تھا۔ دیا کا اتنا شدید رد عمل اسے اندر سے شکست کرنے توڑنے پھوڑنے کا سبب بنا تھا۔ اسے گناہ ہی وہ جیتی ہوئی ہر بازی بار گیا ہے۔ شاید زبردستی کی جیت کبھی بھی راحت اور خوشیوں کا سانس نہیں کر سکتی۔ حالانکہ اس نے تو اپنی پوری توانائیاں صرف کر کے دیکھ لی تھیں۔ جیسی اب حالت اور مضطرب تھا۔ ہونٹوں میں دبا سگریٹ سدا۔ ملک کر ختم ہو رہا تھا۔ پتے نہیں وہ لڑکی چھری لگاؤ جذبوں میں کوئی کمی تھی۔ ابھی کل ہی اس نے کتنی عاجزی سے اپنی کیفیات پھر اس تک پہنچا

تھی۔ جب وہ اپنے مخصوص روکھے اور سرد انداز میں اس کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ رہی تھی۔

اک شام ڈھلے تم ہنس کے ملو بس اتنی مسرت کافی ہے تم ساتھ رہو، سانسوں میں بسو تم پاس رہو، ہانپوں میں رہو تم دل میں رہو دھڑکن کی طرح خوابوں میں رہو یادوں کی طرح اتنی بھی محبت کافی ہے

اور دیا کی نظروں میں جو اب اتنی تپش کس درجہ اکتاہٹ اتر آئی تھی۔ کچھ کہے بغیر وہ اسے ان ہی نظروں کی مار مارتی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی اور وہ سرد آدھ بھرتا اپنی ہتھیلیوں پر پھیلے لکڑیوں کے جال میں الجھتا تھا۔ شاید محبت کی لکیر دھوڑ رہا تھا۔ جو نظری نہ آتی تھی اور اب اسے یقین ہوا تھا وہ کبھی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوگا۔ وہ اگر پھر نہیں بھی تھی تو مستقیم کی اس حرکت نے ضرور اسے پتھر کر دیا تھا۔ اسے یاد آیا جب وہ اس پر سے رحم مانگ رہی تھی۔ اس نے اس پر ترس نہیں کھایا تھا۔ اب وہ گھبراہٹ میں پرہیزگاری۔ اس نے ہونٹ جھپٹنے لیے گردل اس اذیت کو نہ سہتے سکتے لگا تھا۔

ساری رات گزر گئی تھی اسے وہاں کھڑے اپنی قسمت کا ماتم کرتے۔ سورج اب دھیرے دھیرے افق سے نمودار ہو رہا تھا۔ سب سے فضا کھرا لودھی۔ وہ وہاں سے نکل کر جھیل کنارے آ گیا۔ اور پانی کی سطح پر ہوا کی تندہی سے پڑنے والے بھنور خالی نظروں سے دیکھے گیا۔ تب ہی اپنے پیچھے آہٹ محسوس کی۔ مگر پلٹ کر دیکھنے کی خواہش اس نے اس اندر جنم نہیں لیا۔ جیسی اسی زاویے پر ساکن رہا تھا۔ یہاں تک کہ امانت چلتا ہوا اس کے مقابل آ گیا۔

”تم اتنی سچ یہاں کیا کر رہے ہو مستقیم!“

امانت کی آواز میں تحیر و استعجاب تھا۔ مستقیم نے جواب دیئے بنا جلتی آنکھیں میچ لیں۔ امانت نے گردن تیز کر اسے بغور دیکھا تھا۔ پھر گہرا سانس بھر کے گویا ہوا۔

”زندہ بگلتے ہو۔ حالانکہ ہونا نہیں چاہیے۔ آف کورس تم وہ خوش قسمت انسان ہو اس اندھی بھری محرومیوں سے بھری بستی کے، جس کے پاس سب کچھ ہے۔ گھر۔ گھر والی۔ گھر والی بھی وہ جو بے حد خوبصورت نہا نہیں اس کی پارسائی پر بھی شبہ نہیں۔ اللہ نے چاہا تو بچہ بھی ہو جائے گا۔ پھر اس پریشانی کی مہ“

امانت اسے چمیز رہا تھا۔ مگر مستقیم کے چہرے پر قم اذیت کچھ مزید گہری ہونے لگی تھی۔

”ایسا بہت کچھ جو ہماری زندگیوں میں نہیں ہونا چاہیے امانت! لیکن وہ ہماری رضا کے بغیر بھی ہو جایا کرتا ہے۔ مجھے یہی ہونا ہے بچن اور پریشان کر رہا ہے۔ دراصل جو ہم سمجھتے ہیں

ضروری نہیں سب ویسا ہو۔“

اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر ساگائی اور اس اضطراری کیفیت میں کش لینے لگا۔

”بھابی کی بات کر رہے ہو؟“

امانت نے مسکرا کر اس کی صورت دیکھی۔ لیکن پھر کسی قدر حیرت سے بولا تھا۔

”مگر یار! وہ ایڈجسٹ کر تو رہی ہیں۔ ڈونٹ وری انٹھیک ہو جائے گا سب۔“

اس کا انداز تسلی دیتا ہوا تھا۔ مستقیم کے چہرے پر موجود مٹی چھو اور گہری ہوئی۔

”کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ میں بھی اب تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھا مگر رات۔۔۔“

اس نے بات اور حیرتی چھوڑ کر ایک دم سے ہونٹ باہم سمجھنے لگے۔ امانت کی نظریں سوالیہ انداز

میں اسی پر ٹھہری ہوئی تھیں۔

”رات کیا ہوا؟ جھڑا ہوا ہے تمہارا ان سے؟“

مستقیم ہونٹ کچلتا رہا۔ پھر بے حد بے دلی کی کیفیت میں سگریٹ جھیل کے پانی میں پھینک

دی۔ شعلہ بجھنے کی بجلی سی آواز ابھری اور سگریٹ پانی میں جاتے ہی کھل کر تمباکو اور راکھ سٹخ پھیر

گئی۔

”مجھے افسوس ہے۔ مجھے اپنی زیادتی کا احساس اس وقت ہوا جب ازلے کا وقت گزر چکا تھا۔“

”کیا مطلب؟“

امانت کو تحیر نے آن لیا۔ وہ ششدر ہوتا آنکھیں پھاڑے اسے ٹکٹے لگا۔ یہ کسی بھی لحاظ سے

مستقیم نہیں تھا۔ جس سے وہ آگاہ تھا۔ اکھڑ، ضدی، مغرور اور ہٹ دھرم، جو صرف اپنی ہی منوانا چاہتا

تھا۔ مگر اس ایک لڑکی کی بدولت اس نے خلیفہ مستقیم میں کیسے کیسے تغیر آتے دیکھ لیے تھے۔

”ہاں۔۔۔ محبت ایسا ہی تو باکمال جذبہ ہے۔ اسے نیم دیوانی ہوتی شامل یاد آتی۔ جو مستقیم

تمام تر بے اعتنائی کے باوجود اس پر دل و جان سے فریفتہ تھی۔ پھر وہ خود تھا۔ جانتا بھی تھا۔ شامل

سے نہیں مستقیم سے عشق کی حد تک عقیدت رکھتی ہے مگر وہ اس سے محبت کرنے پر مجبور تھا۔

”وہ پریکٹ ہے۔ مگر وہ میرے جیسے عادی مجرم کے بچے کو جہنم دینے کو تیار نہیں ہے۔“

امانت کو سوچوں کے بخنور سے کھینچ لانے کا باعث خلیفہ مستقیم کی آواز بنی تھی، جو بے حد چنگ

اور مدھم تھی۔ دکھ کی آج سے چمکتی۔ اس نے چونک کر مستقیم کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں اتنی سرخ تھیں

لگتا تھا ان سے کسی بھی لمحے خون چھٹک پڑے گا۔ وہ کیا کہتا۔ چپ بیٹھا اس کا دکھ سہتا رہا۔ کتنی دیر

کیفیت میں گزری تھی۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوتا ہوا نرمی سے ٹوک کر بولا تھا۔

”آؤ۔ اندر چلیں۔ پتہ نہیں کب سے یہاں بیٹھے ہو۔ اپنی رگھت دیکھو۔ بالکل نیلی ہو رہی ہے

سڑی کے باعث۔“

مستقیم نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال لیا۔

”تم چلو۔ آجاتا ہوں کچھ دیر میں میں بھی۔“

اس جواب پر امانت بے بس سا ہوتا اسے ٹکٹے لگا۔ جانتا تھا وہ اس کی بات نہیں مانے گا۔ چاہے

وہ اپنا سر کیوں نہ پیٹ لے۔

☆ ☆ ☆

وہ کروت کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے پتے آنسو ٹپکے جھگور رہے تھے۔ جب بجلی سی آہٹ

پر اس نے بے ساختہ گردن موڑی مگر حیرت و غیر یقینی سے ساکن ہو کر رہ گئی۔ دادی کمرے کے مین

وسط میں مسکرا کر اسے دیکھتیں دونوں بازو پھیلائے کھڑی تھیں۔ اس میں جیسے پارہ بھر گیا۔ اپنی جگہ

سے اٹھی اور ایک ہی جست میں سارا فاصلہ سمیٹ کر ان کے کھلے بازوؤں میں سا گئی۔ دل تو تھا ہی

بھرا ہوا۔ وہ بے ساختہ بچکیوں سے رو پڑی تھی۔ دادی پیار سے اس کے سر کو سہلاتی رہیں، آنسو پونچھتی

رہیں۔

”آپ کہاں چلی گئی تھیں دادی؟“

اس نے کسی انجانے خوف میں مبتلا ہوتے ان کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ

لیا۔

”میں کہاں گئی تھی۔۔۔ تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ یاد نہیں؟“

دادی مسکرا دی تھیں۔ وہ سسک اٹھی۔

”وہ مجھے لے گیا تھا۔ زبردستی۔۔۔ میں کب اس کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔“

اس کے آنسوؤں میں کچھ اور روانی آ گئی۔ دادی نے نرمی سے اس کی آنکھیں پونچھ دیں۔

”بس۔ بس! اب رونا نہیں ہے۔“

”نہ۔۔۔ آنسو کبھی خشک نہیں ہو سکتے دادی! قسمت نے مجھے ایک عادی مجرم کی ذات کا حصہ بنا

لیا ہے۔ مجھے بہت نفرت ہے اس سے۔“

اس کا لہجہ شدید تھا۔ اس کا انداز گنجائش سے عاری تھا۔ جسے دادی نے محسوس کیا تو نوکنا ضروری

ہو گیا تھا۔

”نہ پتی! نفرت مجرم سے نہیں، مجرم سے ہونی چاہیے۔“

اسے اپنا آپ اسی وحشت زدہ انداز میں چھڑا کر پھر سے دروازے کی جانب لپکتے دیکھ کر مستقیم
اس کے منتفی ذال جیسے وجود کو تھمتے ہوئے ٹوکا۔ وہ اسے ہرگز حواسوں میں نہیں لگتی تھی۔

”دادی! ابھی دادی آئی تھیں میرے پاس۔ پھر پتہ نہیں کہاں چلی گئیں۔“
اس نے ہنسی ہوئی بھراہٹ زدہ آواز میں کہا تو مستقیم نے اب کی بار ٹھٹھک کر اسے دیکھنا شروع

”تم نے خواب دیکھا ہوگا۔ وہ یہاں کیسے آسکتی ہیں بھلا؟“

اسے نرمی سے سمجھاتے مستقیم نے اسے ہاتھ پکڑ کر بستر پہ بٹھاتے ہوئے رساں سے کہا تھا۔

”تم آرام کرو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ سر ہٹکائے اس خواب کے زیر اثر بیٹھی ہونٹ کچلتی رہی۔ اس نے مستقیم کی بات کا جواب
نہیں دیا تو۔ چند لمحوں کے توقف سے وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں دبانے لگی اور مستقیم جو پہلے ہی وہنی
اور قلبی اذیت و انتشار کا شکار تھا بچنے ہونٹوں سے اسے دیکھتا ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بس کرو دیا! پلیز یوں خود کو ہلکان مت کرو۔ اگر تم ایسا نہیں چاہتیں تو فکر کرنے کی ضرورت
نہیں ہے۔ میں اس مصیبت سے تمہاری جان چھڑوا دوں گا۔“

تیز لہجے میں کہتا وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ دیا ہنوز اسی کیفیت میں ٹھنوں میں چہرہ دیے
دے سکتے ہیں مسرور تھی۔ اس بات پر دھیان دیئے بغیر کہ مستقیم کس اذیت سے دوچار ہے۔

☆.....☆.....☆

بہت دنوں بعد اس نے غسل کیا اور نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ دعا کو ہاتھ اٹھائے تو پلکیں
ٹھنوں کے خزانے بے دریغ لٹانے لگیں۔ وہ کتنی دیر یونہی بے قراری سے دل کا بوجھ اتارتی رہی۔

”دادی کہتی ہیں میں دیا ہوں۔ روشنی پھیلا نا میرا کام ہے۔ بلکہ فرض ہے۔ مگر کیسے؟ میرے
ٹھانڈے راستے بھلا۔ میں بس تیری مدد تیری راہنمائی کی طلب گار ہوں۔ میری مدد فرما! مجھے نہیں پتہ

کونسا مقام پر مجھے کیا کرنا ہوگا۔ اس مرحلے پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر تو نے یہ مشکل راستے میرے
صاحب مگر کہتے ہیں تو ان پر چلنے کا حوصلہ اس آزمائش میں سرخروئی کا ہنر بھی عطا فرما دے۔ آمین ثم

اللہ۔“

اس نے منہ پر ہاتھ پھیر کر نظر اٹھائی تو مستقیم کو اپنی طرف کسی قدر رحمت سے ہنکتے پا کر پہلی بار
ان کا دل ہلکا ہوا تو کچے اور نئے انداز میں دھڑکا۔ اسے اس کی یہ نظریں۔ یہ توجہ بری نہیں لگی تو یہ احساس
تھی کہ وہ بھی اپنے لیے سے دوچار کر گیا۔ جائے نماز سمیٹ کر تہہ کرتے اس کی لائینی پلکیں لرز کر حیا آمیز

اور دیا ان کی اس انوکھی منطق پہ کتنی حیران ہو گئی تھی۔

”میں تم سے بہت خفا ہوں دیا! تجھے یاد ہے۔ تیرا نام دیا میں نے رکھا تھا۔ پھر تیری تردید
اس کی طرح کی کہ تو اپنے نام کا حق ادا کر سکے۔ تو تو دیا تھی نا۔؟ جس کا کام ہی روشنی پانا

ہے۔ اسے چاہیے محل میں رکھ دو یا قبرستان میں۔ اس نے تو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ یہ اس کا
قسمت کہ اسے کیسی جگہ کو اجالنے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ دیا! مجھے بتاؤ اگر یہ ذمہ داری

بجائے دیرانے کو اجالنے کی سرپرستی ہے تو تو اپنے نرض سے دستبردار ہو جائے گی؟ روشنی کی بجائے
دھواں دے گی۔ جو آنکھوں کی بنیائی جھین لیتا ہے۔“

ان کی باتیں کتنی مشکل تھیں۔ جن کا مفہوم اسے قطعی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان کی بات
محسوس کرتی ان کی گود سے سرائٹا کر سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ اور کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں

ہو کر دیکھا۔ دادی نے اس کی کیفیت کو سمجھا اور اس کا سر سہلا کر پھر سے نرمی و پیار سے بولی تھیں۔
”پتر جب اللہ سائیں اپنے کسی بندے کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے یا قریب کرنا چاہتا ہے

اس سے خاص اور بڑے بڑے کام لیا کرتا ہے۔ ان حالات میں تم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ اللہ
تجھیں کسی کی ہدایت کے لیے چنا ہے۔ مستقیم اگر تمہاری محبت میں بے بس ہوا ہے تو تم اس کی محبت

قائدہ اٹھا کر کوئی ایسا کام لے سکتی تھیں جو اسے ان اندھیروں اور پر خار راستوں سے واپس لے
مگر تم نے تو خود بھی ہدایت کی روشنی سے منہ موڑ لیا۔ بتاؤ دیا! یہ تھی میری تربیت۔؟“

دادی کا ہر سوال شرمندگی اور محنت میں مبتلا کرنے والا تھا۔ وہ اس قابل بھی نہیں رہی تھی
جواب دے سکتی۔

”ابھی بھی وقت گزر رہا نہیں ہے پتر! اپنے حصے کا کام انجام دے ڈالو اور رب کے حضور آگاہ
میں سرخروئی حاصل کرو۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔“

دادی نے اس کا سر تھپکا۔ ہاتھ چوما اور اک دم سے جانے کہاں چلی گئیں۔ وہ تھپ تھپ
ساختم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”دادی..... دادی۔“

وہ ہڑبڑا کر بستر سے نکلے اور بے قراری و بیتابی سے اندھا دھند دروازے کی سمت بھاگی تھی
اندرواغل ہوتے مستقیم سے بری طرح ٹکرا کر گرنے کو تھی۔ جب مستقیم نے بے اختیار اسے

تھا۔ رورو کہ سوچی آنکھیں متورم چہرا، وہ پسینوں میں ہنسی ہوئی تھی اور بری طرح کانپتی تھی۔
”کیا ہوا ہے؟ کہاں جا رہی ہو؟“

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
کچھ بخت میں ڈھیروں کالک تھی
ہم رات لپے ہیں جمبولی میں
جب بھرتی صحرا صحرا تھی
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
بہم نے جیون کھیتی میں
کچھ خواب بھل مکانوں کے
کچھ وفا کی شمعوں کے
پھر اپنی گھائل آنکھوں سے
پانی نہیں ماس کی کھاد بھری
اور بوس گئے پچھلی رت میں
پھر ہنسنے نے وہم دیا
پھر تپ سے کوئیل پھولنے کی
ہم جو خوابوں کے بیوپاری تھے
وہ سیاہی خاموش تھا جیسا دیا کے پاس سے اٹھ کر آیا تھا۔ البتہ آنکھوں کی سرخی میں اب نمی بھی
تھی تھی۔ بارش دیوانہ وار برسی تھی۔ وہ عجیب سی حسرت سے برسی بارش کو تک رہا تھا۔ بوندیں کتنے
چش اور ہندب کے ساتھ زمین کی جانب لپکتی تھیں۔ مگر دھرتی کے سینے پر گرتے ہی اپنا وجود کھو بیٹھتی
تھیں۔ اس کی ذات، اس کی محبت بھی ایسی ہی بے مایا اور بے وقعت تھی۔ یہ اس پر دیا نے با۔ ہمارے
واضح کیا تھا۔ مگر وہ کتنا احمق تھا کہ پھر بھی اس جذبہ، اسی شوق سے اس کھن رات پر اندھا دھند بھاگا
جاتا رہا تھا۔ ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی میں تن من دھن سے تگن رہا۔ یہ جانے بنا کہ ضروری نہیں ہر
چیز کے پھولنے سے چشمہ جاری ہو۔ وہ بھی تو پتھری ہوتے ہیں جو سیال مادے اگتے ہیں۔ دیا بھی
ایسا ہی پتھر ہوتا ہوئی تھی۔ جو اس کی دیوانہ وار کمرہوں سے نوٹ تو ضرور گنی تھی مگر اندر سے جولاہا و آکا
تھا اس نے نہ مستقیم کے پہلے سے زخموں سے اٹنے خونم خون وجود کو اپنی تپش اور آگ سے جلا کر
باہل ٹاکنے کے رکھ دیا تھا۔
کبھی بے بسی اتر آئی تھی مستقیم کے اندر۔ پرانی بھی ساری اذیتیں جاگ اٹھیں گویا سارے
میں رطوبت کے منہ کل گئے تھے۔ اس نے سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر بارش کے پانی میں اچھال دیا۔

انداز میں عارضوں پر سایہ فگن ہو گئی تھیں۔

"دیا! یہ میڈیسن لے لو۔"

وہ جائے نماز رکھ کر سیدھی ہوئی، تو اسے اپنا منظر پایا تھا۔ ایک نسبتاً چھوٹا بڑاؤن لفافہ اس
جانب بڑھائے وہ اس کی سمت دانستہ دیکھنے سے گریز برت رہا تھا۔ دیا کی آنکھوں میں اب بھی
تھی۔

"کیسی میڈیسن ہے یہ؟"

وہ لفافہ تھامنے میں متامل کا شکار حیرت سے استفسار کیے بغیر نہ رہ سکی۔ مستقیم چند ثانیوں میں
رہ گیا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی لفافہ کھلایا۔

"اس کے استعمال سے تمہیں اس ناسور سے چھٹکارا مل جائے گا۔ جو تمہارے وجود میں پلے
وہ جتنا سنجیدہ تھا۔ دیا اسی قدر شکستہ ہو کر رہ گئی۔ لفافہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔
ہلدی کی مانند ہلی ہو گئی تھی لہجوں میں۔ مستقیم نے زہر خند نظروں سے اس کے چہرے کی بدلتی کیفیت
دیکھا تھا۔

پریشان کیوں ہوتی ہو؟ اس میں ایسی مضرت کوئی چیز نہیں جس کا سائٹ ایکٹ ہو۔
ایکس مینو ہے۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔"

وہ جیسے پوری شدہ سے اسے یقین سوچ رہا تھا۔ دیا نے دھواں دھواں ہوتے چہرے
ساتھ رخ پھیر لیا۔ شدت ضبط سے اس کے ہونٹ کاٹنے لگے تھے۔ آنکھیں لبالب پانیوں
گئیں۔ وہ بیک وقت کتنی مثبت و منفی کیفیات کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ بوجھل اور مضطرب۔ مستقیم
جانب سے جواب اور رد عمل نہ پا کر مٹا۔ فغانہ سانس کھینچتا ہوا پھر اسے مخاطب کر گیا تھا۔

"تمہیں اگر میری بات کا اعتبار نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔ کل میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس
اور خود۔"

"مستقیم! پلیز..... پلیز لیوی! لون، فارگاڈ سیک۔"

وہ اس کی جانب رخ پھیرتے ہی اسے زور سے دھکا دیتے ہوئے ہڈیانی انداز میں
کی پہلے سے سرخ ہو کر دھکتی آنکھیں کچھ اور بھی حد تھیں سمیٹ لائیں۔ کچھ دیر اسے ہونٹ
ہونٹوں سے لیورنگ آنکھوں سے تڑپ تڑپ کر جلتے روتا دیکھتا رہا پھر جھٹکے سے مڑ کر باہر
جبکہ وہ خزاں زدہ پتے کی مانند کانچی یونیمی روتی حال سے بے حال ہو رہی تھی۔

وہ گویا ہوتے ہی بچھ گیا تھا۔ مگر مستقیم کی آنکھوں اور دل میں بجز کتے شعلے بجھنے کے بجائے اچھا لہو کرنے لگے۔

وہ اسے لیرا کہتی تھی۔ غاصب سمجھتی تھی۔

کیا وہ ہمیشہ سے لیرا تھا؟

کیا وہ ہمیشہ سے غاصب ہی تھا؟

نہیں۔ یقیناً نہیں۔

ضروری تو نہیں کہ انسان پیدا ہونے کی فساد ہی ہو۔ قدرت نے تو ہر انسان کو معصوم بنا کر پیدا کیا ہے۔ کچھ کی فطرت میں شر ہوتا ہے مگر کچھ گنہ اور غلط راہوں پر زبردستی ڈال دیے جاتے ہیں۔ اس کا اثر بھی موخر الذکر میں ہوتا تھا۔ اسے بھی حالات کی گھٹنی، واقعات کی سفاکی نے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا۔ اپنی فطرت کی سادگی، معصومیت اور بھولپن سے دستبردار کر دیا گیا۔ نہ چاہنے کے باوجود بھی وہ معاشرے اسی طبقے اور اس کے افراد کے ناروا سلوک کا نتیجہ تھا جو آج اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا جو اسے مجرم سمجھ کر اس سے شدید نفرت میں حق بجانب تھا۔

☆ ☆ ☆

چتے ہوئے جون کی یہ ایک سخت ترین دوپہر تھی۔ سورج کا دہکتا گولہ عین سروں کے اوپر چل رہا تھا گویا تیز دھوپ کی تپش درختوں کی جڑوں تک کو بھی گرمائے دے رہی تھی۔ اس ٹپ گولی گولیاں اکثر سونی ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں کوئی اکا دکا بڑھا کسی چنے کی چھایا میں چار پائی بچھائے لیے ہوئے نظر آ جاتے تو آ جاتے۔ ورنہ مائیں اپنے بچوں کو گھروں میں گھسائے نہ صرف خود سوتیں بلکہ بچوں بھی زبردستی سلاتھیں۔ مگر وہ تو "موجو" تھا۔ جو بقول اپنی مانی ماں کے بہت ہی بیباک تھا۔ اسے شغف تھا نہ لڑنے بھڑنے سے، وہ تو بس پڑھائی کا شوقین تھا۔

اس ٹپ بھی وہ نیم کی گہری چھاؤں میں بیٹھا سکول کا کام چنار ہا تھا۔ چینیوں کے کام کا اس کی موتیوں جیسی لکھائی سے بھرتا جا رہا تھا۔ فضا میں لہو اور چٹکی کی آواز کے ساتھ مندر پر چلنے کی کریم آواز کا تاثر بھی قائم تھا۔ جس پر دھیان لگائے بنا وہ اپنے کام میں اتنی جان سے محو تھا کہ فضا میں اچانک دھول تاشوں کی آواز نے بھی اپنی جگہ بنائی اور پھر ہر آواز پر غالب آتی چلی گئی تیز سے لکھنے میں مصروف ہاتھ اسی آواز کے ساتھ ساکن ہوا تھا۔ اس نے رجسٹر سے سر اٹھا کر نظروں سے مانی کو دیکھا۔ جو ہاتھ میں موجود پنکھی بچھتے فیند کے جھونکے کی زد پر تھیں۔ اس کے چہرے پر جوش پیدا ہو گیا۔

اس نے آنکھوں سے قلم رجسٹر پر رکھا اور چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بان کی کمری چار پائی اس کی اس وحاندی کو ظاہر کرنے کو زور سے چڑھائی اور اٹھتی مانی کی آنکھ کھل گئی۔ مگر جو سرعت سے واپس بیٹھا اور سر سرور سے زیادہ جھکا لیا۔ مانی غنودگی میں تھیں۔ دو چار بار پنکھی جھلی اور پھر اٹھ گھٹنے لگیں۔ موجو نے سیک کا سانس بھرا تھا۔ اسے ہر صورت باہر جانا تھا۔ دو گلیاں چھوڑ کر آج کر مو موچی کی بیٹی کی بات آتی تھی۔ جو یقیناً اب آ بھی چکی تھی۔ آٹا صبح ہی تو اسے ناسر نے بتایا تھا۔ اس کے اکلوتے دوست نے۔

"ماں کی آنکھ بچا کر نکل لینا۔ پیسے لو نہیں گے۔"

ماں کو ہر ایسے موقع پر پیسے لوٹنے کا بڑا شوق رہتا تھا۔ ان لوٹے ہوئے پیسوں سے وہ کھنی گولیاں لے کر کھایا کرتا۔ کچے خرید کر مزے اڑاتا۔ ورنہ ماں تو "چونی" مانتے پر بھی بے دریغ دھنک کر روک دیا کرتی تھی۔ اب اس نے موجو کو بھی اس کار خیر میں شامل کر لیا تھا تو مزا کیسا دوہالا ہونے لگا تھا جیسی۔ مگر مولوی صاحب سے بیمارہ پڑھنے آیا اسے بتانے کے بعد لازمی آنے کا وعدہ لے کر ہی گیا تھا۔ مگر وہ جو پڑھائی میں مگن ہو کر ٹیکس بھول بیٹھا تھا۔ اب دھول کی آواز سن کر ہی یاد آیا تھا۔ مانی پھر سوئی تھی۔ اس نے وہ بے قدموں چار پائی کو چھوڑا اور یونہی بے آواز قدموں سے چلتا دروازہ پار کر آگیا۔ اگلے لمحے وہ ننگے سر ننگے پیر گنٹ جلتی جلتی گلیوں میں بھاگا جا رہا تھا۔

"گلیاں چار ہوئیں تو سامنے اس کا من پسند منظر اس کا منظر تھا۔ جوش و خروش سے دھول بجاتا تھا۔ سہری تاروں سے سجا سہرا باندھے سفید شلوار بونگی کے کرتے میں گلے میں نوٹوں کا بار ڈالے ہوا اور رنگ برنگے کپڑے پہنے اکڑ کر چلتے باراتی۔ گویا آج ان سے بڑھ کر کوئی اور معتبر ہی نہیں تھا۔ موجو کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہیں پیسے لانا تو نہیں دیئے گئے؟

مگر اس وقت اس کی سانسیں بحال ہوئی تھیں۔ جب باراتیوں میں سے کسی ایک نے ایک کپڑے کی قبلی کا منہ کھولا اور منٹیاں بھر ریز گاری فضا میں اچھانا شروع کی اور ایسے ہی موقع کی تاک تھا کہ سب سے منظر موجو جیسے لاتعداد بچے بچیاں اک ساتھ بچھنے۔ اور گویا ختم تھا ہو گئے۔ انہی میں موجو بھی شامل تھا۔ مگر صد افسوس وہ اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح بہت سارے سکے نہ سمیٹ سکا تھا۔ پھر وہ یہ دھول مٹی چھٹی اور افراتفری کا منظر معمول پر آ گیا۔ بچے اپنی اپنی منٹیاں اپنی جیبوں میں چھپا کر گھر کے گھروں یا پھر گاؤں کی واحد "ہٹی" (دکان) کی راہ لینے لگے۔ موجو بھی اپنی بند مٹی کے ساتھ ان بچوں کے ساتھ اسے پکارتا ہوا قریب آ گیا۔

"کتنے پیسے لوٹے؟"

وہ مسکرا کر چمکتی آنکھوں سے پوچھتا تھا۔ جواباً موجو نے کانٹے سے اچکا کر لاطمی ظاہر کی تو چہرہ نے منہی کھول کر مہینے کا اسرار شروع کر دیا تھا۔ موجود نے ازنی معصومیت سمیت منہی کھول دی۔ مگر وہ پہلے کہ وہ شمار کر پاتا۔ ناصر نے اچانک جھپٹا مارا تھا۔ ریزہ گاری اس جھٹکے کے نتیجے میں زمین پر پڑی۔ جسے ناصر نے پلک جھپکتے میں سمیٹ کر اپنے قبضے میں لیا اور قہقہے لگاتا ہوا ہوا گیا۔ یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع غیر یقین تھا کہ وہ ششدر کھڑا رہ گیا تھا۔ یہ اس کی سادگی۔ اس کی معصومیت یہ پہلا تھا جس کا طریقہ کار بعد میں وقت اور حالات کے ساتھ بدلتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

”موجو..... اوہ موجو.....“

وہ ہاتھ میں پکڑی تیل کی بوتل سمیت اچھلتا کودتا ہوا گھر کی سمت رواں دواں تھا جب اچھوٹے اسے پکارا۔ نام تو ارشد تھا مگر پیار میں اچھو ہو گیا تھا۔ ناصر تو اسے کہتا ہی اچھو تین سو دو تھا۔

”آ..... ساگ توڑنے چلیں۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔“

اس صفا چٹ جواب پر اچھو کے نتھنے پھولنے پھٹنے لگے۔

”کیوں رہے..... کیوں نہیں جائے گا بھلا؟“

”نانی اماں کہتی ہے۔ جو کام چھپ کر کیا جائے وہ یا تو گناہ ہوتا ہے یا چوری۔“

اس نے جواباً جس سنجیدگی سے کہا تھا۔ اچھو نے اسی قدر بے ڈھنگے پن سے اسے ایک چپٹا

دی۔

”چل ہے۔ بڑا آیا مولوی، ہمارا اپنا کھیت ہے۔ ہم کیوں کرنے لگے چوری۔ آ جا آم چھوٹا

کے دوں گا تمہیں۔ پسند ہیں نا؟“

دو لالچ دے رہا تھا۔ موجو کے منہ میں واقعی پانی بھر آیا۔ کتنا دل کرتا تھا آم کھانے کو۔ اس نے

کئی بار منہ کراہی سے فرمائش بھی کی تھی مگر وہ پتہ نہیں کیوں ان سنی کر جاتی تھیں۔

”گناہ تو نہیں ہو گا اچھو؟“

وہ ہنوز متذبذب تھا۔ اچھو نے جواباً قہقہہ لگایا۔

”اے کہا نہ نہیں ہو گا۔ آ جا اب۔“

اور وہ اس کی باتوں میں آیا اس کے ساتھ بولیا تھا۔ اچھو نے جی بھر کے پہلے ساگ توڑا

آموں کے باغ میں آ کر درخت پر چڑھ کر خوب کپے کپے آم توڑ کر نیچے پھینکے اور وہ اس کی

مطہق سمیٹ کر جمبولی بھرتا گیا۔ اچھو اس وقت بوکھلایا تھا جب باغ کا رکھوالا ڈانگ لہراتا ان کے سر پر پہنچا۔ اچھو تو قہقہے چوکناسرکنے میں دیر نہ لگائی کہ اسے ایسے کاموں اور چور یوں کا تجربہ تھا۔ وہ ضرور چھپا گیا تھا۔ رکھوالے نے اسے دو چار گردن میں دھریں پھر سارے آم بھی چھین لیے۔ وہ صفائیاں

”دفع ہو جا یہاں سے۔ ورنہ تیری مانی کو شکایت لگا دوں گا۔ بلکہ چل ابھی چلتا ہوں تیرے

ساتھ۔“

رکھوالے کے تیور غضبناک تھے۔ موجو کے پسینے چھوٹنے لگے۔ جیسی اگلے قدموں بھاگا تھا۔

دول اڑاتا ہوا۔ بے حد گندے کپڑے، منی سے آنے پاؤں، بدرنگ بال اور اس کی تلاش میں اس

”مستقیم، مستقیم۔“

انہوں نے چیخ کر پکارا تھا۔ وہ پہلے تو چونکا تھا۔ پھر ٹھٹھک کر ٹھم گیا۔ اسے اپنا ہی نام اجنبی لگا تھا اور اپنا باپ اپنے نام سے بھی کہیں زیادہ اجنبی۔ وہ تو نانی کی وہ بہ سے موجو ہی مشہور ہو گیا تھا۔ خلیفہ مستقیم تو بس سکول بس حاضری کے وقت آواز پڑتی اور وہ ”حضرت جناب“ کہہ کر پھر سے اس نام کو بھل جایا کرتا تھا۔ اس کے ہم جماعت بھی سارے اسے ”موجو“ ہی کہتے تھے۔ پھر یہ اس کا باپ تھا۔ گیسے کوٹ بازو پر ڈالے، شرٹ کے کف موڑے، ڈھیلی مانی، سنجیدہ چہرہ بلکہ۔ بے حد وجہ مگر کرخت چہرہ جیسا چہرہ۔ ہمیشہ کی طرح بے تحاشہ پنڈسم اور ڈھنگ تو لگ رہے تھے مگر اس کے باپ نہیں۔ انہوں نے بھی اسے پیار نہیں کیا تھا۔ انہوں نے بھی پیار سے نہیں بلایا تھا۔ مستقیم کو تو یہ بھی یاد نہیں تھا۔

”نانی اچھو کتنے مہینوں یا پھر کتنے سالوں بعد دیکھ رہا تھا۔“

”شرم نہیں آتی تمہیں؟ یہاں یہ سب کرتے پھرتے ہو تم؟“

انہوں نے اس کی کھائی بہت سختی سے پکڑ کر بہت زور کا جھٹکا دیا۔ وہ سہم گیا۔ اس کا باپ بہت

”مگر چلو۔“

پوچھتا ہوں میں تمہاری ماں اور اس کی ماں سے۔ یہ تربیت ہو رہی ہے

اسے یونہی بختی سے دبوچے وہ گھریک آئے۔ راستے میں دروازے کے آگے کھڑی اس نے اپنے باپ کی چمکتی گاڑی بھی دیکھی تھی۔ اس کی مانی کے گھر کا کڑی کا سال خوردہ دروازہ انہوں نے اپنے جوتے کی ٹھوکر سے کھولا۔ چوہے کے آگے پھونکنی سے آگے دیکھتی اس کی ماں دہل کر حڑی ہو کر شوہر کو کوتوال کے روپ میں رو بہ وپا کے ہمیشہ کی طرح اس کا دم اٹکنے لگا تھا۔

پھر ابو بہت دیر تک چٹکھڑاتے رہے۔ چیتنے اور اس کی ماں کو مانی سمیت سخت سخت دھکے دے رہے۔ اور اسی غضب میں فی الفور انہیں ساتھ لے جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ جتنا ہراساں ہو رہا تھا اس کی ماں اور مانی اتنی ہی خوشی سے پھولے نہ سانسیں۔ مانی نے لپک جھپک اسے پکڑ کر شہلا یا اور والے اچھے کپڑے پہنائے اور یہیں پہ اکٹھا نہ کیا۔ بالوں کو خوشبو دار تیل لگانے کے ساتھ اس کی گردن اور بظلوں کو مالکھ پاؤڈر سے بالکل سفید کر دیا۔ اس کا سنگھار کھل کر کے انہوں نے اسے چٹ چٹ چٹ۔ ان کے خیال میں ان کا نواسہ اب شہزادہ کتنے لگا تھا مگر اسے دیکھتے ہی مانی کے ہاتھ حراج داماد کا پارہ پھر آسمان کو چھونے لگا۔ کچھ باتیں سنانے کے بعد انہوں نے اسے پھر سے شہلا یا حکم جاری کیا۔ مانی دل مسوس کر رہ گئیں۔ جبکہ ان کے اونچے بھاجوں والے داماد صاحب کتنی دیر بھی بڑبڑاتے رہے۔

”امحق جاہل عورتیں! پتہ نہیں کہاں پھنس گیا ہوں۔ اتنا بھی نہیں پتا تیل نہانے کے بعد پیلے لگا یا جاتا ہے۔“

وہ کتنی دیر فلسفے رہے۔ اور موجد۔ اس کا خون خشک اور پتہ پانی ہوتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر سب کچھ بدل گیا۔ اس کا ماحول، اس کا گھر، اس کا اسکول بھی، پہلے وہ شہلا یا قیصر کے کپڑے کے تیلے میں کتابیں ڈال کر گلے میں لٹکا کر سکول جاتا تھا۔ ہاتھ میں تختی تھماتا ہوا۔ اب ٹیکر شرٹ میں ملبوس، تلمین بیگ کا اندھوں پر لٹکا کر اپنے باپ کی شاندار گاڑی میں انگلیش میڈیم جانے لگا۔ وہ خوش تھا۔ مطمئن بھی۔ ہر طرح کے زندگی میں مزے تھے۔ بس اس کی جان اب اسے تھی۔

اس کی ماں اس کے جتنے اڈاٹھاتی تھی۔ ابو اسی قدر کھینچ کر رکھتے۔ سب کچھ بدل چکا تھا۔ باوجود کچھ تبدیلی نہیں ہو۔ کا تھا تو وہ اس کے مزاج کا بھولپن اور حماقت کی حد تک سادگی تھی۔ بھی بہت آسانی سے بے وقوف بن جاتا تھا۔ اسے آج بھی بہت آرام سے دھوکا دیا جاسکتا تھا۔ شرارت یا غلطی کیس اور کی ہوتی کہیں اس پر ڈال کر پکڑوا اسے دیا جاتا۔ اسی سادگی اور بھولپن

سے وہ بہرحال نام سے مشہور ہونے لگا۔ بچپن سے اتنی بار اسے ہاتھ لگے تھے مگر اس کی فطری سادگی بچوں کی توں تھی تو اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ اسے کوئی بڑا آدمی کہ بڑی ٹھوکر بھی کھانا تھی۔

☆ ☆ ☆

”خلیفہ صاحب کدھر جا رہے ہیں؟“

جتنے کا دن تھا۔ وہ نہائے دھوئے سفید کرتا شلوار پہنے نکھرا سٹرا مچن میں پھر رہا تھا۔ کہ کچھ دیر میں ابو نے آکر اپنے ساتھ اسے جمعہ کی نماز کے لیے مسجد لے جانا تھا۔ جب ہمسائے کی دیوار سے یہ کاسر برآمد ہوا۔ اسے چھیڑنا وہ گویا اپنا فرض سمجھتی تھی۔

”بھئی داد۔ بڑا لشک رہے ہو۔“

وہ اس کا مذاق اڑانے لگی۔ مستقیم نے خائف سی نظروں سے اسے دیکھا اور رخ پھیر کر اپنی کتاب کھول لی۔ ابو کے آنے کا تاہم تھا۔ وہ سعد یہ کو اس سے بات کرتا دیکھ لیتے تو اس کی خیر نہیں تھی۔ لڑکھو ابھی شک کرنے کی عادت تھی ان کی۔

”اونبہ۔ بڑے پڑھا کو ہوناں۔ جیسے بڑے ہو کر ڈی سی سی لگ جاؤ گے۔ بابا بابا۔“

وہ ہلکی تھی۔ پھر امی کو زور سے پکارنے لگی۔

”خالہ۔ خالہ۔ سبز مرچیں ہیں تو دینا۔ امی مانگ رہی ہیں۔“

امی بچن میں تھیں۔ اس پکار پر سبزی کی نوکری اٹھاتے باہر آ گئیں۔

”ہیں تو کسی بیٹا! ادھر سے آ کے لے جاؤ۔ میں نکال دیتی ہوں۔“

انہوں نے اپنے مخصوص نرم خوانداز میں جواب دیا تھا۔ اس جواب پر سعد یہ کے چہرے پر اطمینان اتر آئے۔ لہجے اس کا سر دیوار سے غائب ہو چکا تھا۔ دوبارہ بچن کی جانب مڑتیں امی برآمدے کی پھر پر رکھے کیڑوں کی نوکری پر نگاہ پڑتے تھم سی گئیں۔

”یہ مالنے تو کھا لیتے بیٹے اکل سے پیچھے لگی ہوں تمہارے۔“

کھانے پینے کے معاملے میں اس کی یہ لاپرواہی امی کو بالکل پسند نہیں تھی۔ انہوں نے نوکری کو اس کے سامنے رکھی۔ ساتھ میں خالی پلیٹ چھری اور ایک ننھی سی شیشے کی کنوری میں کالی مرچ ملا رکھا تھا۔ وہ فرمانبرداری سے کتاب بند کر کے مالنے پھیلنے لگا۔ تب ہی بیرونی دروازہ کھول کر سعد یہ کھانے آ گئی۔

”اکیلا اکیلے ہی مزے اڑا رہے ہو۔ کبھی کسی اور کو بھی صلاح مار لیا کرو۔“

کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسے گلے سے لگا کر پیار سے تھپکا۔

”کیوں فکر کرتا ہے میرے چاند! میں سب جانتی ہوں۔ تجھے بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔“ وہ اس کی بیٹی آنکھیں چوم رہی تھیں۔

”قسم سے امی۔“

”مستقیم بیٹا ماں کو وضاحتیں کیوں دیتے ہو؟ پیٹ کا جتنا ہے تو میرا۔ جانتی نہیں ہوں بھلا تجھے؟“ انہوں نے پھر سے خود سے بھینچ لیا۔ مستقیم کے اندر انوکھا سکون انوکھی سرشاری سرایت کر گئی تھی۔ وہ مطمئن ہو گیا تھا اور سمجھتا تھا دنیا جتنی بھی ظالم اور بے باک کیوں نہ ہو۔ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کے پاس اس کی ماں تھی۔ وہ ہر لحاظ سے محفوظ و مامون رہے گا۔ مگر سب ہمیشہ ویسا ہی تو نہیں ہوتا جو ہم سوچتے ہیں۔ دنیا نے اسے ڈس لیا تھا۔ اس کی ماں کی موجودگی کے باوجود، بلکہ اس سارے نسلان میں اس کی ماں کا بھی حصہ نکل آیا تھا۔ جو اس کی جمولی میں آکر گرے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ سکول سے کالج میں آیا تو اس کا قد سوا چھ فٹ سے بھی زیادہ ہو چکا تھا۔ اس کی گندمی رنگت اور بڑی بڑی سحر طراز آنکھوں میں کچھ تو ایسا تھا کہ لڑکیاں دیوانہ وار اس کی جانب کھینچتی تھیں۔ لیکن وہ کسی کو بھی دیکھ نہ کہہ سکا کہ اس پر تو ہر وقت ہی ابو کا ہوا سوار رہتا تھا۔ جب ہی ابو کی پیٹھ پیچھے بھی کسی لڑکی کے نزدیک پھٹکننا گوارا نہ کرتا۔ بلکہ اس نے تو دبے لفظوں میں امی سے کہا بھی تھا۔

”مجھے کو ایجوکیشن میں نہیں پڑھنا۔ آپ ابو سے کہیں نا مجھے بوائز کالج میں بھیج دیں۔“

امی نے سنا تو افسردگی سے مسکرانے لگی تھیں۔

”کیا حرج ہے بھلا بیٹے! مقصد تو تعلیم حاصل کرنا ہی ہے نا۔ تمہارے ابو میری کہاں نہیں گئے۔“ اور اسے خاموش ہو جانا پڑا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ اس کی ماں سا لہا سال گزر جانے کے باوجود اس کے باپ کے دل میں ذرا سی بھی جگہ حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ اس کے باپ کی خالہ زاد تھیں۔ اور اس کے باپ کی نہیں دادی کی پسند تھیں۔ اس کا باپ عبدالماجد شاید کسی اپنے جیسی حسین طرہ دار عورت کو پسند کرتا تھا۔ جب ہی اس کی ماں کو اس نے نہ کبھی عزت سے نوازا نہ ہی محبت کے قابل سمجھا۔ جب بھی مخاطب کیا طنز حقارت اور نخوت سے۔ ایک جھگڑا ہوتا اور اس کی ماں کئی کئی مہینوں تک نانی کے گھر بھیج دی جاتی۔

اس ادھر ادھر کے چکروں میں اس کی تعلیم کا اتنا حرج ہو رہا تھا۔ چنانچہ نانی نے اس کا بھلا سوا چھا

اس نے اس کا چھپا ہوا مالنا اچکا اور کھاتے ہوئے اسے لٹاڑنا ضروری سمجھا تھا۔ مستقیم کی اس بے تکلفی ایک آنکھ نہیں بھائی مگر کبھی جتا یا نہیں تھا۔ اس وقت بھی سر جھکائے اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔

”خال! اسے تو زاسا مرد بنائیں۔ کیسی زنانیوں والی عادتیں ہیں۔ نظریں جھکائے ہر وقت گھر چل مھینتا پھرتا رہنا ہے۔ اس بچارے کو پتہ ہی نہیں دنیا میں کیسی کیسی خوبصورتیاں بھری پڑی ہیں۔“ امی کی آمد سے ان کے ہاتھ سے ہری سرچوں کا لفافہ پکڑتی وہ منہ سے ”پھر“ کر کے بچھ کر صاف سترے چمکتے فرش پر گراتی لٹھ مار انداز میں بولی تھی۔ مستقیم کا چہرہ جانے کس احساس کے سرخ پڑ گیا۔ وہ مستقیم سے صرف ایک سال بڑی تھی۔ مگر باا کی تیز طرار چلتی پڑھ تھی۔ وہ چاہتا تھا اسے پسند کرتی ہے۔ اس پر ڈورے ڈالتی جب ناکام ہوئی تھی اس طرح سے بات بے بات شروع کر دیا تھا۔ مستقیم کا قد کاٹھ باپ پر پڑا تھا۔ وہ پندرہ سال کی عمر میں چھ فٹ سے زیادہ قد چکا تھا۔ بھرا بھرا مضبوط جسم خوب چہرا اسے اپنی عمر سے دس سال آگے لے جا کر دکھاتا تھا۔

باپ کی جوانی کی تصویر تھا۔

”بچہ ہے نا ابھی۔ بڑا ہو گا تو خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔“

امی نے رسان سے جواب دیا تھا۔ مگر لہراتی دوپٹے کے پلو کو انگلی سے لپٹتی ہتھکیوں سے سختی سے کوا می کی یہ بات ہنسن بن کر لگی تھی۔

”بچہ۔“

وہ ڈرامائی انداز میں چیختی۔ پھر بے تحاشہ ہنسنے لگی۔

”خال! تو بھی بھولی ہی رہی۔ گنوں کا پورا ہے تیرا یہ چھٹکا۔ لائن مارتا ہے مجھ پر۔“ وہ تو

بات کر جولت نہیں کراتی۔ ارے شادی تو ہو جانی ہوتی ہے۔ ہم کیوں ایسے دیوانے کریں۔“

وہ ہنس کر کہہ رہی تھی۔ آنکھیں کیسے ملکتی تھیں۔ مستقیم تو صرف ششدر نہیں ہوا تھا۔ پتھر ا بھی گیا تھا۔ امی نے سعد یہ کو کیا کہا وہ اس صدماتی کیفیت کے باعث سننے سے قاصر رہا جیسے یقین نہ آتا تھا کوئی لڑکی اتنا بھی گر سکتی ہے۔

”امی۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ جھوٹی ہے۔ محض بکواس کرتی ہے۔ م۔۔۔ میں۔۔۔“

شدت غیض اور غم نے اس کا گلہا ہی نہیں آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر دی تھیں۔

ان کی ذات سے بے رنجی اور مخفی ختم نہیں ہوتی۔

ایکایک، غیر محفوظ ہونے کا احساس انہیں دل سے جسنے نہیں دیتا اور آئی ایم شیور عبدالمجید کہ تم اپنے بیٹے کے لیے ہرگز ہرگز ایسا نہیں چاہو گے۔

ان کی بہن ان کی سوچ کا دردا کر گئی تھی اور وہ مستقبل کے آئینے میں مستقیم کو دیکھ کر واقعی لرز اٹھے۔ جو بھی تھا۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ گویا ان کا سب کچھ وہی تھا۔ اسی باعث وہ جا کر بیوی اور بچے کو گاؤں سے لے آئے۔ مگر ایسا کرتے ہوئے وہ یہ یکسر بھول گئے تھے کہ بیٹے کی شخصیت کو مضبوط بنانے کے لیے انہیں اپنی روش، اپنا انداز بھی بدلنا چاہیے۔ اور انہیں پتہ بھی نہ چلا۔ ان کا بیٹا اگر کرپٹ انسان نہیں بناتا تو وہ ضرور رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ تقریباً ایز میں تھا جب اس کی ایک کلاس فیلو شریہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔ اس کی سمجھ میں قطعی نہیں آتا تھا کہ شریہ نے اس میں ایسا آخر کیا دیکھ لیا تھا جو اس طرح مقناطیسی کشش کے زیر اثر ان کی جانب ہلکتی تھی۔ وہ جتنا بدکٹا شریہ اسی قدر اس میں انوالو ہو رہی تھی۔

”نچو سے دوستی کر لو شائے ہوئے۔“

وہ کلاس سے نکلا تو کلفٹن میں آ گیا۔ ابھی کرسی کھینچ کر بیٹھا ہی تھا کہ اس کی راہ میں جانے کب سے آگئیں۔ بچائے بیٹھی شریہ اس کے پیچھے چلی آئی اور بنا اجازت اس کی ساتھ کی کرسی تھپت کر بیٹھی۔ اس پر جب کہ جس بے ہاکی سے آنکھ دبا کر بولی تھی وہ انداز مستقیم کو بوکھلا کر رکھ گیا۔

ٹنگ جیز پر وہ سفید چکن کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنے تھی۔ جس کے گریبان کے اتنے جن کھلے تھے کہ بھولی جتنی بھی نگاہ اٹھا کر مستقیم کے اوسان خطا ہونے لگے۔ شریہ کا باپ مل اور تھا۔ وہ اکلوتی اولاد کی بڑی اولاد تھی۔ جو کپڑوں کی طرح گاڑیاں بدلنے کی عادی تھی۔ کالج کے سارے لڑکے اس کے دیوانے تھے جبکہ وہ مستقیم پر مرقی تھی۔

”کچھ بولناں۔۔۔ تمہاری آواز بھی تمہاری طرح فسی ٹنگ ہے رٹلی۔“

”سب باکی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی تھی۔ مستقیم کرسی پر یوں اچھلا جیسے بچھونے ڈنگ مار دیا۔“

”جیسے کسی بھی لڑکی سے دوستی نہیں کرنی۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں؟“

”اگلی قدر عاجز ہو کر کہہ رہا تھا۔ اور شریہ اپنا قبضہ بھی دبا نہیں سکی تھی۔ اسی بلند مردانہ وار قبضہ

اور اس کا مستقل داخلہ گاؤں کے ہی سکول میں کرادیا۔ ابو نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ شاید انہیں بھی اس کے ساتھ بیٹے سے بھی کسی قسم کی انسیت پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ مگر ان کے طرز عمل کو دیکھتے ہوئے ایک بار ان کی بہن نے انہیں ضرور سمجھایا تھا۔ وہ نہ صرف پڑھی لکھی تھیں بلکہ عمر میں عبدالمجید سے بڑی تھیں۔

”تم نے اپنی زندگی کا کیا فیصلہ کیا ہے عبدالمجید؟“

اور ان کے سوال پہ وہ سخت مایوسی کے عالم میں انہیں کھتے سر آدھ بھر کے رہ گئے۔

”مجھے بھلا اب کیا فیصلہ کرنا ہے آپا فیصلہ تو اماں کر چکی تھیں برسوں قبل۔“

ان کا لہجہ بچھا ہوا بے دلی کا نمازہ تھا۔

”مگر اماں تو کب کی وفات پا چکیں عبدالمجید! مگر مت بھولو کہ تم نے تب زبردستی کسی مگر

فیصلہ تسلیم کیا تھا۔ پھر اب بیوی بچے کو کیوں سزا دے رہے ہو؟“

سوال کڑا تھا اور وہ برداشت نہ کرنے کے مادی۔ جسبی حسب عادت چیخنے اور پھنکارنے لگے۔

”سزا تو میں کات رہا ہوں۔ ایسی جاہل عورت پلے باندھی ہے میرے۔“

”سعیہ ان پڑھ ضرور ہے عبدالمجید! مگر کچھ دار عورت ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر تمہارا

کی ماں ہے۔ کس ماحول میں لاوارثوں کی طرح چھوڑا ہوا ہے تم نے اپنے بیٹے کو؟ جانا ہوا تھا

یقین کر و مستقیم کو دیکھ کر میں تو اسے پہچان بھی نہیں سکی۔ بہت دکھ ہو رہا ہے مجھے یہ کہتے ہوئے

تمہارا بیٹا تو کہیں سے لگتا ہی نہیں ہے۔ پوری طرح اسی ماحول میں رچ بس گیا ہے۔ وہ

تمہاری ہی اولاد ہے عبدالمجید! تمہیں اس بات کا تو خیال کرنا چاہیے۔ پڑھے لکھے ہو کر بھی

اس بات کی سمجھ نہیں کہ ماں باپ کی لڑائی سے بچوں پر کتنے غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

شخصیت نوٹ پھوٹ کا شکار ہو جایا کرتی ہے۔

ایسے بچے جن کو والدین کی طرف سے سپورٹ حاصل نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنی بھائی بھائی

لیے ہر سچ اور غلط راہی زندگی میں اپلائی کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ دیوبھی ہو سکتے ہیں

معاشرے کے کرپٹ انسان بھی۔ تمہارا بچہ ابھی چھوٹا ہے مگر اتنا بھی چھوٹا نہیں کہ وہ اپنے

انداز نہ ہوتے ہوں۔ وہ پیار اور نفرت کو۔۔۔ جلدی مارک کرتا ہوگا۔

اگر خدا نخواستہ حالات ایسے ہی رہے تو وہ اپنی عمر سے بہت پہلے کم سنی کو پھلانگ جائے گا

ایسے بچے جو کم سنی سے یکدم عمر رسیدگی میں چلے جائیں۔ ان کی زندگی میں اگر سب کچھ

نے خلیفہ مستقیم کو کتنا نروس کر ڈالا تھا۔

"کم آن یار! کیسی دقیا نوی باتیں کر رہے ہو تم؟ کو ایجوکیشن میں پڑھ رہے ہو تم۔" وہ جیسے سمجھا رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اسے بے حیائی، بے باکی کا سبق پڑھا کر اپنی لائن پر لا رہی تھی مگر مستقیم کے اندر کا خوف، تربیت کا اثر بہت گہرا تھا۔ جیسی بہت صفائی سے ہر بات سے صبر کرتے ہوئے اٹھا۔

"میری کلاس کا ٹائم ہو گیا ہے۔ چلتا ہوں۔"

وہ جان چھڑا کر بھاگا مگر کب تک۔ شمرینہ جان چھوڑنے والی ہی تو نہیں تھی۔ جیسی اس کے پھر اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔

"سنو مستقیم! اپنا سیل نمبر تو دو یار مجھے۔ کبھی کام ہی پڑ جاتا ہے۔"

وہ اس میدان کی ماہر کھلاڑی تھی۔ ٹیم کھیلنے اور جیتنے کے بہت سے طریقے اذہر تھے اسے۔

"مگر میرے پاس تو موبائل نہیں ہے۔"

مستقیم نے گو کہ جھوٹ نہیں بولا تھا۔ مگر شمرینہ کو پھر بھی یقین نہیں آتا تھا اور مستقیم جو سوچ رہا تھا اسی کے ذریعے ابو سے سیل فون کی فرمائش کرے گا۔ ارادہ تبدیل کر دیا۔

"مجھے نمبر نہیں دینا چاہتے ہونا اس لیے۔"

شمرینہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اور مستقیم کو بڑی مشکل سے اسے یقین دلانا پڑا تھا۔ بات نہیں۔ وہ پتہ نہیں کس حد تک کامیاب ہوا مگر یہ معاملہ بہر حال پننا نہیں سکا تھا۔

"یہ لو۔ پلیز اب انکار مت کرو دینا۔ تمہاری بجائے میں کسی اور کو دیتی تا تو باجھیں کھٹے تھے کی۔ مگر تم دنیا کے اک ہی نمونے ہو۔"

"وہ دن بھی سکون سے نہیں گزرے تھے۔ جب شمرینہ اسے خوبصورت پیکنگ میں اپنے فون بطور گفٹ اسے دینے پر کمر بستہ ہو گئی تھی۔ مستقیم تو شپٹا گیا تھا۔ اسے ہرگز سمجھ نہیں آتی تھی۔

گلے پڑی بلا سے کیسے جان چھڑائے۔

"آئی ایم ساری! دیکھو شمرینہ! میں یہ نہیں رکھ سکتا۔ مگر سے پریشان نہیں ہے نا۔"

تو بہت ڈانٹیں گے۔

وہ پتھاری سے بولا تھا۔ شمرینہ اسے بے دریغ گھورنے لگی۔

"اچھا بس۔ اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ اتنے ہی جتنے تم ننھے بچے ہونا کہ ہر بات

سے علم میں آ جائے گی۔ منج کر لینا تا یار! باتیں کریں گے رات کو چپکے چپکے۔ کال میں کروں گی فکر نہ کرو۔ بلکہ کریڈٹ بھی تمہیں ڈلوادیا کروں گی۔ اب رکھ بھی لو۔"

وہ آنکھ مارتی ہوئی پھر اسے اپنی ڈگر پہ کھینچ رہی تھی۔ مستقیم نے اسے گھورتے ہوئے شدد سے سرکونی میں بلایا اور بے حد سختی سے گویا ہوا تھا۔

"مختصر مگر شمرینہ بٹ! میں معذرت خواہ ہوں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ نہیں رکھتا اور سنیں آئندہ مجھے اس قسم کی آفرز بھی نہیں کیجیے گا۔ شکریہ۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ مضبوط قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ مگر شمرینہ کو اس کی اس اپنے دفاع میں کی گئی بات میں سراسر اپنی توہین اور سبکی محسوس ہوئی تھی۔ جیسی وہ بہت شعلہ باز نظروں سے اسے تب تک دیکھتی رہی تھی۔ جب تک وہ نظر آتا رہا۔ کوئی نہیں جانتا تھا وہ اس توہین کا بدلہ کیسے لینے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

ابو نے اسے ایف اے کا ایگزیم کلیر کرنے پر کالج آنے جانے کے لیے بائیک لے کر دی تھی۔ جو آن کل مسئلہ کرنے لگی تھی پتہ نہیں کیوں۔ چھٹی کے بعد وہ بائیک اشارت کرنے کی کوشش میں پسپے پسپے ہو رہا تھا۔ جیسی نسوانی ہنسی کی جھنکار پر چوٹا اور شمرینہ کو رو رو پا کے خفیف بھی ہو گیا۔ ایسے بڑے اور معروف تعلیمی ادارے میں دو سال پرانی بائیک وہ بھی ایسی جو اشارت ہونے میں گھنٹہ بھر لگاتی ہو یہاں مذاق کا ہی باعث بن سکتی تھی کہ یہاں تو سب ایک سے بڑھ کر ایک مالدار گھرانے سے تعلق والا ہی آتا تھا۔

"یہ اشارت نہیں ہوگی چند سم! میرے ساتھ آ جاؤ۔ کر دوں گی ایمانداری سے ڈراپ۔"

وہ پرکشش آفر کر رہی تھی جو ظاہر ہے مستقیم کو قبول نہیں تھی۔ جیسی دھیان دیئے بنا اپنے کام میں مگن رہا اور بالآخر کامیاب بھی ہوا تھا۔ وہ زن سے اس کے قریب سے بائیک لے اڑا۔ وہ کینہ تو ز نظروں سے اڑتی دھول کھتی رہ گئی۔

"کب تک بچو گے آخر خلیفہ مستقیم؟"

نئے سرے سے ہونے والی تذلیل نے اسے تھلا کے رکھ دیا تھا اور اسے یہ موقع مل بھی جلدی گیا تھا۔ یہ اس سے ٹھیک ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔ جب صین رم جیم برستے موسم میں شمرینہ نے جان بوجھ کر اپنی کاری کا دائرہ بگڑا دیا اور چہرے پر پریشانی کے آثار لیے اس کے راستے میں کھڑی ہو گئی۔ یہ ماما کا نام اس نے مستقیم کو گھیرنے کو انجام دیا تھا کہ جانتی تھی وہ کالج لائبریری میں نوٹس بنانے میں

مصرف موسم کی خرابی کے باعث کالج کے جلدی آف ہو جانے سے بے خبر ہے۔ جب تک وہ آگے ہوا اور اپنی کتابیں سمیٹا باہر آیا کالج سارا خالی اور شمرینہ اپنا جال پھیلائے اس کی منتظر تھی وہ عجیب و غریب قدموں سے چلتا بارش کے پانی کو جھارتا بایک کے پاس آیا تو شمرینہ نے بڑی عاجز اور بے بسی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”مستقیم میری گاڑی خراب ہو چکی ہے۔ میں جانتی ہوں تم مجھے پسند نہیں کرتے مگر اس موسم میں اخلاقی طور پر تو مدد کر سکتے ہو نا میری۔“
وہ کتنی ہمتی ہو کر کہہ رہی تھی۔ مستقیم چونکا۔
”سوری۔۔۔ میں آل ریڈی لیٹ ہو چکا ہوں۔“

وہ اتنا ہی محتاط تھا کہ مدد کرنے پر بھی آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ جانتا تھا اگر کسی جاننے والے نے اس کے ساتھ کسی لڑکی کو بیٹھے دیکھ لیا تو اب اس کا سر منجا کر دیں گے جو تے مار مار کر۔ شمرینہ کو اس سے رکھائی کے مظاہرے نے گویا آگ لگا دی مگر بظاہر سکون اور نرمی سے اصرار جاری رکھا۔
”تم صرف مجھے مال تک چھوڑ دینا۔ وہاں سے میں رکش یا ٹیکسی خود کر لوں گی۔ پلیز۔۔۔“
اس کے کچھ بولنے سے قبل ہی شمرینہ اچک کر اس کے ساتھ بایک پر سوار ہو گئی۔ مستقیم نے طرح جزبہ ہوا تھا۔

”دیکھو۔۔۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ ڈبل سواری پر پابندی ہے۔ میرا چالان ہو سکتا ہے۔“
”اتنا کیوں ڈرتے ہو تم؟ چلو تو۔۔۔ اگر کچھ ہوا تو میں خود بھگت لوں گی۔ ڈونٹ وری۔“

وہ بے فکر۔ بے پن سے بولی۔ اب مستقیم کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا سوائے بایک اسٹاپ کرنے کے مگر بہت جلد اسے اندازہ ہوا وہ بری طرح پھنس چکا ہے۔ شمرینہ شاطر تھی۔ اور راہ سے ہٹ کر ہوئی بھی۔ ایسے لوگ اپنا مقصد حاصل کرنے کو گناہ و ثواب میں فرق بھلائے رکھتے ہیں۔ مستقیم اسے پسند تھا جو ہر کوشش کر لینے کے باوجود حاصل نہیں ہوا تھا۔ آج ہاتھ لگا تھا۔ وہ دل کے جانے کون کون سے ارمان نکال لینا چاہتی تھی۔ پہلے اس کا ہاتھ مستقیم کے کاندھے پر لگا پھر سر رکھا ہوا ہاتھ اور بازو کے گرد مائل ہو گیا۔ درمیانی فاصلہ سمٹا تھا اور وہ بھری ہوئی شاہراہ پر اس کے ساتھ چمکی جاتی تھی حالانکہ اس کی ہر فضول جنبش اور حرکت پہ مستقیم اسے ڈانٹتا اور انسانیت کے ساتھ شرافت کے چلنے میں اسے کو غصے سے بولتا رہا۔ مگر وہ کہاں سن رہی تھی اس کی۔ مستقیم کے ضبط کی انتہا ہوئی تو جھٹکے نیک روک دی۔

اب یہ اس کی قسمت کا چکر تھا کہ شمرینہ کو دھتکار تے اور جھکڑتے اسے کچھ فاصلے پر ٹریفک پولیس کا نشیلا کی موجودگی کا احساس نہ ہو سکا تھا۔ شمرینہ کے ایک اشارے پر پولیس والا چراغ کے جھنکے کی طرح حاضر ہوا تھا۔ پھر صورتحال بدلتے دیر نہیں لگی۔ وہ تو شمرینہ کا رنگ ڈھنگ دیکھتا ہی ششدر ہونے لگا تھا اپنی صفائی میں کیا بولتا۔ جو اس پر الزام رکھ رہی تھی کہ وہ اسے بہکا کر ساتھ لے جا رہا ہے۔ رائی کا پہاڑ کیسے بنتا ہے یا عورت کیسے اپنے فریب سے کسی کو پھانستی ہے یہ اس وقت خلیفہ مستقیم کو پتہ چلا تھا جب پولیس نے اس سے بایک کی چابی چھینی اور اسے گردن سے پکڑ کر پولیس موہل میں پھینکا وہ چکرایا ہوا تو تھا ہی دن میں تارے بھی نظر آنے لگے۔

☆ ☆ ☆

وہ شمرینہ کی اٹھاؤ میں جا کر اٹھا۔ جیسے ابو ہی اسے حوالات سے چھڑا کر لائے تھے۔ انہوں نے سچ بچے تو جوتے نہیں مارے مگر جو سنائی تھیں وہ جوتوں سے زیادہ ذلت آمیز احساس سے دو چار کرنے کو کافی تھیں۔ وہ اس کی پڑھائی چھڑا دینے کے درپے ہو گئے تھے۔ اس کے بایک چلانے پہ پابندی۔ اندکری۔ اسے صفائی اور وضاحت کا کوئی موقع دیئے بغیر انہوں نے آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کیا تھا جو وہاں سے رپورٹ سننے کو ملی تھی اور جس کا حرف حرف جھوٹ پر مبنی تھا۔ پھر یہ امی کی محنت، محنت ہی تھی کہ اس کو کالج پھر سے جانے کی اجازت مل گئی۔ البتہ بایک کو ہاتھ لگانے کی انہوں نے پرمیشن نہیں دی تھی۔

”خبردار۔۔۔ نام مت لینا اس لفر کے لیے بایک کا۔ نام ڈبوئے گا یہ ہمارے پرکھوں کا بھی۔ دیکھ لینا۔“
”پورے دعوے پورے یقین سے کہتے۔ وہ گڑھ کر رہ جاتا۔ کالج میں بھی اب بسوں کے اٹنے کھاتے جاتا تھا۔ جس سے اکثر اسے واپسی میں دیر ہو جاتی کہ آئے دن کی ٹریفک ہڑتالوں کے باعث اسے انت کی خواری سہی پڑتی۔ شام کو تھکا ہارا گھر لوٹتا تو اب اس سے پہلے گھر آچکے ہوتے اور اس کے لیے پریشان پھر تیں بار بار دروازے سے جھانکا کرتیں۔“

”تو کیا اشتہار یا۔ کارنامے انجام دے کر۔“

وہ اس کی شکل دیکھتے ہی اب اس قسم کے فرمودات سنایا کرتے۔ اک بار کا جیل جانا چاہے وہ جیل گاہ ہی سہی مگر اسے اشتہار دینے کا ٹائل چسپاں کر گیا تھا۔ ابو کو تو وہ کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ البتہ شمرینہ کے لیے اس کے دل میں موجود نفرت دن بدن فروزاں ہوتی جا رہی تھی جس کی بدولت وہ ایسے شخص کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے گر گیا تھا جس میں دوبارہ پہلا مقام حاصل کرنا مشکل ہی نہیں

ناممکن بھی تھا۔ جیسی اس کا رویہ کالج میں شریہ کے لیے مزید سختی، مزید جنگ سمیٹ لایا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس روز وہ اس لیے بھی لیٹ گھر پہنچا تھا کہ اسے لائبریری سے کچھ کتابیں ایٹو کروانی تھیں۔ جبکہ امی کو کسی شادی میں شریک ہونا تھا۔ اسے خصوصی تاکید کی تھی جلدی آنے کی مگر وہ سرے سے بھول چکا تھا۔ مقررہ وقت سے دو گھنٹے لیٹ گھر پہنچا تو امی چٹابی سے منتظر تھیں۔

"تم فریش ہو کر کھانا کھا لو بیٹے! پھر جیولر سے میری جوڑیاں لا دیتا۔ آپا کے صبح سے دو قون آ چکے ہیں لیکن میں جاتی کیسے جوڑیوں کے بغیر۔"

اور وہ جی بھرے شرمسار ہونے لگا۔

"آپ رسید لائیں۔ میں پہلے جوڑیاں لاتا ہوں۔ کھانا آ کے کھا لوں گا۔"

وہ بیک اتار کے رکھتے ہوئے مستعد ہوا۔ مگر امی نے ٹوک دیا تھا۔

"ایسی بھی جلدی نہیں ہے بیٹے! تم کپڑے بدل کے کھانا کھا لو۔ پھر جانا۔"

مستقیم نے سر ہلا دیا۔ وہ کپڑے بدل کر آیا تو سعد یہ موجود تھی۔ اسے بڑی خصوصی نظروں سے دیکھا اور ذوق منی فقرے اچھالتی رہی۔ مستقیم کے پاس اس کی ساری بے باکیوں کا ایک ہی حل تھا۔ خاموشی اور انداز میں وہ کچھ دیر قہقہے لگاتی اور اسے متوجہ کرنے کے جتن کرتی رہی پھر تھک ہار کے چلی گئی۔

"بچوں کی تربیت ماؤں کی ذمہ داری ہوتی ہے اور آج کل کی ماؤں کو فرصت ہی کہاں ہے جب دیکھو یہ لڑکی فضول میں غصے لگا رہی ہوتی ہے۔ بی بی۔ غمی غمی۔ نان سنس اور سنوٹم ڈراماں موجودگی میں ادھر ادھر ہو جایا کرو۔ یہ گھر ہے میرا میں اسے لو اپنا نہیں بنانا چاہتا۔"

ابو نہا کر آ گئے تھے۔ اور رواں تمبرہ جاری تھا۔ مگر جب مستقیم کو بھی خواہ مخواہ گھسیٹا تو وہ ہٹا ہٹا بلبلایا مگر سر اونچا نہیں کر سکا۔ امی کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد انہیں دونوں کو کھانا لگنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ ان کے ساتھ ہی اٹھ کر ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ کرسی چھیننے چپ چاپ بیٹھ گیا مگر ابو کی تیوری سالن کے ڈونگے کا ڈھکن ہٹاتے ہی چڑھ گئی تھی۔

"یہ کیا پکایا ہے؟"

وہ خشکیں نظروں سے امی کو گھور رہے تھے۔ جوں جوں میں حواس باختہ نظر آنے لگیں۔

"آلو منتر ہیں۔"

وہ منمنائیں۔ ان کی زرد رنگت کو نکلتے مستقیم کو ان پر جی بھر کے ترس آنے لگا۔ وہ وہی

میں اب بھی منصوبے بنانا تھا۔ انہیں ابو کے تسلط سے چھڑا کر دنیا بھر کے سکھ اور خوشیاں مہیا کرنے سے منصوبے جو وہ اپنے بچپن سے بنا رہا تھا۔ اب وہ سوچتا وہ کسی اچھی لڑکی سے شادی کرے گا جو اس سے گھر کو جنت کا ایک ٹکڑا بنادے۔ پھر وہ اس جنت میں اپنی ماں کے ساتھ کتنی آزادی سے رہے گا اور اپنی آپا کا یہ بھی پڑنے نہیں دے گا۔ اسے ابو سے اتنی ہی بیزاری اور چڑھائی تھی۔

"گتا ہے مڑ ڈالنا بھول گئی تھیں جاہل کم عقل عورت۔"

ان کی فراہت مستقیم کو خوابوں کی حسین نگری سے حلقہ حقیقت میں واپس کھینچ لائی۔

"میں نے تو دونوں سبزیاں برابر کی ڈالی تھیں۔"

امی۔ عم رو ہانسی آواز میں وضاحت دے رہی تھیں مگر پھر بھی قبر ٹوٹ پڑا تھا۔ انہوں نے پیش میں ڈالنا اٹھ کر دیوار سے دے مارا تھا۔

"ہاں برابر کی ڈالی تھیں۔ ایک آلو۔ ایک منر۔ پاگل سمجھا ہوا ہے تم نے مجھے بد صورت بد

لیکھ عورت! آگے سے بھوسا کرتی ہے۔ اتنے سال ہو گئے تمہیں اس گھر میں آئے۔ ابھی تک پتہ

نہیں چل سکا۔ مجھے کیا پسند ہے۔ میں کیا کھانا چاہتا ہوں تو لعنت ہے۔ ہاں پر۔"

ان کا من نہ چلتا تھا وہ امی کو کچا چبا ڈالیں۔ وہ قہقہہ کا پتہ نہیں اور ان کا موڈ بحال کرنے سے جن میں مسرور تھیں۔ کبھی کچھ پیش کرتیں کبھی کچھ۔ ایسے میں مستقیم ٹیبل سے بھوکا اٹھ گیا اور اس کے دل اور باپ دونوں المم رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

اور جب وہ رسید ہاتھ میں لیے شہر کے مشہور جیولر کی روشنیوں سے جھکاتی دکان میں داخل ہو رہا تھا تو اس کے بائیں سامنے موجود ڈیپارٹمنٹل سنور سے نفی شریہ کی نظر اس پر پڑ گئی تھی۔ جب وہ غیر محسوس انداز میں اس کے پیچھے آئی۔ تب تک تو محض مقصد اسے یونہی جھک کرنا تھا مگر نہیں ہانتی تھی اس کی غراہ لڑکی کا بدلہ چکانے کا اک اور سنہرا موقع بھی اسے میسر آ جائے گا۔ مستقیم نے شاپ کیپر کو بلبلایا مگر سر اونچا نہیں کر سکا۔ امی کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد انہیں دونوں کو کھانا لگنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ ان کے ساتھ ہی اٹھ کر ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ کرسی چھیننے چپ چاپ بیٹھ گیا مگر ابو کی تیوری سالن کے ڈونگے کا ڈھکن ہٹاتے ہی چڑھ گئی تھی۔

"یہ کیا پکایا ہے؟"

وہ خشکیں نظروں سے امی کو گھور رہے تھے۔ جوں جوں میں حواس باختہ نظر آنے لگیں۔

"آلو منتر ہیں۔"

وہ منمنائیں۔ ان کی زرد رنگت کو نکلتے مستقیم کو ان پر جی بھر کے ترس آنے لگا۔ وہ وہی

صورتحال کی یقینی سے بے خبر وہ اپنے آپ میں مگن اب جھک کر سرخ یا قوت سے محروم
ننگن مہبت ہو کر دیکھ رہا تھا۔

"سوری..... مجھے کوئی ڈیزائن پسند نہیں آ سکا۔ آپ یہ اٹھالیں۔ میں پھر کبھی دیکھ لوں گی۔"
وہ کانہ سے جھٹک کر اکتائے ہوئے انداز میں کہتی سیلز مین سے مخاطب تھی۔ سیلز مین جو وہ
جانب متوجہ تھا اس کی جانب آیا اور مٹلیس کیس بند کرتے کرتے یکدم چوکنہ ہو گیا تھا۔
"ایکسیکو زمی میم! جسٹ اے منٹ پلیز! یہاں تشریف لائیے آپ۔"

"جی۔۔۔"

شرینہ جو اسی قسم کی صورتحال کی منظر تھی بیویں اچھلتے دل کے ساتھ بظاہر حیرانی کی ادا
کرتی ہوئی چلی اور آنکھیں پھیلا کر سیلز مین کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر سختی کے تاثرات رقم تھے۔
"اس کیس میں سے ایک بریسلٹ کم ہے۔ حالانکہ ابھی جب میں نے آپ کو دکھائے تھے تو
سیلز مین نے بات ادھوری چھوڑ کر اسے مشکوک نظروں سے دیکھا مگر وہ آگ بگول ہوئے گی۔"

"تو کیا مطلب مسٹر! کیا کہنا چاہتے ہیں آپ کہ میں..... میں چور ہوں؟"
وہ صحیح معنوں میں سیلز مین کے گلے پر مگنی اور بھڑک کر بولی تھی۔ دکان کے مالک کے ساتھ
کسٹمر اور مستقیم بھی متوجہ ہو چکا تھا اس کی بلند آواز سے، البتہ شرینہ کو پہچان لینے کے باوجود اس
تاثرات سردی رہے تھے۔

"سوری میم! میں ہرگز آپ کو ظہیم نہیں کر رہا۔ مگر ہمیں آپ کی تلاشی تو لینا پڑے گی۔"
سیلز مین بے حد سجاو سے مگر محتاط ہو کر بات کر رہا تھا۔ نقصان اس کی موجودگی میں ہوا
بریسلٹ لڑکی سے نہ ملنے کی صورت میں خمیازہ اسے بھگتنا پڑتا جبکہ وہ یہاں تنخواہ دار ملازم تھا
ہونے والے بریسلٹ میں ڈانٹنڈ جزا ہوا تھا۔ اس کی تو نسلیں بھی قرض چکا تھیں تو نہ اتر پاتا۔ ان
گھبراہٹ اور سراسیمگی اپنی جگہ درست تھی۔

"دیکھیے آپ میری تو جین کر رہے ہیں مسٹر! میں ایک مہذب اور شریف شہری ہوں۔ ان
اونر کی بیٹی! مجھے کیا ضرورت ہے ایسی گھٹیا حرکت کرنے کی؟ اور ویسے بھی آپ شک صرف مجھ پر
کر رہے ہیں؟ جبکہ آپ جانتے ہیں جب میں بریسلٹ پسند کر رہی تھی تو بڑکا بھی میرے پاس
میں آ کر کھڑا ہوا تھا۔ چور یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ آپ اس کی بھی تلاشی لیں۔"
اس نے کتنی خوبصورتی، مہارت اور چالاک کی سے صورتحال کو اپنے حق میں ایک بار پھر

جس فیچر اور سیلز مین کے ساتھ وہاں موجود دیگر لوگ بھی تذبذب کا شکار ہو گئے۔ مستقیم تو ایک دم
چکر لایا ہوا تھا۔ اسے اپنے پیروں کے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ اک لمحہ لگا تھا اسے شرینہ کی چال
مجھے میں مگر وہ دوسروں کو سمجھانے سے قاصر تھا۔ فیچر کے اشارے پر سیلز مین نے تلاشی کے پہلے ہی
مرحلے میں بریسلٹ اس کی جیکٹ کی جیب سے برآمد کر لیا تھا۔ وہ اس حد تک حواس سلب کر چکا تھا
سچی صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔ اس نے گنگ ہوتے ہوئے اک نظر شرینہ کو دیکھا۔

"اگر تم مجھے اس بری طرح سے انکود نہ کرتے خلیفہ مستقیم تو آج یہ ذلت تمہارا نصیب نہ بنی
ہوتی۔" مستقیم کو اس کی نظریں صاف جھٹلاتی ہوئی لگی تھیں۔ وہ اس پر تاؤ دلاتی مسکراہٹ اچھالتی۔
اٹھاتی، لبرائی دکان سے باہر نکل گئی۔ جب فیچر کے فون کرنے پر کچھ لمحوں میں پولیس پہنچ گئی تب اس
کا یہ شک نہ تھا اور وہ اپنی صفائی پیش کرتے گزرنے لگا تھا۔

"دیکھیے سر! یہ جھوٹ ہے۔ میرے خلاف سراسر سازش..... میں....."
"اوائے چپ کر اوائے! جھوٹ جیب سے برآمد ہوا ہے اور تو اسے سازش قرار دیتا ہے۔ کل کا
فلڈ اب ہمیں پڑ جائے گا۔"

حوالہ کے ہاتھ کا زنائے وار تھیں اس کا گال سرخ کر گیا۔ وہ تھپڑ کی تکلیف سے نہیں بلکہ ذلت کے
احساس سے بکا تھا۔ اس کی ایک بھی نہیں سنی گئی۔ پورے بازار میں سے پولیس والے جب اسے ڈنڈے
ملنے ہوئے لے جا کر گاڑی میں بیٹھے، اس روز احساس ذلت کے سبب وہ خود سے بھی نظریں نہیں ملا سکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہیں نیل میں اس کی ملاقات ماکے سے ہوئی تھی۔ ماکے نے اس کی چپ توڑنے کی بہتری
دیکھی کی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی ہمدردی میں پولیس والوں کو گالیاں اور کوسنے بھی دیئے اور اپنے
سجائے کھانے، چائے وغیرہ بھی اسے فراخ دلی سے پیش کیں۔ مگر وہ تو کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا
قد قندگی میں پہلی بار مایوسی، بے دلی کی انتہا پہ جا کے اس کا خود کشی کرنے کا دل چاہا۔ مگر وہ خود پر جبر
گناہ ہا۔ اب کو یقیناً اس کی گرفتاری کا علم ہو چکا تھا مگر وہ اس کی ضمانت کو نہیں آئے۔

وہ جانتا تھا ان کا پارہ آسمان کو چھو رہا ہو گا۔ مگر غصہ الگ بات تھی۔ انہیں اس کی ضمانت تو کرا
ہو گئی تھی۔ اس نے ماکے کے مشورے بلکہ اصرار پر اس کے فون سے گھر رابطہ قائم کیا۔ اس کی امی
سجائے بات ہوئی تھی۔ جو اس کی آواز سننے ہی رونے لگیں۔

"آپ ابو سے کہیں نا۔ وہ میری ضمانت کرائیں۔ یہ قید بہت جان لیوا ہے امی! آپ یقین

کریں میں بانگل بے گناہ ہوں۔ سراسر الزام ہے مجھ پر۔“

وہ اتنا بڑا ہو کر خود پر ضبط کھو کر بچوں کی طرح سے رو کر فریاد کر رہا تھا۔

”میتیں کرتی ہوں دن رات ان کی مستقیم اتہار کیا خیال ہے میں سکون سے بیٹھی ہوئی ہوں میرے بچے مگر وہ نہیں مانتے۔ انہیں یقین ہی نہیں کہ تم بے گناہ ہو۔ وہ تمہاری شکل دیکھنے کے لیے روادار نہیں۔ خاندان میں، پورے محلے میں ہر جگہ تمہاری گرفتاری کی خبر پھیل گئی ہے۔ لوگ افسوس کے بہانے آکر ان کو اور بھی اشتعال دلا جاتے ہیں۔ تمہارے خلاف باتیں کر کر کے۔“

اور وہ سکتے زوہ یہ ساری تفصیلات سن رہا۔ پھر دل برداشتگی کے عالم میں کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔ یعنی صورتحال اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر ٹھیک ہو چکی تھی۔ ابو اس سے نالاں تھے۔ شاکی بھی تھے بیشک بدگمان بھی تھے۔ مگر یہ بھی سچ تھا انہوں نے اسے کبھی سمجھا نہیں تھا۔ کبھی سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ لیکن یہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس سے یوں لاقطع ہو گئے تھے۔ یہ قطع تعلقی ہی اصل اضطراب اور عذاب کا باعث تھی۔ ماکھا اس سے لاکھ پوچھتا رہا کیا کہا اس کے گھر والوں نے مگر اسے ایسی چپ لگی تھی جو نونہی نہ تھی۔

وہ مزید ایک ہفتہ حوالات میں بند رہا۔ ابو نے پلٹ کر اسے پوچھا تک نہیں۔ اس کے دل کی معمولی آس تھی وہ بھی اپنی موت آپ مری۔ ماکھے کی عنایت ہوئی تو اس نے اپنی ایک طرف محبت دوستی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور اس کو بھی رہا کر لیا۔ وہ اس کا جتنا بھی ممنون ہوا تھا مگر شکر یہ ادا نہیں کیا کہ ایسی صورت میں ماکھا اس سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کرتا وہ یہی نہیں چاہتا تھا۔ مگر بہت جلد اسے اندازہ ہو گیا تھا کچھ نہ چاہنے سے جو ہونا ہوتا ہے وہ نہیں ہوتا وہ ہونا ہوتا ہے اور ہو کر رہتا ہے۔

☆ ☆ ☆

شریر ہوا کے جھونکے کیاریوں میں موجود چٹوں کے ذبیروں میں ٹھس کر نٹھے بچوں کی طرح مضامین بھر بھر کے پتے اچھالنے لگے اور لان کے ساتھ ساتھ پورا آگن انہی خشک چٹوں سے بھر گیا۔ شام اب اندھیری رات کی گود میں گرنے کو بیتاب نظر آتی تھی۔ اور سرد فضا دھواں دھواں کا رہی تھی۔ انہوں نے اٹھ کر سارے کمروں کی بیتاب جلانا شروع کیں۔ آج کچھ بھی پکانے کو دل نہ تھا۔ مگر شوہر کے مزاج سے آگاہ تھیں۔ جیسی بے دلی سے کچن میں آئیں۔ سالن پکاتے، آگ کھدکھاتی روٹی پکاتے، سلاد کاٹتے، پیٹھے میں ترا نفل بناتے ان کا دل بننے کی یاد لیے سسکتا رہا۔ اک صرف

سے نہ ہونے سے پورے گھر پر ویرانی چھا گئی تھی۔ قبرستان جیسی مہلک ویرانی، جو وجود کے ساتھ دل میں بھی اپنے منہوں پنچے گاڑ کر بیٹھ جاتی تھی۔

انہوں نے کھانا تیار کیا اور کچن کا دروازہ بھیڑ کر اندر چلی آئیں۔ سامنے ہی دیوار پر اس کی سکراتی ہوئی تصویر تھی۔ وزیر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی کارکردگی پر شیلڈ وصول کرتے ہوئے وہ کیسے غرے سے مرنے لگا تھا۔

وہ بھلا مجرم تھا؟

اور اور اب وہ جیل میں سڑے گا؟

ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگی۔ اپنی ہر کوشش کر کے وہ ہارنے لگی تھیں جیسی اب طبل پھرتی تھیں۔ بس دعاؤں میں اللہ سے التجا کرتیں۔ اللہ کے بندوں نے تو آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ اپنے بستر پہ بیٹھنے کے بعد انہوں نے ناگوں پہ لحاف کھینچ لیا۔ انداز بے حد مایوس تھا۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر با آخربط کھو کر سسک پڑی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے محلے میں داخل ہوا تو محلے کے کئی لوگوں سے اس کا سامنا ہوا۔ اسے دیکھ کر پہلے چوہکتے پھر کترا کر گزرتے جاتے۔ جنہیں اس نے حسب عادت سلام کیا وہ اس سے ان قصوں کی تفصیلات بیان کرنے کی کوشش میں مختلف سوال کر کے اگوانے لگے جو اس کی غیر موجودگی میں اس کے حوالے سے یہاں مشہور ہو چکے تھے۔ اس کا پیچھا پیچھا کر کے سوالات کرنے والوں کا منہ تو ضرور فوج لے۔ مگر خود پر ضبط کرتا ہوا گھر کی جانب بڑھ آیا۔ بند دروازے پر دستک کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ کہ دروازہ یونہی بھڑا ہوا تھا جسے دھکیلتا ہوا وہ اندر چلا آیا۔

اسے بڑے گھر پر اک عجیب سی یاسیت اور ویرانی کا پہرا تھا۔ یوں جیسے صدیوں سے یہاں کوئی آباد نہ ہو۔ اسے اپنے ہی گھر میں اپنا آپ اجنبی محسوس ہونے لگا تو قدرے جھجکتے ہوئے انداز میں الگ کمرے کی جانب بڑھا۔

”امی امی“

اس نے آہستگی سے پکارا تھا۔ جائے نماز پر بیٹھی اس کی ماں اس کی پکار پر چونکی اور اگلے لمحوں میں کچن سے مڑی تھیں۔ اسے رو برو پا کے ان کی آنکھیں حیرت خوشی اور غیر یقینی سے ساکن ہو کر رہ گئیں۔ وہ ان کے تاثرات پہچانتا تھا۔ ہر جھجک اور گریز جاتا رہا۔ وہ آگے بڑھ کر کسی مچھوٹے سے کچن کی طرف ان سے لپٹ گیا۔ وہ اسے چومتی کبھی روٹی تھیں کبھی بننے لگتیں۔

”یا اللہ پاک تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب تو مجھے گلے لگا تھا میرے بچے کہ تیری راہ نکلتی مہری آنکھیں پتھری ہو جائیں گی۔“

امی زار و قطار روتیں اس کے چہرے کے نقوش کو والہانہ انداز میں چوم رہی تھیں۔ مستقیم کو ساری اذیت ہر تکلیف بھولنے لگی جو اس نے ان چند دنوں میں شدتوں سے محسوس کی تھی۔ اس کے اندر سے جنموں کی پیاس بجھنے لگی۔ وہ یکا یک کتنا آسودہ گلے لگا تھا۔

”کیا حشر کروایا ظالموں نے میرے چاند کا۔ چل اٹھ۔ نہادھو لے۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔ کھانے کے بعد آرام کر لینا۔“

اک طرف سے اطمینان ہوا تو پہلی بار چلنے پر توجہ گئی تھی۔ بڑھی ہوئی شیو، کندے سے ملے ہوئے کپڑے، بکھرے بال، وہ کہیں سے بھی ان کا بے حد فریش، تروتازہ اور شہزادوں جیسی آن بان والا چہرہ نہیں لگ رہا تھا۔ مگر مستقیم ان کی محبت، اپنائیت کے باوجود ابو کی جانب سے خائف تھا۔ دل میں ان کی جانب سے ہی گویا دھڑکا تھا جو زبان پر بھی آگیا۔

”ابو کچھ کہیں گے تو نہیں نا مجھے؟“

”تو فکر نہ کر۔ بھول بھال گئے ہوں گے اب تک وہ۔“

اسے تسلی سے نوازتیں وہ یکدم چونک اٹھی تھیں کسی خیال کے آتے ہی۔

”تمہیں کس نے پھڑوایا ہے بیٹے!“

اور جو اب مستقیم نے گہرا متا۔ ستانہ سانس بھرا تھا۔

”وہیں جیل میں تھا کوئی غنڈا نا پ آدمی! خواتین اور مجھ سے دوستی کا ٹھہ رہا تھا۔ طمانت بھی ان نے کرائی ہے۔“ اس کے بتانے کی دیر ہوئی۔ امی دل تھام کر وہیں بیٹھ گئیں۔ وہ بے ساختہ گہرا سانس لیتی رہی۔

”کیا ہوا ہے امی؟“

”اس نے کیوں کرائی؟ اسے کیا دلچسپی؟ ایسے خطرناک لوگوں کی دوستی دشمنی دونوں اچھی نہیں ہوتی۔ وہ کتنی متفکر لگتی تھیں۔ مستقیم ان کے خدشات کو محسوس کر کے نرمی سے مسکرایا تھا۔

”آپ کیوں فکر کرتی ہیں امی! اتنی سمجھ تو مجھے بھی ہے۔ میرا اس سے کسی قسم کا بھی تعلق نہیں ہے۔“ وہ ان کے ہاتھ تھامے انہیں ساتھ لگائے تسلی سے نوازا رہا تھا۔

”تو بس آئندہ محتاط رہنا میرے بیٹے! اور بار حوالات کا چکر لگ گیا۔ اللہ خیر کرے۔“ ان کی آنکھیں پھر سے بجھنے لگیں۔

”مجھے سخت بھوک لگی ہوئی ہے امی! وہاں آپ کے ہاتھ کے ڈانٹے کو بہت مس کیا ہے۔ منہ پھاؤ بنا میں میرے لیے۔ میں تب تک نہالوں۔ پھر آپ کو بتاؤں گا میرے ساتھ یہ سب کس نے اور کیوں کروایا۔ آپ کو تو یقین ہے نا امی کہ آپ کا بیٹا مجرم نہیں ہے؟“

اس کی بڑی بڑی ساحر آنکھیں اپنی صفائی پیش کرتے ایک دم پاندوں سے بھر گئیں۔

”ارے چور کو تو کوئی گرم توے پر بھی بٹھا کر پوچھتے کہ وہ چور ہے تو کبھی تسلیم نہ کرے۔ ساری دنیا میں میرا نام ڈبو کر اور بدنامی کے اشتہار لگا کر یہاں میرے گھر کی دہلیز پھلانگنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟ اس گھر میں کسی مجرم اور اشتہاری کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی کہ ہر تیسرے دن پولیس دروازہ کھٹکنا کر تمہارا مطالبہ ہم سے کرتی پھرے۔ ایک منٹ کے اندر دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

ابو اپنا تک آئے تھے۔ اور آتے ہی اسے سامنے پا کر مشتعل انداز میں چنگھاڑنے لگے۔ امی تو اتنی خوفزدہ ہوئی تھیں کہ باقاعدہ تھر تھر کاہنے لگیں۔ مستقیم نے البتہ ہونٹ بھیج لیے۔ وہ ان کے غصے کو کچھ اتنا بھی بے جا نہیں سمجھتا تھا۔ جو صورتحال تھی ان کا بدگمان ہو جانا اتنا بھی غیر معمولی نہیں تھا۔ بیشک یہ الزامات تھے۔ مگر اسے انہیں حقیقت بتانی تھی۔ وہ نہ سہی اس کی جانب کا سفر اختیار کرتے مستقیم خود گریٹا۔ وہ اس کے باپ تھے۔ وہ ان کے وجود کا حصہ تھا۔ کیسے ممکن تھا اسے اصل بات جاننے کے بعد بھی جھٹلاتے یا پھر جھٹک دیتے۔ جیسی وہ تیزی سے ان کے قریب آگیا۔

”ابو آپ تک جو اطلاعات پہنچی ہیں وہ غلط ہیں میں۔“

اس کی بات ابو کے اٹھے ہوئے ہاتھ کی بدولت ادھوری رو گئی۔ بہت زمانے کا تھپڑ تھا۔ اس کا اٹھا سننا اٹھا تھا۔ پھر انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ یکے بعد دیگرے اس کے چہرے پر طمانچہ لگاتے چلے گئے۔ وہ چکر اکر رہ گیا۔ جبکہ امی رونا بھول کر پتھری ہوئے لگیں۔

”بے شرم! بے حیا! آگے سے بکواس کرتا ہے۔ یعنی چوری بھی اور سینہ زوری بھی مجھے بتاؤ۔ اتنے قاتلو اور بیکار ہیں لوگ جو تمہارے خلاف بیٹھے سازشیں کرتے ہیں۔ ہاں؟ احمق سمجھ رکھا ہے تمہیں؟ میں پوچھتا ہوں اب یہاں آنے کا مقصد کیا ہے تمہارا؟ جس گینگ کے لیے کام کرتے ہو تم وہاں کیوں نہ دفنان ہو گئے تم! میں تمہیں شوٹ کرنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ اگر تم یہاں سے غائب نہ ہوئے۔ میں نے سمجھ لیا میرا بیٹا پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ اور کاش تم مری گئے ہوتے۔“

”خدا کا واسطہ ہے۔ ایسی بد فال تو منہ سے نہ نکالیں۔“

امی کے کہنے پر ہاتھ پڑا تھا۔ وہ بے اختیار زور زور سے رونے لگی تھیں۔

تیسرا حصہ

"خبردار عورت تم اس معاملے کے بچ نہ آنا اور تم... تم نکلوا ایک منٹ کے اندر اندر یہاں سے۔" کہا ہے نامیں تم جیسے بے غیرتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ بس بہت ہو گئی۔"

انہوں نے پہلے امی کی فریاد پر انہیں جھڑکا اور دھکارا پھر مستقیم کا بازو کھینچ کر کسی طرف کی مانند کھینچنے باہر کی جانب چلے۔ امی کے چہرے پر اس فرعونی حکم سے ہوائیاں اڑنے لگیں۔ انہوں نے لپک کر بے اختیار مستقیم کا بازو پکڑا مگر خود بھی ساتھ ہی کھینچیں۔ ابو کی طاقت کے سامنے وہ جیت ہی رہتی تھیں۔ مستقیم تو تھا ہی حواس باختہ اور گھبرایا ہوا۔

"ایسا مت کریں مستقیم کے ابا! یہ غضب مت کریں۔ میں مر جاؤں گی۔ اللہ کی قسم!"

امی کوئی پیش نہ چلتی دیکھ کر پھر دونوں کے بچ حاصل ہوئیں۔ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ امی نے دیکھا کہ ان کا انداز دیکھ کر لگتا تھا وہ ابو کے پاؤں بھی پڑ سکتی ہیں۔ مستقیم کو سب سے زیادہ امی کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔

"ہاں تو مر جاؤ۔ اچھا ہے دنیا سے گناہوں کا بوجھ کچھ کم ہو گا۔"

ابو کتنے فیصلے انداز میں ان کی جانب پلٹے تھے۔ اسی طیش میں غراتے ہوئے انہیں جارحانہ انداز میں انہیں دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر برآمدے کے ستون سے ٹکرائیں مگر اس بار چوٹ کا احساس ہی کہاں تھا۔ مستقیم البتہ ضرور تڑپ اٹھا تھا۔

"پلیز امی بس کریں۔"

وہ جیسے خود رو دینے کو تھا۔ یکا یک کتنی سرخی اتر آئی تھی اس کی ہر دم روشن رہنے والی لہریں جھکتی آنکھوں میں۔ مگر وہ سن کہاں رہی تھیں کسی کو۔ ان پر تو ایک ہی دھن سوار تھی۔ بچے کو ہر مصیبت سے بچا کر اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کی دھن۔ جیسی پھری ہوئی لہریں طرح طرح سے سامنے آ کر پھر جھنپیں۔

"ایسا سلوک مت کریں اس کے ساتھ۔ آپ کو احساس کیوں نہیں ہے؟"

ابو کا اٹھا ہوا ہاتھ ان کی بات ادھوری رہنے کا باعث بنا تھا۔ جو زمانے کے تھنری صورت ان کے چہرے پہ سرخ نشان چھوڑتا تاکہ سے خون چھلکا گیا۔ وہ پہلی بار غصے میں ان کے آگے بولی تھیں۔ ابو سے یہی گستاخی برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ جیسی سراپا قبر تھے اور اب پہلے سے بڑھ کر اونچی آواز میں چنکناڑ رہے تھے۔

"تیری زبان کاٹ دوں گا بد بخت عورت! یہ تیرے ہی لاڈ پیار کا نتیجہ ہے جسے آج میں ذلت کے ہمراہ بھگت رہا ہوں۔ اسے تو گھر سے نکالوں گا ہی۔ مگر تجھے بھی طلاق دینے کے بعد چھٹا پکڑ کر پھر پھینکوں گا تب اس زبان درازی کا پتا چلے گا تجھے اس عمر میں دھکے کھاتی پھرنا منہ پہ کالک لگا کر۔"

اور طلاق کے ساتھ ساتھ آخری دو دھمکیاں ایسی تھیں جو امی کو رونا تو بھلاتی ہی۔ دہک کے بھی رکھ نہیں وہ ساکن کھڑی تھیں۔ مستقیم جو تب سے شدید صدمے کے زیر اثر سکتہ زدہ تھا ان کی حالت دیکھ کر رہ گیا۔ ابو سے اس حد تک ذالالت کی اسے توقع نہیں تھی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ انہیں بھی خانہ بدوشی کرنے پہ قائل گئے تھے۔ اپنی حد تک تو وہ برداشت کر سکتا تھا مگر امی کے لیے نہیں۔ اب وہ چھوٹا سا بچہ نہیں تھا۔ جوان تھا۔ ان کو سنبھال سکتا تھا۔ خود ان کی پناہ گاہ بن سکتا تھا۔ جیسی تیزی سے بڑھ کر امی کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا، جو اس قدر سبھی ہوئی تھیں کہ گویا سانس لینا بھی بھول گئی تھیں۔

"امی! آپ چلیں میرے ساتھ۔ میں اب ہرگز آپ کو یہاں نہیں رہنے دوں گا۔"

غم و غصے کی شدتوں سے وہ سر تاپا کانپ رہا تھا۔ کچھ فیصلے بھلے جتنے بھی اچانک ہوتے ہیں مگر بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی فیصلہ تھا۔ ابو نے خاصی تسخیرانہ نظروں سے اسے دیکھا جو اماں کے دوپٹے سے اس کا خون صاف کرتا ہوا ایک دم سے بہت بڑا ہو گیا تھا۔ جیسے وہ حقارت سے گھٹے پھر پھٹا کر اس سے مخاطب ہوئے۔

"ہاں... ہاں... جاؤ لے جاؤ اپنی ماں کو بھی اپنے ساتھ... میں اپنے نام کی بیڑی سے اسے آزاد کر دیتا ہوں۔ پھر لے جانا۔ چوراچکوں کے رشتہ داروں سے میں خود بھی کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھتا چاہتا۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ابو کو دیکھتی امی کو اپنے مضبوط بازو کے غلطے میں لے کر تن کر باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"بہت مہربانی ہوگی جو آپ یہ احسان کر دیں۔ ہم خود بھی آپ سے اب کوئی رشتہ کوئی تعلق نہیں

احساس ہو گیا ہو، شاید وہ اس کے دل میں گم نہ جانے والا بھالا کھینچ لیں۔ مگر وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھیں۔

ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپنے کھڑی رو رہی تھیں۔ یقیناً اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ شاید اس کے جانے کی منتظر۔

یقیناً وہ اسے معاف کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھیں۔ ازالہ کرنا تو دور کی بات۔ انہوں نے بھی اسے جانے کو کہہ دیا تھا۔ یعنی اب اس گھر میں اس کے لیے جگہ نہیں تھی۔ یہ احساس بہت جان لیوا ہے۔ وہ واپسی کو مڑا تو دکھوں نے اس کے اندر رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے دل میں امی کے الفاظ سے گم نہ جانے والے بھالے سے ٹپکتا خون اس کے پورے وجود میں زہر بن کر پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں ہر لمحہ سرخ ہو رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

تراش کر میرے بازو اڑان چھوڑ گیا
رقعتوں کا میری اس کو دھیان کتنا تھا
جو بادلوں سے بھی مجھ کو چھپائے رکھتا تھا
گل گیا ہے کہیں ان دیکھے پانچوں کی طرف
عقاب کو تھی غرض اپنا شکار پکڑنے کی
نہ جانے کون سا آسیب دل میں بستا ہے
عقب میں گہرا سمندر ہے سامنے جنگل
یہ کس انتہا پہ میرا مہربان چھوڑ گیا

اس کے اندر دکھ تھا۔ گہرا دکھ، جو ڈھلتا ہی نہ تھا۔ ابو کے ساتھ ساری دنیا بھی مل کر اسے ٹھکراتی، بھڑکتی، دھتکار دیتی۔ وہ کبھی ایسے نہ ٹوٹتا۔ ایسے نہ بکھرتا۔ مگر امی نے ٹھکرایا تھا تو وہ خود سے بکھڑ گیا تھا۔ وہ گھر سے لگا تو شام رات میں ڈھل رہی تھی۔ وہ محلے کے جانے پہچانے مناظر کو کسی اجنبی کی نگاہ سے دیکھتا آگے بڑھتا رہا۔ وہ ساری رات چلتا رہا اور تھکا نہیں کہ روج کی ٹھکن وجود کی ٹھکن پر غالب تھی۔ اس کی پور پور میں اضطراب تھا، وحشت تھی۔ یہ ایسا دکھ تھا جس سے وہ سمجھوتہ ہی نہ کر پایا تھا مگر اب اسے مبرا ہی نہ آسکا تھا کبھی بھی۔ صبح ہوئی تو وہ ایک پارک کی بیچ پر گر کر بے سہمہ ہو گیا۔

آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کی تیز شعاعوں نے مسلسل اس کے چہرے سے چھینر خانیاں کی تھیں۔ کئی گھنٹے ایک ہی زاویے سے پڑے رہنے سے اس کے اعصاب مفلوج ہو رہے تھے۔ مگر اس

رکھنا چاہتے۔ آپ جیسے خود پسند اور گھمنڈی لوگ اپنی ساری زندگی اپنی ذات میں دفن ہو کر گم نہ گزرتے ہیں۔

”وہ ایک یکسر بدلے ہوئے مستقیم کی شکل میں ان کے سامنے تھا۔ ابو کو تو اس کی ڈھنکی ڈھنکی غیرتی پر غش آنے لگے۔ جبکہ اس کے الفاظ پہ امی کا یہ سکتہ بھی جیسے چھنا کے سے ٹوٹا۔ وہ بڑبڑا کر بولنے لگی۔ مگر جو اسوں میں لونی تھیں اور باپ کے سامنے جم کر کھڑے مستقیم کی شرٹ کا کالر پکڑ کر جھنجھکیاں مچانے لگی تھیں۔

”مستقیم؟“ وہ صدے سے پھنکی مگر بڈبانی آواز میں چچی تھیں۔

”شرم سے ڈوب مر، ماں کو اس بڑھاپے میں طلاق دلو اور بے ہو۔ وہ بھی خود کہہ کر۔“
وہ ہچکچاک کر رو پڑیں۔ بے بسی۔ بے کسی اور شرم کی انتہاؤں کو چھوٹا مستقیم سخت مضبوط ہاتھوں میں

گیا تھا۔

”اونہہ دیکھ لیا۔ میری باتوں کا تو یقین نہیں تھا نا۔ یہ جو ہر ہیں اس کے۔ ابھی آگے آئے۔ کیسا نام روشن کرتا ہے تمہارا۔“

ابو چمک کر بولے تھے۔ انہیں جیسے سہرا موقع ہاتھ لگا تھا۔ اس پہ فرد جرم عائد کرنے کا۔ وقت بالکل کٹ کر رہ گیا جب اس کے حوصلہ دینے کو بڑھے ہاتھ امی نے بے حد غصے سے جھٹکے۔

”جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔ مستقیم! چلے جاؤ۔ میں نے سمجھا تم پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے۔ وہ یونہی روتے ہوئے اسے دھکا دے کر بولیں۔ آہ و بکا اور تڑپ شدید تڑپ۔ مگر ان کے

کیا تھے۔۔۔۔۔ وہ تو خنجر تھے۔ کمواریں تھیں۔ جو اس کی رگ جاں میں اتر گئی تھیں۔ وہ تو جیسے لگا کر نہیں لے سکا اور دھڑ سے زمین پہ جا گرا تھا۔ غیر یقینی اور صدے سے شق ہوتا ٹنگ کھڑا تھا۔

کے چہرے پہ طنز و تمسخر کے ساتھ اس اہم مقام پہ ملنے والی فتح کا تاثر بھی بہت تیزی سے اتر آیا۔

”بس! سن۔۔۔۔۔ ہو گئی تسلی؟ اب اپنے کالے کرتوتوں کے ساتھ شکل گم کرو۔“

اس کی چھرائی ہوئی آنکھوں میں جھانک کر وہ حقارت سے کہہ رہے تھے۔ چہرے کا رنگ

رعزت تھی۔ وہ اس کے باپ تھے؟ وہ۔۔۔۔۔ کہ باپ کیسے ہو سکتے تھے۔ باپ بہر حال ایسے

ایسے بے رحم تو نہیں ہوتے۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے ان کے گھٹنے سے وہ ٹپکی

چہرے سے نگاہ ہٹائی اور اک آخری امید کے تحت اپنی ماں کو دیکھا۔ شاید انہیں اپنے

”اوائے میرے پتر ازار رک جا! یہ کھانا تیرے شایان شان نہیں ہے۔“

مستقیم کے چہرے پر استہزا کا رنگ اتر اترتا مگر جواب دیئے بغیر اپنے کام میں مشغول رہا۔ ماکھا مہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

”گھر والوں نے نکال دیا ہے نا تجھے؟“

اس کا جائزہ مکمل ہوا تو تجزیہ پیش ہو گیا۔ نساہ کی پڑیا نکال کر چنگی منہ میں دباتے اس نے جتنے سکون سے سوال کیا تھا مستقیم کے اندر اسی قدر تباہی مچ گئی۔ منہ کی جانب جاتا اس کا نوالہ تھامے ہاتھ ساکن ہوا اور چہرہ ایک کتنا تاریک پڑ گیا تھا۔ ماکھے کی زیرک نگاہ نے اس کے چہرے پر اترتی اڑیوں کی برسات کو دیکھا اور سرد آہ بھری۔

”حوصلہ پڑ میرے شیر بہادر! یہ دنیا اتنی ہی ظالم ہے۔“

مستقیم سے نگاہ بھر کے اس کی جانب نہیں دیکھا گیا۔ اسے لگا تھا۔ اسے کسی نے سر بازار عریاں کر دیا ہے وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور ماکھے کو نظر انداز کرتا ہوا لڑکھڑاتے قدموں سے دور ہوتا چلا گیا۔ ماکھے کی پکاروں کو سرے سے ان سنی کیے۔

☆.....☆.....☆

سارا دن کبر چھائی رہی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل ہونے کی وجہ سے زمین کے مکین سورج کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکے۔ تیز بریلی ہوائیں نیروں کی مانند جسم میں پیوست ہوئی تھیں۔ اس کا وجود ٹھکن اور بخار سے جلتا تھا۔ پچھلے چھ گھنٹے اس نے لگا تار کام کیا تھا۔ اس کے سامنے پھیلے تین کنال کے جھلکے کی دوسری منزل زیر تعمیر تھی اور اس میں اس نے آج مزدوری کی تھی۔ پیٹ کا دوزخ ایندھن مانگتا تھا۔ اور اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔

جین فروخت کر کے اس نے ہوٹل والے کو ادائیگی کی تھی اور باقی ماندہ پیسوں کا حساب لگا تار با تھا کتنے دن پھیس گئے۔ مگر اس فینشن سے اسے کسی جیب کترے نے آزاد کرادیا تھا۔ اس صفائی سے جیب کٹی تھی کہ وہ حیران ہوتا رہ گیا۔ یعنی نقصان پر نقصان۔ مگر اب اس سے بڑھ کے نقصان ہوتا۔ ہی کیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی پورا الٹ چکا تھا۔

دو دنوں کی بھوک سے عاجز ہو کر اس نے آج یہ مشقت طلب کام کیا تھا کہ ہاتھ پھیلا تا اور چھینا اس کی سرشت تھانہ فطرت۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یہ دونوں کام نہیں کر سکا۔ حالانکہ ماکھے نے سمجھانے کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے ساتھ شامل ہونے کا بہترین مشورہ بھی دیا تھا۔ مگر وہ

سے بھی شدید احساس پیٹ میں دھکتے الاؤ کا تھا۔ اس نے جانے کتنے دنوں سے ڈھنگ سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آئی اب وہ کیا کرے کہ پیٹ کی آگ بجھ سکے۔

پارک سے نکل کر وہ ایک چھپر ہوٹل تک آ گیا۔ اس کی گردن میں جو سونے کی زنجیر تھی وہاں نے اسے میز پر رک کے بعد تختہ دی تھی جانے پولیس والوں کی نظر سے کیسے بچ گئی تھی۔ ورنہ تو انہیں اس کی جیب سے دس روپے کا آخری مزارتو انٹ بھی نکال لیا تھا۔ جس کی موجودگی کی خود اسے گوارا نہیں تھی۔ بان کی کمری چار پائی پینٹارش سے الگ تھلک بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے لیے مال آرڈر کی تھی۔ تب ہی جانے کس جانب سے نکل کر ماکھا اس کی رکھائی کو خاطر میں لائے بغیر پر جوش انداز میں اس سے زبردستی بغلیں ہو گیا تھا۔

”اوائے شہزادے! تو ادھر کدھر شیر جواتا۔“

”یہاں لوگ غالباً کھانا کھانے آتے ہیں۔“

ماکھے کے برعکس اس کا انداز سرد مہر تھا۔ مگر ماکھا پھر بھی محنت کا شکار نہیں ہوا۔ الٹا اٹھتا۔

بیٹنے لگا تھا۔

”تجھے پتہ ہے شہزادے! انخرہ بھی جتنا ہے تجھ پر۔“

منہ میں موجود بان چباتے ہوئے وہ اپنے مخصوص فدا ہونے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

اسی وقت ہوٹل کے چھوٹے کھانا لاکر مستقیم کے آگے رکھا تھا۔ پلاسٹک کی چٹگیر میں دو روٹیاں، تام چینی کی پلیٹ میں ماش کی بھنی ہوئی دال، جس پر بہت خوبصورت انداز میں پیک ہوئی پیاز ڈالی گئی تھی۔ ساتھ دسی کی چٹنی، ماکھے نے ابرو اچکا کر اس نرے کا جائزہ لیا پھر پلیٹ کو گھورا تھا۔

”اوائے گلز کی ٹانگ لا میرے ہر شیر کے لیے۔ تجھے نہیں پتہ یہ میرا مہمان ہے۔“

وہ اپنی کرخت آواز میں اسی طرز وحاژ کر بولا تھا کہ اس پاس سنانا چھا گیا۔ چھوٹے

”جی اچھا جناب!“ کہا اور سرعت سے پلٹ گیا۔ مستقیم اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہاں اسے

ماکھے نے اپنی بد معاشی کی دھاک بٹھا رکھی ہے۔ مگر اسے کیا۔ وہ تو ماکھے سے نہیں ڈرتا تھا۔

دب جاتا۔ جیسی اسے اس کی بات کو سرے سے نظر انداز کیے اس نے اپنا منگوایا ہوا کھانا ہی

کر دیا تھا تو ماکھا نو کے بغیر نہیں رہا۔

اس راہ کا مسافر ہی نہیں تھا۔ ابھی اس نے اپنے مستقبل کے حوالے سے کچھ سوچا نہیں تھا کہ ذہنی طور پر کہاں کرنا تھا۔ فی الحال تو بس اسے دو وقت کی روٹی کی فکر تھی۔ اور اسی سلسلے میں اس نے حیرت انگیز حثیت سے جان توڑی تھی۔

اس چند گھنٹے کی مزدوری میں اس نے صاف محسوس کیا کہ اس کے ساتھی مزدور اس سے زیادہ مشقت لے رہے ہیں۔ اینٹوں سے بھری ہوئی ہاتھ سے دھکیلنے والی ریزمی وہ اوپر لے کر جاتا تو دل خالی نہیں آنے دیا جاتا تھا۔ اس کی ریزمی میں ماربل بھر دیا جاتا۔ اسے فصد تو آیا تھا، مگر وہ ضبطی کو نہیں چاہتا تھا۔ جب ہی اپنے حوصلے آزماتا رہا۔ مگر کب تک۔ یہ برداشت یہ حوصلہ اس وقت تک اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا، جب دن بھر کی بھرپور مشقت کے بعد اجرت کے نام پر اس کی ہتھیلی پر دس روپے کے دس نوٹ رکھے گئے۔ اس نے حقیر کے عالم میں ان نوٹوں کو گنا۔ مگر اسے کوئی غلطی نہیں لگی تھی۔ اس نے گننے پر بھی وہ تعداد میں دس ہی رہے تھے۔ جبکہ وہ اس بات سے بہت اچھی طرح آگاہ تھا کہ مزدور کی اک دن کی اجرت چار سو روپے ہے۔

”یہ کم ہیں۔ مجھے میری پوری اجرت چاہیے۔“

نوٹ واپس کرتے ہوئے اس نے بہت غل بھرے انداز میں ٹھیکیدار کو مخاطب کیا تھا۔ اس نے باوجود اس کے چہرے کے زاویے اس فرمائش کو سن کر گھڑنے لگے۔ اس نے پریشانی نظروں سے گزرنا دیکھا اور ہنگ آمیز انداز میں رعونت شامل کر کے بولا تھا۔

”اوائے وڈے حسابی کتابی! اتنے مل گئے ہیں نا خیمت سمجھ اور ادھر سے پھوٹ لے۔ یاد رکھو! میں نے بتایا تھا تجھے کہ ہمارے مخصوص مزدور ہیں اور ہم ان سے اپنا کمیشن کاٹتے ہیں۔“

مستقیم کو ٹھیکیدار کا انداز برا محسوس ہوا تھا مگر اس کا مقصد جھٹکا فساد کرنا نہیں تھا۔ جمعی گھر برداشت کا دامن نہیں چھوڑا۔ البتہ وہ اپنا حق بھی غصب ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جیسی طرح بے سمجھانے لگا۔

”دیکھیے میں اس کھپ میں شامل نہیں ہوں تو میں کمیشن بھی نہیں دوں گا۔ جب میں اسے اس میں کی نہیں کی۔ تو مجھے اجرت بھی پوری چاہیے۔“

اس کا مطالبہ ناجائز نہیں تھا، مگر ٹھیکیدار کو اس کی اپنے حق میں افغانی آواز ضرور ضرورت سے زیادہ مشتعل کر گئی۔

”اوائے..... تمیز سے بات کر لو گھرے اور نہ زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔“

”کیوں کھینچ لو گے؟ زر خرید نظام ہوں تمہارا؟ سمجھتے کیا ہوا ہے آپ کو۔“

اس کے خواہناں بھرنے پر مستقیم کو بھی تاؤ آ گیا تھا۔ جمعی اسے کھری کھری سنا دیں جو اسے بھی خاصی مہنگی پڑ گئی تھیں۔ ٹھیکیدار نے آپے سے باہر ہوتے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ اس پاس کڑے مزدور جو اسی کے چیلے تھے اک اشارے پر حرکت میں آئے۔ پھر تو جیسے ہر طرف سے مستقیم پر دھب ٹونے لگا۔ لاتوں، گھونسوں اور تھپڑوں کی گویا اس پر بارش برسا دی گئی۔ اس طرح وہ سب شاید ٹھیکیدار کی نظروں میں اچھا بننے اور اپنی وفاداری کا ثبوت فراہم کرنا چاہ رہے تھے۔

”اوائے! تجھے جرأت کیسے ہوئی۔ ٹھیکیدار صاحب سے بدکلامی کرنے کی۔“

وہ اس کی نھائی کرتے بار بار اس کی گستاخی باور کراتے تھے۔ مستقیم کو کہاں لڑنا آتا تھا۔ اس کا تو بھی پالا ہی نہ پڑا تھا اس قسم کے حالات سے۔ زندگی میں جب بھی اسے گھبرا گیا تھا۔ وہ پٹے ہوئے سرے کی مانند ہمیشہ چپ ہوا تھا۔ پھر اب کیسے پنپتا۔ کیسے مقابلہ کرتا۔ محض چند لمحوں میں اس کا حلیہ بگڑ جاتا تھا۔

اس ایک واقعہ نے اسے پوری طرح دل برداشتہ کر دیا۔ اس نے بس اک بات جانی تھی اور وہ یہ کہ گرجن، دھاندلی اور بے ایمانی ہر سطح پر پھیل گئی تھی۔ چاہے وہ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والا آمر ہو یا پچھلے طبقے کا اک فرد..... اپنی اپنی بساط کے مطابق ہر کوئی اپنے سے کمزور کو لوٹ رہا تھا۔ ہر کوئی دھوکہ دے رہا تھا۔ ایسے میں یہ اس کی ذہنی ابتری ہی تھی کہ ایسے لمحوں میں ایک بار پھر ماکے نے اسے اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی تو وہ پہلے کے سے نخوت اور رعونت سے انکار نہیں کر سکا۔ وہ اچھائی کا سبق کیسے یاد رکھتا۔ کوئی اسے ایسا کرنے ہی نہیں دے رہا تھا۔

یہ بھی نہیں تھا کہ دنیا سے اچھے لوگوں کا سرے سے خاتمہ ہو گیا تھا، یا اچھائی مکمل طور پر رخصت ہو گئی تھی۔ مگر شاید قسمت کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی تھی۔ ایسے میں وہ ماکے کے ازبکرائے سبق پڑھنے لگا۔ جس نے کہا تھا۔

”دیکھ بیارے! یہ دنیا بہت خراب ہے۔ بنا کسی جرم کے اس نے تجھے مجرم بنا دیا۔ تجھے ہر طرح سے ملوث کیا۔ اب تو یہی انداز اپنالے۔ جو دنیا نے تجھے دیا، اسے واپس لوٹا دے۔ پھر دیکھنا یہی دنیا کیسے تیرے کو بے چارہ بناتی ہے۔ تیری ہیبت سے کانپتی ہے۔“

اس نے مایوسی کی انتہائی کیفیت میں اسی راستے پر قدم رکھ دیئے۔ وہ مستقیم تھا۔ اپنے نام کے عکس کیسے ہو سکتا تھا مگر اسے کر دیا گیا۔ چہار سو گھنٹہ نوپ اندھیرا تھا اور ہر راستہ بند۔ امید کی کرن

بارہوی بھی شامل ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کی زندگی۔ اس کی معصومیت اور اس کی سادگی کو دیکھ کر ہر آدمی کو دل سے شکر ہوتا تھا۔ وہ عورت سے شکر ہوتا تھا۔ پھر اس کے سامنے کیسے کمزور پڑ جاتا۔ وہ کھلونا نہیں تھا کہ عورت ایک بار پھر اس سے کھیلتی۔ یہی احساسات تھے جو اسے ان ماہ و سال میں عورت سے بد کانے کا باعث بنتے رہے۔

ماکھے کے بعد امانت تھا جس سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ میڈیکل کالج کا اسٹوڈنٹ تھا اور آنکھ بینوں کا واحد کفیل بھی۔ مگر حالات کی چٹکی میں پستا ماکھے کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ پھر وہ بھی شامل۔ اس کی دوست اس کی محبوبہ۔ جو مستقیم پر دل ہار گئی تھی۔ اور سب کچھ لانا کر ان کے گروہ میں شامل ہو گئی تھی۔ مستقیم کو سب سے ناگوار بات بھی یہ تھی۔ مگر ماکھے کی مداخلت کے باعث ناچار مستقیم کو اس کی جانب سے خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

وقت آچھا اور آگے سرکا۔ مستقیم کو ماکھے نے اسلئے کے استعمال اور کرانے کی تربیت دے کر اس کو لے کر دیا۔ وہ چھتے کی طرح پھریتا اور لومڑی کی طرح عیار تھا۔ اس نے اپنا ہر فن مستقیم میں بیکار کر دیا۔ شیر جیسی طاقت تو پہلے سے اس میں موجود تھی جسے بہترین انداز میں استعمال کیا گیا تھا۔ ماکھے نے اسے اپنا بھی گروہ تسلیم کر لیا اور جب ایک پولیس مین اسے ماکھا جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو اس کے تمام ساتھیوں کی متفقہ رائے سے خلیفہ مستقیم کو استاد ماکھ کی جگہ سردار کی حیثیت دے دی گئی۔

☆ ☆ ☆

مستقیم نے ماکھے کے اساتذہ کو چھوڑ کر اپنے انداز میں ذکیٹی شروع کی۔ اس نے دو بار بینک لٹے اور لاتعداد مرتبہ بڑے بڑے سینوں کی تجوریاں خالی کیں۔ اس کا شمار ہمیشہ بڑے اور گہرے ٹانگے سے ہوتا تھا۔ اس نے محدود سے عرصے میں اپنے سارے ساتھیوں کو بھی مالا مال کر دیا تھا مگر پچھلے کچھ دنوں سے پولیس بہت اڑ رہی تھی۔ ایک دو بار تو وہ بال بال بچے تھے۔ مستقیم نے کچھ دن دانستہ حالات میں اس کے شہر میں اس کے کارناموں نے لپٹل چا کے رکھی ہوئی تھی۔ مگر پھر ساتھیوں کے ہمدردی پر اس نے نسبتاً چھوٹے پیمانے پر وارداتیں کی تھیں۔ وہ بھی شہر سے الگ تھلک قصبوں میں۔ مگر وہ بھی جانتا تھا۔ یہیں سے اس کی زندگی نیا موز لے لے گی۔

وہ جو عورت کے وجود سے الرجک تھا۔ جانے کیا تھا اس نازک بدن والی بے انتہا خوبصورت عورت کی لڑکی میں کہ وہ اپنی زندگی کا دوسرا بڑا فیصلہ اتنا اچانک کر گیا۔ اور اسے لگا تھا۔ اس کی زندگی بدل گئی تھی۔ وہ عالم برزخ سے جنت میں آ گیا ہے۔ دیا کی محبت اسے اپنے روم روم میں بسی محسوس ہونے لگی تھی۔

جہاں چمکتی تھی وہ ماکھا تھا۔ وہ اس جانب نہ آتا تو کیا کرتا۔ اس نے اس راستے کو اپنا لیا۔ جس پر چلنے کے اس نے خود سے عہد باندھے تھے۔ اب اسے اگر اپنا یا تھا تو اس کے اندر کوئی ملال نہیں تھا۔ دنیا کو وہی لوٹانے جا رہا تھا جو اسے زبردستی دیا گیا۔ بلکہ اس پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ اسے اب اس بات پر دکھ اور افسوس بھی نہیں تھا کہ معاشرے کی نا انصافیوں اور انسانی رویوں کی بد صورتی نے اس سے اس کی سادگی اور معصومیت چھین لی تھی۔ اس کی شرافت کو اس کی کمزوری اور بزدلی سے تعبیر کیا گیا تو شرافت اور نرمی سے نفرت ہو گئی۔ اس معاشرے کو، ان لوگوں کو شرافت کی زبان سمجھ نہیں آتی تھی۔ اس نے ہاتھ میں ڈنڈا پکڑ لیا۔ کل تک دنیا اسے آگے لگائے پھرتی تھی۔ اب وہ دنیا کو اپنے آگے نکال کر بٹا کر کھڑا کیے ہوئے تھا۔

☆ ☆ ☆

ماکھا اپنے علاقے کا بد معاش تھا۔ جگائیس وصول کیا کرتا اور چھوٹی موٹی چوریوں کرتا۔ مگر کسی راگیر کو کسی سنان جگہ پہ گھیر کر رو اور دکھا کر پیسے نکلوا لے۔ یا موٹا بٹل چھین لیا۔ مستقیم بھی اس کے زیر نگرانی آیا تو اس کے نقش قدم پر چلنے لگا۔ اب کیا ٹھٹھ کی زندگی تھی۔ وہی لوگ جو کبھی اسے ہاتھ آ نکھیں دکھاتے تھے۔ اب اس سے دہشت کھانے لگے۔ بد کنے لگے۔ وہ جہاں سے گزرتا۔ لوگ بدل لیتے۔ کس میں جرأت تھی اس کے سامنے آنکھ اٹھانے کی۔ ماکھے کے اور بھی ساتھی تھے جن کے اثر تھے۔ راجو، حسام، سالار، امانت یہ سب بھی کم و بیش مستقیم جیسے حالات کا شکار ہو جاتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر نوکری نہیں تھی۔ گھروں اور رشتوں کے دھکے اور ڈسے ہوئے۔ ماکھا سب کا باپ بن گیا تھا۔ مگر مستقیم کو خاص سمجھتا۔ خصوصی اہمیت سے نوازتا۔

سب جانتے تھے خلیفہ مستقیم استاد کا چہیتا ہے اور وہ اسے سر آنکھوں پر رکھتا ہے۔ چھٹی خصوصی رعایت حاصل تھی۔ باقی سب اس سے دبتے۔ ماکھے کے تعلقات بہت بڑے بڑے لوگوں سے بھی تھے چاہے وہ پولیس میں ہوں یا سیاست میں۔ وہ ہر کرپٹ انسان کا سنگی بنی تھا۔ چھٹی کام آتا اور بھاری معاوضہ وصول کرتا۔ اپنے مقاصد بھی وہ ان بڑے لوگوں کی بدولت بہت سے حاصل کر لیا کرتا تھا۔ مستقیم کی جیل سے ضمانت اسی تعلقات کا شاخسانہ تھی۔ ورنہ اس کا نام یوں چپ چاپ مٹ نہ ہوا ہوتا۔

ماکھے سمیت اس کے سب ساتھی شراب اور شباب کے رسیا تھے۔ ہر تیسرے دن ان کی میٹھی میں مٹھلیں جیتیں۔ پھر دھیانہ کھیل رچایا جاتا۔ جس میں مستقیم نے ماکھے اور امانت کے ساتھ

ہوتی تھی۔ ایسی مقناطیسی کشش جس کے تحت وہ بے اختیار ہوتا چلا گیا تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ اسے کبھی بھی دیا کا تحضر برداشت نہیں لگتا تھا۔ وہ اسے اس کے ہر رویے میں حق پہچانتی سمجھتا تھا۔ اسے پورا یقین تھا وہ اپنی بے پایاں، انمول اور بے حد پر خلوص محبت سے اس لڑکی کا دل جیت لے گا۔ اک دن آئے گا جب وہ بھی اس طرح اس سے محبت کرے گی۔ اسے اسی دن کا انتظار تھا۔ مگر اک بار پھر اس کا بھرم ٹوٹ گیا۔ سنے بکھر گئے۔ اس نے جانا وہ کتنا خوش فہم تھا۔ وہ آج بھی احمق ہی تھا۔

وہ آج بھی اپنی زندگی کے اسی مقام پہ کھڑا تھا جب اس کے جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ اس کے محبت بھرے دل کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ وہ ابھی تک اس قسمت کے چکر سے نہیں نکل سکا جس میں جتنا ہو کر ابونے اسے ایک چوراک ٹھیرا کھتے گھر سے نکالا تھا تو امی نے اسے اپنے بڑھاپے کا بیڑا ڈبو دینے والا جان کر اپنے دل سے، نہ وہ اس کرب سے نکلا تھا۔ نہ وہ اب اس لذت سے باہر آ سکتا تھا۔ حقیقت اپنی تمام تر برائی کے ساتھ تیز دھار تلوار بنی اسے بار بار ذبح کرتی تھی۔ اس کا جی چاہا۔ زندگی کی اتنی اہم بازی پھر سے ہار جانے پر وہ بچوں کی طرح سے ایڑیاں ہڈی رگڑ کر روئے۔ تھا کوئی اس سے بڑھ کر بھی دوسرا بد نصیب اس دنیا میں۔ ہر محرومی کو سنے میں چپ چاپ چھپا لینے کے بعد اس نے کتنی چاہ سے اک معصوم بچے کی طرح سے ہی دیا کے آچل میں ہاتھ ڈھونڈی تھی۔ سکھوں، خوشیوں، سکون کی چاہ لے کر، لیکن اس نے اپنا آچل ہی سیٹ لیا تھا۔ اور ان کے وجود کو حالات کی کڑی دھوپ میں جھلنے کو چھوڑ دیا۔ اس نازک لڑکی جس کی شکل میں معصومیت بے دریائی کا خالص پن رہا تھا دل کی کتنی سفاک نکلی تھی۔ اسی دنیا کی طرح جس نے اسے ان نوبتوں کو پہنچا دیا تھا اور ذرا بھی تاسف میں جتنا نہیں ہوتی تھی۔ اس کا دل بے مانگی اور شدید کرب کے ہمراہ سسکتا چلا گیا۔ تمام زخم پھر سے ٹسک دے گئے۔

بھڑیے کی فطرت سے وحشتیں نہیں جانتیں
زور ٹوٹ جاتا ہے عادتیں نہیں جانتیں
دانت جاتے رہتے ہیں خصلتیں نہیں جانتیں
شہر کی شریعت میں خون بہانے والوں کو
خون بہا بھی ملتا ہے اک شکار کرنے پر دوسرا بھی ملتا ہے
اڈوھے کے مذہب میں بے اماں کینوں پر

اپنی تصرف کا حق ہمیشہ رہتا ہے
سمدے کی آنکھوں میں عمر پوری ہونے تک
زور حرص رہتی ہے
سانپ کی طبیعت پر ستم رسیدہ لوگوں کا
کوئی غم نہیں ہوتا
سانپ کے لیے کوئی بھی محترم نہیں ہوتا
کچلیں بدلنے سے زہر کم نہیں ہوتا

اس ستم گزیدہ انسان کو اس سفاک دنیا نے پھر گہرے دکھ گہرے رنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیا وہ اب بھی، تم نہ کرتا؟ کیا وہ اب بھی نہ روتا؟

☆ ☆ ☆

دیانے کروٹ بدل کر دروازے کے باہر نگاہ کی۔ وہ اسے اسی کیفیت اسی پوزیشن میں ساکن کھڑا نظر آیا۔ جیسے پچھلے چھ سات گھنٹوں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ تھکتا بھی نہیں تھا یا خود لذتی کا شکار ہو رہا تھا۔ دیا اندر سے مضطرب ہونے لگی۔ موسم بہت سرد تھا۔ اسے ٹھنڈ لگ سکتی تھی۔ اسے بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ اسے مستقیم کی فکر ہو رہی تھی۔ بالآخر وہ رو نہیں سکی اور بستر کے ساتھ کمرے سے بھی نکل کر باہر چلی آئی۔ باہر سرد برقیلی ہوائیں تھیں۔ جو اس کی مثال کے پلو اور اس کے کھلے بالوں کو اڑانے لگی تھیں۔

”مستقیم! کیوں کھڑے ہیں یہاں؟ اندر چلیں، جھک گئے ہوں گے۔ لیٹ جائیں ذرا۔“
وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہوئی اور اپنا نازک ہاتھ بہت اپنائیت آمیز انداز میں اس کے بازو پر رکھا۔ سگریٹ کے کش لیتے مستقیم نے اپنی دہکتی ہوئی لبورنگ آنکھوں سے اک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور جواب دینے بنا پھر سے تاریکیوں میں گھورنے لگا۔ انداز مخاطب تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ تم سے آپ کے دربار پر فائز ہو گیا تھا۔ یہ معمولی انقلاب نہیں تھا۔ مگر وہ غور کرتا تو ہی سمجھ بھی پاتا۔ وہ تو اس پل خود اپنے آپ سے بھی روٹھا ہوا تھا۔ دیا نے اس نظر اندازی و خاموشی کے جواب میں اسے دھیان سے دیکھا۔ پھر گہرا سانس بھر کے دوبارہ اسے مخاطب کر لیا۔

”کیا کہہ رہی ہوں میں؟ سن کیوں نہیں رہے آپ؟“

”اب کی مرتبہ وہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ گویا کہ زبردستی توجہ حاصل کرنی چاہی۔“

"تم جا کے سو جاؤ۔ میری فکر چھوڑ دو۔"

وہ بالآخر بولا۔ مگر آواز بے حد بھاری ہو رہی تھی۔ دیا نے اس کی ناراضی صاف محسوس کی تو مسکرانے لگی۔

"نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ باہر ہیں تو مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔"

اس نے لاچارگی ظاہر کی۔ یہ بھی عام بات نہیں تھی مگر وہ پھر بھی نہیں چوٹا۔ اور اس پیش رفت کو سمجھے بغیر سابقہ انداز میں گویا ہوا تھا۔

"تمہیں میری موجودگی میں بھی نیند نہیں آتی۔ میرے خرافوں کی وجہ سے۔"

"اب آ جاتی ہے۔ میں عادی ہو گئی ہوں آپ سمیت آپ کی ہر عادت کی۔"

بات ایسی تھی کہ مستقیم بالآخر چونک کر رہ گیا۔ کش لینا بھول کر اس نے دیا کو دیکھا تھا۔ وہ بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ پہلی بار اس نے نگاہ نہیں چرائی۔ بلکہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ بہت پیاری تھی یہ مسکان۔ صلح جو، اپنائیت کا احساس دلاتی ہوئی۔ دوستی کی ابتدا کرتی ہوئی۔ مستقیم نے ہونٹ ہنسنے ہوئے نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا۔ دیا یوں فتح مندانہ انداز میں مسکرائی۔ جیسے اپنے محاذ پر اسے پہلی بار پہنچا کیا ہو۔

"تم نے میڈیسن یوز کی؟"

اب وہ اسے دیکھے بغیر سوال کر رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ اور کروں گی بھی نہیں۔"

"کیوں؟"

وہ دحازہ اور اسے گھورنے لگا۔ دیا محال ہے جو خائف ہوئی ہو۔ بدستور مسکراتی رہی۔

"اس کا جواب تو ہے میرے پاس؟ مگر میں دوں گی نہیں۔ غفلت ہیں تو خود سوچ لیں۔"

وہ مزے سے کہہ کر اندر جانے لگی تھی جب مستقیم نے جھپٹنے کے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی روکا۔ وہ پلٹ کر پھر اسی سکون سے اس کی آنکھوں میں ٹپکنے لگی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں تم قتل جیسے گناہ سے بچنا چاہتی ہوگی۔ مگر واضح رہے اس گناہ کو کیے بغیر تم اپنی مصیبت سے چھٹکارا بھی حاصل نہیں کر سکتیں۔"

وہ جھک کر کہہ رہا تھا۔ دیا نے گہرا طویل سانس بھر کے سر کو نفی میں جنبش دی۔

"اوہہ۔۔۔ یہ وجہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا وجہ ہے؟ بتاؤ مجھے۔"

وہ ضبط کھو کر چیخ پڑا۔ رنگت پھر وہک کر انگارو ہونے لگی۔ دیا اسے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر لاٹھی پھینک کر شرمیلیں مسکان سمیت آہستگی سے بولی تھی۔

"شاید۔۔۔ شاید۔۔۔ مجھے اس دنیا میں آنے والے اپنے بچے کے باپ میں محبت ہوگئی ہے۔"

وہ جھپٹتی تھی اور اپنا ہاتھ اس سے چھڑا کر اندر بھاگ گئی۔ مستقیم اک پلے کو ہونق اور بھونچکا ہوا۔ پھر ملے جلے جیسے اس کے طلق میں کڑواہٹ بھر گئی تھی۔ وہ قبر ساماں تاثرات چہرے پر لیے تنہا ہوا۔ اندر آیا تو دیا بستر پر بیٹھی تھی۔ ناخنیں نیچے لٹک رہی تھیں جنہیں وہ جان بوجھ کر جھلاتی تھی۔ ہونٹوں پر ہنر مسکان کی جھلک تھی اور آنکھوں میں کمال درجے کے سکون کی کیفیت۔ اس کا ہر رنگ ڈھنگ ہی بڑا ہوا تھا۔ مستقیم کو مزید آگ لگ گئی۔

"جھوٹ بولتی ہو تم۔ بکو اس کرتی ہو۔"

وہ اس کے سر پہ ہنر کر دحازہ۔ مگر دیا نے مطلق جو پرواہ کی ہو۔ الٹا اسے تاؤ دلاتی نظروں سے دیکھ کر بالخصوص مسکراتی پھر گہرا سانس بھرا تھا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے اور بکو اس کرنے کی؟ یاد کریں۔ آپ نے کتنی بار پوچھا تھا مجھ سے ماضی میں؟ اگر جھوٹ بولنا ہوتا تو تب بولتی۔ مگر مجھے ضرورت نہیں تھی۔ پھر آپ کو اب اعتراض کیوں ہے آخر؟ کیا میں محبت نہیں کر سکتی؟"

وہ کتنی مصممیت سے آنکھیں پھپھنا کر سوال پہ سوال کر رہی تھیں۔ جو مستقیم کو سراسر اداکاری محسوس ہونے لگی۔ جھنجھلاہٹ اور جھلاہٹ سے بھر گیا تھا۔

"مجھے نہیں ہے۔ تم یہ رنگ ڈھنگ کیوں اپنا رہی ہو؟ مگر مجھے اس دھوکے میں پڑنے کی ضرورت لگتی ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ کرو جو میں چاہتا ہوں۔"

اس نے نیت میں اس کا چہرہ اپنے فولادی ہاتھ میں بھینچ کر ہڈیانی انداز میں چلاتے ہوئے کہا تھا۔ دیا نے کوئی مزاحمت نہیں کی اپنا آپ اس سے چھڑانے کو اسی سکون سے اسے بھتی رہی۔

تب مستقیم نے ہی جھنجھلا کر اسے جھٹک دیا تھا اور خود زور زور سے پاؤں مارتا پھر باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

دیا کو قطعی سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ ایسا کیا کرے کہ خلیفہ مستقیم اس کٹھن راہ سے واپس پلٹ آئے۔ اس کی جھکی شفاف، تیزکاتی فطرت تہہ در تہہ گناہ کے احساس سے دھندلائی گئی تھی اور برسوں کی

تربیت کے سارے رنگ وقتی مایوسی، قہر اور طیش کی بدولت ڈوب گئے۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہ جان پائی اگر کل کمرے کی صفائی کے دوران مستقیم کی ذاتی ڈائری نہ اسے مل گئی ہوتی۔ اس صبح کے وہ سارے دکھ رقم تھے جو اسے اصل اور صحیح راستے سے ہٹانے کا محرک بن گئے تھے۔ کچھ دیر پہلے دیا بھی دکھ کی شدتوں سے بالکل شل ہو کر رہ گئی تھی۔ صحیح معنوں میں اسے خلیفہ مستقیم پر رحم آیا۔ ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ اتنا قصور وار تو نہیں تھا جتنا وہ اسے سمجھتی تھی۔ بلکہ وہ اسے ظالم کی بجائے مظلوم کٹنے لگا تھا۔

کچھ دیر وہ اس کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ رات کو بھی نہیں آیا تو دیانتداری کا شکار ہوئی۔ کھوجتی دوسرے کمرے تک آئی تھی۔ وہ وہیں تھا۔ فرش پر بستر پر چٹ لیٹا، دونوں بازو آگے دھرے۔ دیا کو اس کا یہ لٹا پٹا انداز کچھ اور بھی پر ملال کر کے رکھ گیا۔

”مستقیم!“ اس نے اسے پکارا اور دروازے سے اندر آگئی۔ مستقیم ذرا سا چونکا مگر نہ اسے دیکھا۔ وہ اس کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔ مستقیم نے آنکھوں سے ہاتھ بنا کر اسے سپاٹ نظروں سے دیکھا تھا۔

”میری مرضی۔“ انتظار والی اہم بات کا جواب اس نے دینا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟ پلیز انھیں یہاں سے۔“ دینے اس کی رکھائی و بے اعتنائی کے جواب میں بھی ہمت ہارے بغیر اس کا ہاتھ پکڑ کر مستقیم یکدم بہت غصے میں آ گیا تھا۔

”تجھے شک مت کرو دیا! جاؤ۔ تنہا چھوڑ دو مجھے۔“ اس کی آنکھیں تک برہمی کا تاثر لیے ہوئے تھیں۔ مگر دیا کے پاس اس کی بے پناہ محبت محفوظ تھا۔ جیسی نہ اعتماد دکھایا نہ پزل ہوئی۔

”تو آپ نہیں آئیں گے؟“ وہ زبردستی اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”نہیں آؤں گا۔ کہہ دیا ناں۔“

وہ جواباً زدنے پن سے تڑخ کر بولا تھا۔ تب دینے کا منہ اچکائے اور خود بھی اس کے پہلو میں آگئی۔ ”اوکے۔۔۔ ایز یو ڈش جناب! پھر میں بھی یہیں رہتی ہوں۔ آپ کے ساتھ۔ آپ کے پاس۔“ اس کا انداز گمن تھا۔ جسم تھا۔ مطمئن تھا۔ جیسی مستقیم ہتھے سے اکھڑنے لگا۔

”فائن! پھر میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔“ وہ غصے میں کہتا جیسے ہی اٹھا۔ دیا نے بے ساختہ قسم کی گھبراہٹ کے ساتھ اس کی کھائی دونوں ہاتھوں میں جکڑ لی۔ اس کی گرفت میں جیتابی بھی تھی اور اضطراب بھی۔ استحقاق بھی تھا اور جوش بھی۔ اب یہ مستقیم پر تھا۔ وہ کس احساس اور جذبے کو تقویت دیتا تھا اور کس کو رد کر دیتا۔

”بھاگ رہے ہیں مجھ سے؟“ وہ مسکراہٹ دبائے کتنی شوخی سے سوال کر رہی تھی۔ مستقیم سلگ گیا۔ ”تم سے نہیں۔ تمہارے جھوٹ سے۔“ دینے نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخیاں گہری ہو رہی تھیں۔

”کھانا؟“ کون سا جھوٹ بولا ہے آپ سے میں نے؟“ وہ بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی۔ ”تم جانتی ہو۔“

”جنتی سے جواب دے کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔“ ”کیا ثبوت ہے آپ کے پاس خلیفہ مستقیم صاحب کہ یہ جھوٹ ہی ہے۔“

”دیکھا ایک رو بائی ہوئی تھی۔ جواب میں خلیفہ اسے اسی ناراضی سے گھورتا رہا۔“ ”آخر آپ خاکف کیوں ہیں محبت سے؟“

”اس لیے کہ مجھے یہی بتلایا گیا ہے کہ محبت کے قابل نہیں ہوں۔“ خلیفہ کا لہجہ زہر سے بھرنے لگا۔ دینے نے سر دھڑکائی۔ ”میں اتنا جانتی ہوں جو آپ کو پوری طرح جان جائے گا وہ آپ سے نفرت نہیں کر سکتا۔“

اس کے پرہیزگار انداز پر خلیفہ مستقیم ٹھنک کر اسے ٹکٹے لگا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کھوج

”کیا مطلب؟“

مستقیم اس سوال پر چونکا پھر گہرا سر و سانس کھینچا تھا اور سر کو نفی میں جنبش دینے لگا۔
 "نہیں... وہ ایک وقتی احساس تھا۔ میں سمجھتا ہوں اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو شاید دنیا کی بری عورتوں کے ساتھ ساتھ میرا اچھی عورتوں سے بھی اعتبار اٹھ جاتا۔ آج تم بھی اس انداز میں میری زندگی میں شامل نہ ہوتیں۔ میرے لیے ہر عورت بے وفا ہوتی۔"
 "شکر ہے۔ آپ کی سوچیں کسی حد تک تو مثبت ہیں۔"
 اس کے سر سے جیسے کوئی بوجھ اتر اٹھا۔ جیسی ہلکی پھلکی ہو کر مسکرائی۔ پھر اسے شرارت سے دیکھتے ہوئے دونوں کہنیاں اس کے سینے پر ٹکا کر اس پر جھک کر آنکھوں میں مچا کھتے ہوئے شرمیلے مکان کے بولی تھی۔

"اچھا بتائیں۔ اگر کسی روٹھے ہوئے کو منانا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟"
 مستقیم نے نظریں اٹھا کر اس کی ستاروں کی مانند چمکتی وکتی آنکھوں کو دیکھا۔ کچھ دیر اسی سنجیدگی سے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ کہے بغیر اپنے جسم کو ایک دم جھٹکا دیا تھا۔ وہ بے توازن ہوئی اور پوری کی پوری اس کے اوپر آن گری۔

"ایسے... بے حد نزدیک آکر۔"

وہ محبت کرتا تھا۔ جیسی اتنی جلدی اتنی آسانی سے مان گیا تھا۔ اس کی بوکھلاہٹ محسوس کر کے زور سے ہنسا تھا اور اسے بازوؤں کے حصار میں جکڑ کر خود سے قریب کر گیا کہ دیا کی جھپنی ہوئی ہنسی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی تھی کہ اس نے جان لیا تھا کہ دل کی زمین ایک بار بھر ہو جائے تو پھر کوئی موسم بھول کھانے نہیں آتا۔ چاہے آنے والا وقت کتنی ہی مہربانیاں کرے۔ کوئی کتنی ہی دلداریاں کرے۔ دل میں جو جذبے مری جائیں۔ وہ پھر زندہ نہیں ہوتے اور دیا کو اسے اس کے دل کو مرنے سے بچانا تھا۔ اس لیے بھی کہ اس بھری دنیا میں صرف وہی تھا جو اس کا اپنا تھا۔ صرف وہی تھا جو اس کا مرہم تھا۔

"تھینک گاڈ! آپ کو یقین تو آیا میری بات کا۔ ورنہ میں سمجھ رہی تھی پتہ نہیں کتنی نہیں کرائیں۔"
 دیا اس کے کاندھے پر سر رکھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی جواب آمیز مکان سے بولی
 "مستقیم نے اسے نرمی اور کسی قدر خشکی سے گھور کر دیکھا۔
 "اپنے جیسا کیوں سمجھتی تھیں مجھے؟"
 جواب میں وہ کھٹکھٹا کے ہنس پڑی تھی۔

اب کے وہ اسے کڑی نظروں سے گھورنے لگا۔ گویا حقیقت اگلوانا چاہی۔
 "وہ... اتفاقاً میں نے آپ کی ڈائری پڑھ لی ہے سارے حالات جانے میں تو آپ بھر قصور لگے مجھے۔"
 اس وضاحت پر مستقیم یکدم دھیما پڑتا ہر بھری مسکراہٹ سے اسے نکلنے لگا۔
 "پھر تمہیں اسے بھردی کا نام دینا چاہیے تھا۔ محبت کا نہیں۔"
 اس کی آنکھوں میں دکھ سے بھرا ہوا طعنے چکنے لگا۔ دیا ایک دم سے لاجواب ہو گئی۔
 ہونٹوں پر مجروح مکان نے جگہ بنائی۔ گویا کہہ رہا ہو۔
 "میں غلط تو نہیں سمجھ رہا تھا۔"
 وہ اسے کچھ دیر یونہی تکتا رہا پھر اسی نرمی انداز میں مسکراتے ہوئے بے حد بھاری آواز میں
 "ا۔"

نہ ساتوں میں تپش کھلے
 نہ نظر کو وقف عذاب کر
 جو سنائی دے اسے چپ سکھا
 جو دکھائی دے اسے خواب کر
 میرے صبر پہ کوئی اجر کیوں؟
 میری دوپہر پہ کوئی ابر کیوں
 مجھے اوڑھنے دے اذیتیں
 میری عادتیں نہ خراب کر

اس درجہ دل شکن الفاظ اور دل گیر انداز پہ دیا کی آنکھوں میں نمی بھرتی چلی گئی۔
 کے فی الحال قابل نہیں رہ سکی تھی۔ کیسا الیہ تھا۔ اک بہترین انسان تباہ کر دیا گیا تھا۔
 ذاتی اور معمولی مفاد کے پیچھے۔ وہ یہ سوچ کر آزرده ہوتی رہی کہ مستقیم کی احساس محرومی
 اور دھوکے سے شکستہ شخصیت کو دوبارہ سے نکھارنا اور ان پیچیدہ راستوں سے ہٹا کر بھرے
 راہوں پر لانا ہرگز اتنا آسان نہیں۔ وہ جس دلدل میں پھنس گیا تھا اس سے نکلتا اگر ممکن
 مشکل بہت مشکل ضرور تھا اس نے ہونٹ زبان پھیر کر ترکیے اور ہمت کر کے پھر اسے
 "آپ نے اپنی امی کو بھی ابھی تک معاف نہیں کیا؟"

"مان لیا جناب! آپ بہت اچھے ہیں۔"

"وہ تو میں ہوں۔"

مستقیم نے گردن اٹھا کر پورے اعتماد سے تعریف و مصل کی تو دیا نے مسکراہٹ دہائی۔

"ہمیشہ ایسے ہی اچھے رہیے گا۔"

"ہمیشہ رہوں گا۔" اس نے سر تسلیم خم کیا۔

"ہمیشہ میرا اتنا ہی خیال بھی رکھنا ہے۔" اس کی مسکان گہری ہوئی۔

"ہمیشہ رکھوں گا۔" مستقیم مودب تھا۔

"کبھی بھی بدلے کا نہیں۔" وہ اس کی ناک پیار سے دبا کر بولی۔

"ناممکن۔۔۔ کبھی نہیں۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" وہ ہنسا۔

"اس مان اور محبت میں کمی بھی نہیں آتی چاہیے سن لیں۔" اس نے بروقت اک اور عہد لیا۔

"بے فکر رہو۔ کبھی شکایت نہیں ہوگی۔" وہ پر یقین تھا۔

دیا نے مزید کچھ نہیں کہا مسکراتی رہی۔ خلیفہ نے اسے شرارتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"ہوگی حلف برداری کی تمام شرطیں پوری؟"

وہ جواباً ذرا سا کھسپائی اور گردن ہلا دی۔

"کیا میں بھی کوئی مطالبہ منوا سکتا ہوں ملکہ عالیہ سے؟"

"فی الحال تو اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتہ ہے آپ کے مطالبات عجیب و غریب ہوں گے۔"

اس کے ناک چڑھا کر نخوت سے کہنے پہ مستقیم کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"اف۔۔۔ زوجہ تم بہت چالاک ہو۔ میں خواہ مخواہ تمہیں اب تک معصوم سمجھتا رہا۔"

اور جواباً وہ ہنسی کی جلت رنگ بجاتی رہی اور مستقیم آسودگی بھری مسکان سے اسے نکلتا رہا تھا۔

"آپ کو مطالبات منوانے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ آپ کا ہر جائز حکم سر آنکھوں پر رکھوں گی۔"

مستقیم! میں اپنے فرائض پہچانتی ہوں۔ میری محبت بلا شرکت غیرے آپ کے نام ہے۔ مجھے

وفا داری آپ سے منسوب ہو چکی۔ اس پوری دنیا میں صرف آپ خاص ہیں میرے لیے۔ بہت اچھے

بتائیے کچھ اور بھی چاہیے آپ کو اس کے سوا؟"

وہ سوال کر رہی تھی اور مستقیم اس لوٹ لینے والے انداز پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ وہ سر کوئی تپا

بلا تے شوخ انداز میں مسکراتا ہوا گنگنا نے لگا۔

اس کے لب اور وفا کی قسم

واہ کیا قسم ہے خدا کی قسم

اس نے عقیدت بھرے انداز میں جھک کر دیا کے ہونٹوں پر مہکتا ہوا بوسہ ثبت کیا۔ دیا نے

پہچیں موند لیں۔ بیتاب، بے قرار دل کے اک کونے میں سہی مگر طمانیت کا احساس بہت گہرائی

میت اتر آیا تھا۔ تن بدن میں ٹھنڈی آبر کا جھرنا جاری ہو گیا۔ پہلی بار اسے اپنا آپ اس کے

دردیک اچھا کہ دل میں یہ خیال پختہ ہو رہا تھا۔ وہ افسوس تھی۔ پسند کی گئی تھی۔ چنی گئی تھی۔ یہ وہ شخص

تھا جس نے اسے خاص سمجھا تھا۔ اتنی اہمیت دی۔ اتنی محبت محسوس کی کہ اس کے بغیر رہنے کا تصور محال

لگا۔ جی اپنی تکمیل کر لی۔ آنکھوں کی سونیاں نکلیں تو نظروں کو وہ چہرہ اجملا گئے لگا۔ جس سے دل جانے

سب چپکے سے اتنا مانوس ہو گیا تھا جس کی نظریں ہمیشہ اس کی بلائیں لیتیں اور واری صدقے جاتی

ری تھیں۔ جو کہتا تھا۔

"کیسے ممکن تھا کہ میں تمہیں دیکھتا اور تم سے پیار کیے بنا رہ جاتا۔ تم بتائی ہی چاہنے کے لیے گئی

تھیں۔ تم بتائی ہی میرے لیے گئی تھیں۔"

جو کہتا تھا پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ۔

"تم مجھ سے محبت کرو گے۔"

"میری قربت میں رونے والی لڑکی اک دن آئے گا میری رفاقت میں بھر پور آسودہ بھی ہو

گے۔" اور وہ جیت گیا تھا۔ اس کی خواہش تکمیل پا گئی تھی۔ اسے مستقیم کی باتیں اس کی قربت کچھ بھی

مان نہیں لگ رہا تھا۔ یہ تبدیلی جیسی بھی تھی۔ مگر بہت اچھی تھی۔ اس نے پہلی بار جانا من چاہے مرد کا

لگا نکال دیا اور کسی قدر ہوشربا ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ متعدد بار پہلے بھی اس سے قریب ہوا تھا مگر دیا

بھی یہی دل بندھا کر دینے والی جاہ کن سنسنی خیز لہر بدن میں اٹھتی محسوس نہ کر سکی تھی۔ جو کیف آج

فیض مستقیم کے شائستگی جملوں نے اس کے ریشے ریشے میں سمودیا تھا۔

"میں اپنی شادی کے دن نہیں، درحقیقت آج ہیٹا ہوں نا دیا! تمہارا دل میرا ہو گیا ہے۔ اس

سے نہ ہی بھی کوئی کامیابی ہو سکتی ہے۔"

اس پر جھک کر وہ اسے کتنی وارفتہ نظروں سے نکلتا سرشار لہجے میں گویا ہوا تھا۔ دیا نے اس کی

بلائی کا حلقہ محسوس کیا تو ذرا سا کسمپاسی۔ کتنے خوبصورت رنگ تھے اس کے چہرے پر۔

قالب ہنرم، گہرا ہٹ، حیا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ زبان اس لیے لڑکھرائی تھی کہ مستقیم کے نرم گداز تاثرات پتھریلی سنجیدگی میں ڈھل گئے تھے۔ کچھ کہے بغیر وہ ایک جھٹکے سے اٹھا تھا کہ دیا نے سرعت سے اس کا مضبوط پردہ ہاتھ اپنے نازک موی سفید ہاتھ میں پکڑ لیا۔
”مستقیم آپ۔۔۔“

”بہتر ہو گا دیا کہ ہم اس موضوع پر کبھی بات نہ کریں۔ مجھے امید رکھنی چاہیے کہ میری بیوی میرے لیے دانستہ اذیت کا سامان نہیں کرے گی۔ میرے ان زخموں کو نہیں کریدے گی جن پر بڑی مشکل سے کھرٹا آسکے ہیں۔“
اپنی بات مکمل کر کے وہ رکنا نہیں تھا اور دیا سر قہام کر بیٹھ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ بے وقت سو گئی تھی۔ جیسی رات کا کھانا تیار کرتے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ بریانی دم پہ لگا کر اس نے کمر پہ ہاتھ رکھ کے کچھ دیر خود کو سکون کی کیفیت میں رکھنا چاہا۔ آج کل وہ کمزوری بہت محسوس کرنے لگی تھی۔ ذرا سا کام کر کے ہی تھک جاتی۔ اس وقت بھی کمر سیدھی کرنے کے خیال سے کمرے میں آئی تھی۔ مگر مستقیم کی تیاری دیکھ کر آرام سرے سے بھول گئی۔ اس کی جگہ فکر اور اضطراب نے لے لی۔

”کہیں جا رہے ہیں آپ؟“

بلکہ جیہ شرت میں اس کا لباس تھا نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ اتنا تو جانتی ہی تھی کہ جب وہ لوگ ڈاکے کی نیت سے نکلتے تھے جب ہی سیاہ لباس استعمال کرتے تھے۔ اس کا دل سینے میں دھڑ دھڑانے لگا۔ گویا آج وہ امتحان کی گھڑی آگئی تھی۔ جس کا وہ خود بھی انتظار کر رہی تھی۔ جب اسے اپنے نام کا حق ادا کرنا تھا اور گھپ اندھیرے میں اپنی روشنی پھیلا کر اس غافل تارکی کو دور کرنا تھا۔ اس نے کتنے الفاظ سوچے تھے۔ مستقیم کو سمجھانے، باز رکھنے کو۔ مگر اب وہ جیسے ایک دم خود کو بے دم سا محسوس کرنے لگی تھی۔

”جہیں پتہ تو ہے۔ میری جان! پھر فائدہ ان سوالوں کا۔“

مستقیم معرّف رہ کر بولا۔ اس کا سارا دھیان اس وقت اپنے کام میں تھا۔ وہ ریو اور کے چیمبر میں گولیاں چیک کرنے کے بعد اسے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ رہا تھا۔ جب دیا نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔

اس کی شریانوں میں دوڑتے خون میں اک لذت آمیز حدت شامل ہو گئی۔
”کتنا شرماتی ہو تم۔“

وہ اس کے گال پر چٹکی بھر کے بولا۔ دیا نے جھینپ کر ہاتھوں میں چہرا چھپا لیا۔ مستقیم محبوب کیفیت پہ مغلوط ہوتا ہوتا چلا گیا۔ بہت طمانیت آمیز تھی اس کی فہمی۔

☆.....☆.....☆

مستقیم اندر آیا تو اسے سر جھکانے بستر کی چادر کے ڈیزائن پہ بے خیالی میں انگلی پھیرتے ہوئے اپنی ہی سوچ میں گم پایا تھا۔ وہ اسے چونکا نے کو دانستہ کھنکارا اور آگے بڑھ کر الماری کھول کر کوا گیا۔ لا کر کھول کر کچھ چیزیں الٹ پلٹ کیس پھر دو بارہ سے لاک لگا دیا۔ چابی جیب میں ڈال کر تو اسے ہنوز اسی پوزیشن میں پا کر ٹھنکا۔

”دیا! کیا سوچ رہی ہو؟“

اس نے بے حد ملاکت سے اس کا گال سہلایا تھا۔ دیا سر اٹھا کر کچھ دیر بے خیالی میں رہی۔ پھر جیسے تھک کر گہرا سانس بھرا۔

”مستقیم! آپ کو نہیں لگتا کہ ہم ایک نارمل زندگی نہیں گزار رہے؟ ریلی! مجھے تو بہت غور

ہونے لگی ہے۔“

وہ لمحہ بھر کو تھمی اور جیسے اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اپنی ہی بات کی وضاحت کے اس سے اک اور سوال کر دیا تھا۔

”آپ کو اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی؟“

مستقیم کی آنکھیں یکدم ہی شرارت سے چمکنے لگیں۔ اس نے سر کو فہمی میں جنبش دی تھی۔

”پہلے ہوتی تھی۔ جب تک تم میرے پاس نہیں تھیں۔ اب میں مکمل طور پر آسودہ ہوں۔“

”نام ہے بس سچ میں، پھر ہمارا بچہ بھی ہو گا۔ کیا کی رہے گی بھلا۔“

اور دیا ایک دم جھینپ سی گئی۔ بات ہی ایسے ٹریک پر چلی گئی تھی کہ وہ نزوں ہونے لگی تھی۔ مستقیم بہت دلچسپ نظروں سے گمن ہو کر اس کی حیا سے لرزتی لانی پلکیں اور گالوں کی شکنیں

”میرا مقصد آپ کے دیگر رشتوں سے تھا مستقیم! آپ کی امی! اور۔۔۔ اور۔۔۔“

”مل تو سکتے ہیں نا؟“

"ایک بات بائیں گے؟"

وہ یکدم اس کے سامنے آگئی۔ اس کی آنکھوں میں کتنی آس تھی۔

"بولو جان!"

مستقیم نے مسکرا کر گویا اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

"آج کہیں مت جائیں۔ میرے پاس رہیں پلیز!"

پہلا مرحلہ تو اسے روکنے کا تھا۔ وہ اگر رک جاتا تو سمجھا بھی سکتی تھی۔

"کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

وہ ایک دم متشکر نظر آنے لگا۔

"ہوں، ٹھیک ہوں۔ بس رات کو تنہائی کے خیال سے بہت وحشت ہوئی ہے۔"

"تم دوا لے کر سو جانا۔ میں اتنے دنوں سے تمہارے ساتھ ہی تو تھا۔"

وہ رینگس ہوتے ہوئے اس کا گال نرمی سے سہلا کر محبت سے کہہ رہا تھا۔ دیا نے جواباً بے چین

ہوتے ہوئے اسے دیکھا پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

"میں ہمیشہ۔ ہر وقت آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں مستقیم!"

وہ اس کے بازو سے لگ کر لرزتی آواز میں بولی۔ مستقیم اس کے اندر کی کیفیت کے برعکس اس

انداز دلربائی پہ نہال ہو کر رہ گیا تھا۔

"فکر کیوں کرتی ہو سویت ہارٹ! میں جہاں بھی چلا جاؤں۔ تمہارے پاس ہی ہوتا ہوں دیا!

مگر دیکھو نا جانو! کام کو بھی تو وقت دینا ہوتا ہے نا۔"

وہ اسے بہلا رہا تھا۔ دیا سر کو اٹھا کر چلتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ۔۔۔ آپ یہ کام چھوڑ دیں پلیز مستقیم! میرے دل کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔ مستقیم خود بھی مضطرب ہوا۔

"یہ چھوڑ دوں تو پھر اور کیا کروں۔"

وہ زخمی انداز میں مسکرا کر سوال کر رہا تھا۔

"کچھ بھی۔۔۔ کچھ بھی۔۔۔ لیکن یہ نہیں۔۔۔ پلیز۔۔۔ پلیز مستقیم!"

وہ باقاعدہ رونے لگی۔ مستقیم کے اعصاب بری طرح سے کشیدہ ہوئے تھے۔ اس نے دیا کا

ہاتھ پکڑ کر اسے بستر پر بٹھایا۔ جگ سے گھاس میں پانی نکال کر اس کے منہ سے لگایا جسے ہیزا کی

دیا نے پرے ہٹا دیا تھا۔ وہ بہت مضطرب ہو رہی تھی۔

"میں ایک ان دیکھے جال میں پھنس چکا ہوں دیا! اس سے چاہوں بھی تو رہائی ممکن نہیں۔" وہ

جیسے اسے سمجھا رہا تھا۔

"کچھ بھی ناممکن تو نہیں ہے مستقیم! آپ عہد تو کریں۔"

اس کے انداز میں بے چینی بے قراری تھی۔ مستقیم کے چہرے کے عضلات یکدم تن سے گئے

تھے۔

"تم یہ قوف ہو۔ کچھ نہیں جانتیں۔"

اس نے سر جھٹک کر کہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کی نسبت بابت اس کا لہجہ قدرے نرم

تھا۔ وہ اسے ڈانٹ کر اسے ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اس کا مطلب آپ میری بات نہیں مانیں گے۔"

دیا کے انداز میں قدرے فحشی کسی قدر مایوسی اتری۔ مستقیم نے کانٹے جھٹک دیئے۔

"مجبوری ہے بیوی! نہیں مان سکتا۔"

دیا چند لمحے صدمے سے ساکن ہو کر پوری آنکھیں کھولے اسے سمجھتی رہ گئی۔ جبکہ وہ اپنی تیاری کا

آخری ٹیپ دیتے ہوئے بلیک لیدر جیکٹ اٹھا کر پہننے کے بعد چہرے پر باندھنے والا سیاہ کپڑا جیب میں

ٹھونس رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر مجھ سے بھی امید نہ رکھیے گا کہ میں کسی معاملے میں آپ سے تعاون کروں

گی۔" وہ کہتے ہوئے کی طرح چٹ کر کہتی بچوں کی طرح سے روٹھ گئی۔ مستقیم کو اس کے انداز سے بے

تواضعی آنے لگی تھی۔

"نہ ماننا۔۔۔ میں زبردستی کر لیا کرتا ہوں تم جانتی ہو۔"

اس کا لہجہ ذومعنی تھا اور آنکھیں گستاخ۔ لیوں پر شریہ مسکان تھی۔ جسے سمجھتی وہ بے ساختہ قسم کے

غلاب کے زیر اثر بے تحاشہ سرخ پڑ گئی۔ مستقیم نے بہت دلچسپ نظروں سے اس کا یہ روپ دیکھا تھا پھر

گہرا سانس بھر کے اس پر جھکا۔

"اٹنا خیال رکھنا۔ میں واپس آ کے تمہیں منالوں گا۔ بہت پیارے انداز میں۔"

وہ اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں چوم کر ہاتھ بلاتا ہوا چلا گیا۔ جبکہ دیا کا دل اپنی ناکامی پہ

غلیظ طرح سے بھرا آیا تھا۔ گھٹنوں پر سر رکھ کے وہ بے آواز روئے گئی تھی۔

اس کی آنکھ کھلی تو کچھ دیر سسکندی سے یونہی لیٹی رہی۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر بھرپور انگڑائی لیے جیسے ہی اٹھنا چاہا نگاہ اپنے پہلو میں نیم دراز خلیفہ مستقیم سے جا ملی۔ جوبوں کے درمیان سلگتا سگریٹ دابے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں کے اس تصادم پہ بہت پیارے انداز میں مسکرایا۔ جس کا جواب دیئے بغیر وہ بے تاثر نظروں کا زاویہ بدل کر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے لائے کھلے ریٹھی بالوں کو سمیٹ کر جوزے کی شکل میں لپیٹنے لگی۔

”السلام علیکم! صبح بخیر زندگی!“

وہ اس کی جانب سرکا اور اس کے سر پر بوسہ دیا۔ دیا کے دوپٹہ اٹھا کر شانے پر ڈالتے ہاتھ ساکن ہو گئے۔

”وعلیکم السلام!“

وہ جیسے بادل ناخواستہ بولی۔ مستقیم کی مسکان گہری ہوئی۔ اس نے سگریٹ بجھا دیا تھا۔

”کیسی ہو؟“

اس کی آنکھیں روشن اور شوخ تھیں۔ دیا نے ابرو تہہ حاکر اسے دیکھا۔

”مجھے کیا ہونا ہے۔“

”یار تم بہت پریشان تھیں جب میں گیا۔ سارا دھیان تمہاری جانب لگا رہا۔“

”ہاں۔۔۔ کاش یہ دھیان کسی نیکی کی جانب لگا ہوتا۔“

وہ ناچا جتے ہوئے بھی طنز کرتی۔ مستقیم ہنستا چلا گیا۔

”تم سرتاپا نیکی ہو۔ اللہ کی بہت خوبصورت نعمت جو بس میرے لیے اتاری گئی۔“

اس کا لہجہ خوبصورت اور صمیمیت تھا۔ دیا کی آنکھیں جانے کس احساس کے تحت جھپکنے لگیں۔

”اگر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر بات کیوں نہیں مان لیتے؟“

وہ بے حد دکھ میں گھرنے لگی۔ مستقیم بھی سنجیدہ ہوا تھا۔

”میں کہہ چکا تھا کہ یہ ناپک۔“

”آپ کے کہنے سے کیا اسے ختم ہو جانا چاہیے مستقیم! برگز نہیں۔ میں بار بار یہ بات کروں گی۔“

”میں آپ کو جنم کا ایندھن بنتے کیسے دیکھ لوں؟“

وہ پھر سے رونے کی تیاری میں تھی۔ خلیفہ مستقیم عاجز نظر آنے لگا۔

”یار ابھی تو مانی تھیں تم۔ یعنی صحیح معنوں میں شادی شدہ زندگی کا لطف محسوس کیا تھا کہ تم نے؟“

کڑے مطالبات

”اگر آپ چند دن بعد میری بات مان لیں گے تو مجھے اعتراض نہیں۔ میں چھوڑ دیتی ہوں۔“

اس کی نظریں سوال کر رہی تھیں۔ مستقیم نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا گویا اس موضوع پر بات کرنا ہی نہیں چاہتا۔ نہ ہی سننا پسند کرتا تھا۔

”آپ بتائیں آپ کو میری بات ماننے میں کیا عار ہے؟ مستقیم ذرا سی ہمت ہی تو۔“

”تو کیا! ہمارے تعلقات جیسے بھی تھے۔ چل رہے تھے نا۔ تم کیوں اک فضول مطالبہ لے کر اسے زب کرنے پہ تل گئی ہو۔ میں ہر طرح کے حالات پہ سمجھوتہ اور صبر کر چکا ہوں۔ کسی بھی واپسی کا میرا کوئی باروا نہیں ہے۔ اس کلیئر۔۔۔ بہتر ہے تم بھی اس چوڑے کوٹھڑ کر دو۔“

اب کہ ان کا لہجہ سخت اور تنبیہ لیے ہوئے تھا۔ دیا کا چہرہ لمحہ بھر کوفت ہوا پھر وہ رخ پھیر گئی تھی۔

”کیا میں امید رکھوں کہ ہمارے تعلقات خوشگوار رہیں گے؟“

اس کی آنکھوں میں سوال مچلتے دیکھ کر دیا نے سر دھو بھری۔

”میں آپ کی جانب کا سفر اختیار کر کے آپ کے پاس آئی تھی مستقیم! فیصلہ تو اب آپ کو کرنا ہے۔ یہ بات طے ہے۔ میں اپنے مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ است و دیکھے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ پھر وہ اس اہم بات کا رد عمل دیکھنا دیکھنا مگر اس وقت اس کے صدمے کی انتہا نہ رہی تھی جب رات کو اس نے پھر خلیفہ کو اس کا وہ مہم ناپاری میں من دیکھا تھا۔

”اب کہاں جائیں گے؟“

اس نے سنے کیا تھا وہ اسے از خود مخاطب نہیں کرے گی۔ مگر مجبوری ہی ایسی آپڑی تھی۔

”جہاں پہلے جاتے ہیں۔“

”ہاں! اس کا لہجہ بھی نرم تھا۔“

”لیکن ابھی کل ہی تو۔“

اللہ کی سب ہی محسوس کر کے خلیفہ مستقیم چڑانے والے انداز میں ہنسا۔

”میں تو کال بھی جائیں گے پرسوں بھی اور اس سے اگلے دن بھی۔“

دیا کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ وہ ساکن پلکیں لیے اسے عجیب نظروں سے دیکھتی رہی۔

"میری ضد میں؟ ہے نا؟"

اس کا خون کھولنے لگا۔ مستقیم نرمی سے مسکرایا اور سر کوئی میں بلایا تھا۔

"بدگمان نہیں ہوتے سوتی! اچھے لی یہ سیزن ہے ہمارے کام کا۔"

"اس کام کے بھی سیزن ہوتے ہیں؟" وہ طنز اور غصے سے کہہ رہی تھی۔

"نہیں..... آج کل شادیوں کا سیزن ہے نا۔ اس لیے ہمارے کام کے بھی منصوبے ہیں۔ تب ہم یہی پس انداز کیا ہوا کھاتے ہیں اور مہینوں اپنے اس ٹھکانے سے باہر نہیں نکلتے۔"

وہ کتنے صلح جو انداز میں اسے تفصیلات فراہم کر رہا تھا۔ اس کے دکھ اس کی نظروں کی گہرائی سے نظر انداز کیے۔

"اگر آپ کی کوئی اپنی بہن نہیں ہے خلیفہ مستقیم تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم بہنوں

بہنوں....."

اس کے ہاتھ اٹھا کر ٹوک دینے پر دیا سکتی ہوئی نظروں سے اسے بچنے لگی۔

"اللہ گواہ ہے میں نے کبھی کسی عورت کی عزت خراب نہیں کی۔" اس کا لہجہ ٹھیک اور توش تھا۔

دیا طنز سے ہنسنے لگی۔

"مگر ان کے گھر..... ان کی قسمیں ضرور خراب کی ہیں۔ شادیوں کے سیزن میں ڈاگنا

ہے۔ واہ..... یعنی ان لڑکیوں کا جینا اڑاتے ہو۔ شادی کیسے ہوتی ہوگی ان کی؟ کیا ان کے گھر

دل بسنے سے پہلے نہیں اجڑ جاتے ہوں گے مستقیم!"

وہ ایک دم رونے لگی۔ مستقیم نے تھم کر مگر بے حد عاجز ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"دیا تم....."

"کچھ مت کہیں مستقیم! کچھ مت کہیے۔ بس سوچیے۔ غور کیجیے۔ شاید آپ کا دل لڑنے چاہے۔"

آپ کو اس دکھ کا اندازہ ہو جائے جن سے وہ معصوم لڑکیاں اور ان کے بوزھے والدین گزرتے

گئے جنہوں نے اپنے پیٹ کاٹ کاٹ کر بیٹیوں کے جینے اٹھنے کیے تھے۔ جن کی آنکھوں سے

مگر بھر کی نیندیں چھین کر انہیں آنسو بخش دیئے۔"

وہ یونہی روتے ہوئے کہتی رہی تھی۔ مستقیم کچھ کہے بغیر ایک جھٹکے سے باہر نکل گیا۔

رونے میں شدت آنے لگی تھی۔

"بیشربار ہاتھ تم نے کھانا نہیں کھایا۔ کیوں دیا!"

وہ واپس آیا تو سیدھا اس کے پاس آکر استفسار کرنے لگا۔

"میں خود اس موضوع پر آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔"

وہ قدرے توقف سے بولی تو اس کی آواز بنور زندگی ہوئی تھی۔ مستقیم کی نگاہ اس کی آنکھوں کے

چمن کا شکار بنیوں پر گئی تو دل جیسے کسی نے مسل کے رکھ دیا تھا۔ وہ کہ اسے کیسے بتاتا وہ اسے روتے

ہواٹ نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا بات؟"

اس کے انداز میں استعجاب بھی تھا اور جیتا بی بھی۔

"آپ نے میری بات نہیں مانی مستقیم! حالانکہ اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ میں جائز اور حلال رزق

کی متقاضی تھی۔ پہلے کی بات نہیں کروں گی۔ مگر اب میرا بچہ ہے میری کوکھ میں۔ اسے میں حرام یہ

پہان نہیں چھانا چاہتی۔ حلال رزق حلال اور جائز زندگی اور عمل کی ضمانت بنا کر رہا ہے۔ آپ سمجھ

رہے ہیں میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟"

وہ رگ کر اس کا سرخ چہرہ بچنے لگی۔ مستقیم نے ہونٹ بچنے اور نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔

"میں صرف اتنا سمجھتا ہوں دیا کہ تم مجھے جائز تک کر رہی ہو۔ میری مشکلات میں اضافہ کر

رہی ہو اینڈ ویش آل!"

اس کا لہجہ شدید تھا۔ صاف لگتا تھا وہ اپنا غصہ بہت قابو کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"وہ صرف میرا بچہ نہیں ہے۔ آپ کی بھی اولاد ہے۔ یہ سوچنا آپ کا بھی کام ہے۔ مگر آپ کو

امان نہیں ہے۔ کیا بنانا چاہیں گے آپ اسے بتائیں؟"

دیا کے جواب پر مستقیم کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ اس نے ایک بار پھر خود پر بہت ضربا کیا تھا۔

"چپ کر کے کھانا کھاؤ جا کے۔ دیا پلیز میرے حال پر رحم کر لو کچھ۔"

"چپ کر کے رہنا۔ دیا دکھ میں مبتلا ہو کر رہی۔"

"اگر میں کہوں کہ آپ مجھ پر رحم کریں۔ اپنے بچے پر رحم کریں تو....."

"شٹ اپ! یا میرا دماغ خراب نہ کرو تم....."

وہ کچھ ضربا کھو کے دھاراز اور اسی غصے میں اٹھ کر تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ دیا ساکن بیٹھی

اس کے استقبال کو سوچتی اور ہولتی رہی تھی۔

ایک بار پھر وہ کامیاب اور شاداں فرحاں لوٹے تھے۔ مگر دیا کا موڈ بے حد خراب تھا۔ اس کے خیال میں غلطی کرنا غلطی نہیں تھا۔ غلطی کو بار بار دانستہ دہرانا غلطی بلکہ گناہ عظیم تھا۔ مستقیم نے دانستہ نادانستہ جتنی بار بھی اسے مخاطب کیا وہ منہ سجائے اس کی ہر بات نظر انداز کر گئی۔ اس طریقے کو کامیاب کر اس نے بات منوانے کا دوسرا طریقہ سوچا تھا۔ وہ سب کمرے میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ جب ہی وہ وہاں چلی آئی۔ وہ سب اسے دیکھ کر محتاط ہوئے اور فنی مذاق کا سلسلہ روک دیا۔ خلیفہ مستقیم ہر اسے اس طرح سب کے سچ پا کر قدرے حیران نظر آنے لگا تھا۔ اس وقت اس کی حیرانی اشتعال میں ڈھلنے لگی جب دیا نے اپنی انگلی میں موجود وہ اکلوتی انگوٹھی اتار کر امانت کے سامنے رکھی جس کے حصول وہ مستقیم سے کئی مرتبہ اپنی جذباتی وابستگی ظاہر کر چکی تھی کہ یہ اسے بابا نے امتحان پاس کرنے پر تحفہ دی تھی۔

”مجھے آپ سے کام تھا امانت بھائی! پلیز اسے سچ کر مجھے ایک کلبازی لاد دیجیے گا۔“

اس مطالبے پر وہاں موجود سب ہی نفوس کے چہروں پر تحیر و استعجاب اتر آیا تھا۔ راجو بڑا قاعدہ اچھو لگا۔

”کلبازی.....“

امانت نے ایسے تحیر کے زیر اثر سوال کیا جیسے ساعت نے دھوکہ دیا ہو۔ جبکہ مستقیم کے چہرے خطرناک سنجیدگی کا تاثر تھا۔ اس کے بچنے ہوئے ہونٹ اس کے شدید اشتعال کے گواہ تھے۔

”کیا کریں گی اس کا آپ؟“

اس کے سرکواشات میں جنبش دینے پر امانت نے جریز ہو کے اگلا سوال کیا۔

”آج رات کو جب کھانا کپے تو اسے پہلے کسی کتے کو کھلا کر چیک ضرور کر لیتا۔ ایسا نہ ہو۔“

محترمہ ہمیں خیند کی دو اٹلا کر کھانے میں سلا دیں اور سوتے میں ہم سے ہی منگوائی کلبازی سے گانے گانے اتار ڈالیں۔

راجو بے حد خفیہ موڈ میں بولا تھا۔ حسام بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ جبکہ باقی سب چونچے اور متفکر تھے۔ دیا نے سرخ چہرے کا رخ راجو کی جانب کیا اور جتنا نے والے انداز میں چٹکے کر دی تھی۔

”بے فکر رہیں۔ مجھے اگر ایسا کرنا ہوتا تو آلہ قتل آپ لوگوں سے منگوا کر ہرگز بھی شک میں نہ کرتی اور اطلاعاتا عرض ہے کہ میں اس طرح کے متعدد مواقع پا کر بھی ایسا نہیں کر پاتی تو اس کا منہ

واضح ہے کہ مجھے مجرموں کے درمیان رہ کر بھی گناہ و ثواب کے فرق اچھی طرح ازیر ہیں۔ الحمد للہ! اس کا لہجہ آپ ہی آپ طنزیہ ہو گیا تھا۔ انہیں ان کے شرمندگی کے احساس میں جتلا چھوڑ کر وہ جیسے اتنی تھی ویسے ہی پلٹ گئی۔ کچھ دیر بعد ہی خلیفہ مستقیم دندنا پڑا اس کے سر پر آ کر سوار ہوا تھا۔

”کیا کرو گی تم اس کلبازی کا؟“

وہ آف موڈ کے ساتھ اس سے مخاطب تھا۔ مگر دیا نے اس کے موڈ کی پروا نہیں کی۔ وہ خود اس سے بہت خفا تھی۔

”جب کروں گی تو دیکھ لیجیے گا۔“

اس نے بے اعتنائی اور رکھائی کا مظاہرہ کیا۔

”بہر حال تم مجھ سے بھی کہہ سکتی تھیں۔“

وہ ناگواری سے کہہ رہا تھا۔ دیا نے اسے جواباً تینھی نظروں سے دیکھا۔

”میں آپ سے سخت خفا ہوں محترم! یاد رہے میں اب آپ سے ہرگز کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔“

وہ درشتی سے کہہ رہی تھی۔ مستقیم نے اسے گھورا تھا مگر وہ خائف نہیں ہوئی۔

”مقابلہ کرو گی میرا؟“ وہ غصے سے بھرنے لگا۔

دیا کے کاندھے اچکانے نے مستقیم کو بالکل ہتھے سے اکھاڑ دیا تھا۔ اس نے دیا کا بازو پکڑا اور تقریباً کمیٹ کر بستر پر پٹخ دیا۔

”ٹھیک ہے کرو میرا مقابلہ۔ میں دیکھتا ہوں کتنی کامیاب ہوتی ہو تم؟“

اس نے غراہٹ زدہ آواز میں کہا اور کھانے کی ٹرے اٹھا کر اس کے سامنے پٹنی۔

”زحمت کرو گی یا میں کھلاؤں؟“

”میں بھوک سے مرنے جاؤں گی مستقیم! مگر یہ حرام کا نوالہ نہیں لوں گی۔“

وہ جواباً چینی اور ٹرے اٹھا کر پھینک دی۔ مستقیم اسے بیقراری سے روتا پا کر بے ساختہ ہونٹ بھینچ گیا۔

”کلبازی کیوں منگوائی ہے؟“

اس کا پست لہجہ گواہ تھا کہ وہ ایک بار پھر اس کے آنسوؤں کے آگے ہار گیا ہے۔

”کام کرنے کو۔ لکڑیاں کانوں کی جنگل میں۔ انہیں بچوں کی پھر ان سے حاصل شدہ رقم سے

اپنے لیے کھانے کا انتظام کروں گی۔ کیونکہ میں.....
اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ خلیفہ مستقیم جو اس کی بات حیرانی سے سن رہا تھا۔ حلق سے اندھے والے قہقہے پر قابو نہ رکھ سکا۔

”تم..... یعنی تم لکڑیاں کاٹ کر بیچو گی پھر کچھ کھاؤ گی؟ یعنی اپنے زور بازو سے.....؟“
پہ مشکل بنی روک کر وہ سرخ پڑتا ہوا بولا۔ دیا کا چہرہ اسکی کے احساس سے دھکنے لگا۔ اس نے ہونٹوں کو باہم بچھتے ہوئے سلتی نظروں سے کچھ دیر اسے دیکھا تھا۔ پھر پھنکارنے کے انداز میں بولی۔
”آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا؟“

اس کا لہجہ بے حد غصیلانہ تھا۔ مستقیم بے اختیار گڑبڑایا۔ مگر صاف مصنوعی انداز تھا۔
”یار..... تم نے بات ہی ایسی کی ہے۔ میرا کیا قصور اگر فہمی آگئی تو۔ اتنی دھان پانی ہوا وہ عزائم.....“

کانوں کو ہاتھ لگا تا ہوا وہ اس کی قہر بھری نظروں کو خود پر جتے پا کر بھی دوبارہ ہنس گیا۔
”میرا وجود جتنا بھی کمزور اور نازک کیوں نہ ہو مسٹر مستقیم! مگر میرے ارادے بہت مضبوط ہیں۔ میں آپ کو ایسا کر کے دکھاؤں گی ان شاء اللہ! یہ طے ہے کہ میں جیتے جی اپنی اولاد کو حرام پہنچا پروان چڑھا سکتی۔“

اس نے دونوں اور قطعی انداز میں کہا تو مستقیم بھی قدرے سنجیدہ ہو گیا اور ہاتھ اٹھا کر درشتی سے بولا۔

”بس..... بہت ہو گیا مذاق۔ یہ کچھ دوائیں اور پھل ہیں۔ تمہیں ضرورت ہے۔ اچھی خواہاک کی اور.....“
”مگر میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔ سنا نہیں آپ نے کہ میں اپنے بچے کی بنیاد حرام پہ نہیں رکھنا چاہتی۔“

وہ اس کی بات کاٹ کر چیخ پڑی۔ مستقیم کی سبچ پشیمانی پر اک شکن نمودار ہوئی۔ اس نے دیا کے بہت دھرم اور ضدی انداز کو محسوس کیا تھا اور سرخ آنکھیں اس پر جمادیں۔

”اب تم جھگڑا کرو گی مجھ سے؟“
وہ جانتا تھا اس کی آنکھیں بہت پاورفل ہیں۔ وہ ان آنکھوں سے ہی اسے زیر کر رہا تھا۔
”میں نہیں۔ آپ جھگڑا کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو فورس تو نہیں کیا ناں؟ آپ اپنی مرضی

سے اگر مالک ہیں تو میں بھی اپنی مرضی کی مالک ہوں۔“
”یہ مشقت طلب کام ہمارے بچے کو نقصان پہنچا دے گا دیا! تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟“
دو بری طرح زچ ہوا تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔ آپ لائیں میرے لیے حلال رزق کما کر۔ نہیں کرتی میں مشقت طلب کام۔“
یہ فرمائش پہلے سے کڑی تھی۔ خلیفہ مستقیم کے دماغ میں خون ٹھوکر میں مارنے لگا۔
شیر کے تھانوں میں میری تصویریں چسپاں ہیں۔ حلال رزق کمانے جاؤں تاکہ دیکھتے ہی گولی کاٹ نہ بنا۔ یا جاؤں۔ یہی حکم ہے کو تو ال کا میرے لیے۔ پھر خوش ہو جاؤ گی تم؟“

اس کا لہجہ بے حد طنزیہ تھا۔ دیا نے ہونٹ کپکنے شروع کر دیئے۔ آنکھیں پانیوں سے ڈبڈبا رہی تھیں۔ مستقیم کچھ دیر بے بسی سے اسے تکتا رہا پھر اسے شانوں سے تھام لیا۔
”پلیز..... مت کرو مجھے تنگ۔ کھا لو کھانا۔“

دیا کی چٹکوں سے شفاف موتی ٹوٹ کر بکھرے مگر اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ہونٹ ہنسنے دھری جانب تکتی رہی۔ صاف ظاہر تھا۔ یہ سودہ منظور نہیں تھا۔ مستقیم جھلانے لگا۔
”نہیں مانو گی؟“

خاصی تاخیر سے اس نے سوال کیا تھا۔ یوں جیسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچی گیا ہو۔ دیا نے بھی فی الفور سر کوئی میں بلا دیا۔

”جہاں تک میری ذات کا سوال تھا خلیفہ مستقیم! میں نے خود پر جبر کر لیا۔ مگر اولاد کے بارے میں کبھی کہہ دیا نہ نہیں ہو گا۔ یاد رکھیے گا۔ میں آپ کے ہر فیصلے سے یونہی نکر جاؤں گی۔ پہلے تو مجھے اپنی عزت کا خوف پسپا کر گیا تھا۔ اب کیا کریں گے بھلا آپ؟ ماریں گے مجھے؟“

اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔ اس سے پہلے کہ خلیفہ مستقیم جواب میں کوئی رد عمل ظاہر کرتا، امانت ہوا کسی میں گڑتا پڑتا اندر آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے جو اطلاع دی تھی۔ اسے سن کر خلیفہ مستقیم بھی تمام تر جگرے کے باوجود اپنی جگہ سے ہل کر رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

لب تو خواہش ہے یہ درد ایسا طے سانس لینے کی حسرت میں مر جائیں ہم
لب تو خواہش ہے یہ ایسی آندھی طے جس میں پتوں کی مانند بکھر جائیں ہم
لب تو خواہش ہے یہ دنیا والوں کا غم ایسی ٹھوکر لگائے کہ جی نہ سکیں

ایسے الجھیں یہ سینے میں سانس کہ پھر
کوئی ہم نہ رہی نہ راحت ملے
اب تو خواہش ہے یہ
ہم سر بزم شمع کی مانند جلیں
چھوڑ جائیں دنیا کو چپ چاپ ہم
اب تو خواہش ہے یہ کہ سزا وہ ملے
جس میں سالوں تک قید ہی قید ہو
بے وفائی وہاں پہ وہ ٹاپید ہو
اپنی ہی ذات کے کھوکھلے بھرم میں
روئے جاؤں تو چپ نہ کرائے کوئی
ہاتھ پکڑے میرا چھوڑ آئے کوئی

سجدے میں سر جھکائے دو سک سک کر بے حال تھیں۔ برس برس گزر گئے تھے۔ اک ہی
دعا، اک ہی التجا کرتے ہوئے۔ ان کی فریاد کا محور و مرکز وہی تھا۔ جو روٹھ گیا تھا۔ جو گیا تھا تو لوٹ نہ
تھا۔ پچھتاوا تھا۔ بے انت پچھتاوا۔

ملاں تھا۔ بے پایاں ملاں۔

وہ کہاں سے گزرا وقت واپس لے آئیں۔ جب انہوں نے بھی اسے دھکار دیا تھا۔

میرے اللہ!

میرے مولا!

میں تیری بے حد حقیر بندی ہوں۔ مجھے معافی کا اشارہ عطا فرما۔ مجھے دعا کی مقبولیت کی فہم
بخش۔ "تسلل سے روتے ان کی ہچکیاں بندھ رہی تھیں۔ جب ان کے شانے پر عبدالمجید نے
مہربان ہاتھ کا لمس اترایا تھا۔

"بس کرو تیرا حوصلہ کرو۔ اللہ سے شاکہ نہ ہو۔ شاکر رہو۔ اللہ مہربانی فرمائے گا۔"

یہ وہی عبدالمجید تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ طنز کے ہی تیر برسائے تھے۔ جب بھی بات کی
لجھ میں بیزار ی یا پھر سرد خراہیں ہوا کرتی۔ دیکھا جاتا تو بہت کڑی زندگی گزار رہی تھی ان کی
میں۔ ہر لمحہ خوف ہر گھڑی ہراس کے ہمراہ۔ کب کہاں کون سی بات ناگوار گزر جائے۔ مگر اب

بدلی ہو گئے تھے۔ زندگی بھر کی کمائی تھا وہ بیٹا جسے خود انہوں نے دونوں ہاتھوں سے لٹا ڈالا۔ کبھی
اور کی طرح چاہا ہی نہ تھا۔ لاڈ اٹھائے ہی نہیں تھے۔ ہمیشہ شیر کی نظری سے دیکھا۔ پتہ نہیں کیا مزاج
فان کا کہ ہر وقت چڑتے رہتے۔ وہ ذرا سہا ہوا سالز کا انہیں کبھی خاص اور اہم لگا ہی نہیں تھا۔ مگر
بپا سے کھو گیا۔ تب جیسے ایک دم سے خالی ہو گئے۔ خالی دامن

خالی ہاتھ

خالی دل

اور خالی گھر۔

تھا بعد ان جیسا کوئی اور بھی تھی دست۔ کیسے کیسے ارمان جاگ اٹھے تھے۔ اس کا گھر بنانے
ان کی اولاد کو کھانے کے، خود اپنے ہاتھوں اپنا آشیانہ بنا بیٹھے تھے۔ آہ۔ ملاں تھے صرف ملاں جو ختم
ہوئے تھے۔ خود اپنے پیروں پر بھی کوئی کلبازی مارتا ہے۔ عمر بھر کی کمائی اپنی جذباتیت اور
وقت میں گنوا ڈالی۔ اس کی بے گناہی جس روز شرمینہ کے حوالے سے ثابت ہوئی اس روز وہ خود سے
باز پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔

وہ باپ ہو کر مجرم ثابت ہو گئے تھے اپنے بیٹے کے۔ باپ جو اولاد کی زندگی اس کی شخصیت کو تعمیر
کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انہوں نے کیا کیا تھا؟ اچھے بھلے معصوم فرشتے کو خود زبردستی گناہ
لکھاتے پر ڈال آئے اور سارے دروازے بند کر دیئے۔ پڑھے لکھے۔ باشعور۔ سمجھدار ہو کر بھی۔ وہ
بچے اور اپنی گردن پر آہنی حلقہ محسوس کرنے لگتے۔ وہ کتنی ہستیوں کے خود کو مجرم پاتے تھے۔
سب سے بڑھ کر مالک قدرت کے کہ اس نے انہیں باپ بنایا وہ حق نہ ادا کر سکے۔

اپنے ملک کے جس سے اک معمار جھین لیا۔ اس کی جگہ اس پر ایک مجرم مسلط کر دیا۔ اپنی بیوی
نے جس سے اس کی عمر بھر کی کمائی جھین کر اس کی مامتا کو عذاب سے دو چار کر دیا تھا۔ خود خلیفہ مستقیم
کے جس سے اس کی معصومیت، سادگی اور نیکی جھین لی تھی۔

اب تو ایسا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا کہ وہ ازالہ کر سکتے۔ وہ لاچار تھے۔ بے بس تھے کہ چیزیاں
لیجے چک کر ان کی تھیں۔ وہ ایسے دل برداشتہ تھے کہ کہیں جائے پناہ اور سکون نہ پا کر خدا سے لوگ
ان بات ایک ہی التجا، ایک ہی گزارش۔ آنسوؤں کے نذرانے کے ساتھ مالک حقیقی کے حضور
تھا کہ اسے اور کبھی نہ تنگے ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے۔

"مجھ مجرم ہوں اس کا۔ اللہ بھی مجھے معاف نہ کرے گا اگر میں نے خلیفہ مستقیم سے معافی نہ

دست تھیں۔ وہ دیا کو آج تک کچھ نہ دے سکا تھا۔ پھر اب اتنا بڑا اخراج تو مر کے بھی وصول نہ کرتا۔
 دوسری جانب اپنے ساتھیوں کو بھی اس طرح چھوڑ کر جانا آسان نہ تھا۔

”اس طرح نامم ضائع مت کرو خلیفہ! جنگل کا پھلا راستہ ابھی بالکل محفوظ ہے۔ تم اسی راستے سے نکل جاؤ۔ ہماری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جیتے جی گرفتاری نہیں دیں گے اور ہو سکا تو یہاں سے نکلنے کی کوشش بھی کر لیں گے۔“

اور مستقیم کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کڑے وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑنا پڑا تھا کہ اس نے جس بل براساں و متوحش دیا کو دیکھا تھا۔ اس کی نگاہوں کی خاموش التجا کو رد کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکا۔ اس کی آنکھوں کی سطح پر نمی بے بسی کی صورت پھیل رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دیا کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا یا تو دیا نے باخوشی اسے اپنا ہاتھ تھما دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

مستقیم اپنا حلیہ یکسر تبدیل کر چکا تھا۔ شلوار قمیص کی جگہ جینز شرٹ نے لے لی۔ داڑھی مونچھ صاف کرا کے وہ اب کلین شیو تھا۔ آرمی کٹ نے اسے بالکل بدلا ہوا روپ دیا تھا۔ جو پہلے سے کہیں بڑھ کے دکشی اور خود روئی رکھتا تھا۔ اس کے باوجود اسے پہچان لیے جانے کا وحز کا ہر دم ستایا کرتا۔

یہ ایک غیر معروف سا قصبہ تھا۔ جس مکان کو اس نے کرایہ پر حاصل کیا تھا۔ وہ بستی سے بہت الگ تھلک تھا۔ اطراف میں وسیع کھیتوں اور باغات کے سلسلے تھے۔ اور سامنے درختوں کے درمیان گھرنی بستی ہوئی نہر۔ مستقیم کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اس کڑے وقت میں بھی اس نے آتے ہوئے افزائری میں سبھی نوٹوں کی کئی گدیاں اٹھا کر اپنے لباس میں چھپالی تھیں۔ اس کا اسی پیسے پر عیش کرنے کا ارادہ تھا مگر اک دیا کی ضد بھی تو تھی۔ جس کے آگے بالآخر ہار کر وہ اس روز کسی کام کے ارادے سے نکلا تھا کہ روڈ کراس کرتے ہوئے اس کا بہت شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس کا بازو اور دائیں ٹانگہ بری طرح متاثر ہوئی تھی۔

چار دن ہسپتال میں گزار کر وہ گھر آیا تو دیا کو اس نے یکسر بدلے ہوئے روپ میں پایا تھا۔
 ”تم تو سخت ہاپوس ہوئی ہو گی ہے نا؟ میں مرتے مرتے پھر زندہ بن گیا۔ جان ہی نہیں چھوٹ رہی تھی۔“ اوپر سے رہی کسی کسر میری اس معذوری نے پوری کر دی۔“

وہ اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھا رہی تھی جب مستقیم نے کسی قدر سختی سے کہا تھا۔ دیا کے دل پہ جیسے گھونر کا تھا۔ آنکھوں میں کرب کے باعث نمی پھیل گئی۔ اس نے زخمی نظروں سے مستقیم کو دیکھا

ماگنی اور۔ کہاں ڈسٹنڈوں میں مستقیم کو۔“

”نہیں۔۔۔ آپ نہیں۔ مجرم تو میں ہوں اس کی، آپ کا رویہ اس کے ساتھ ہمیشہ سے ایسا نہ ہو برٹ تو وہ میری وجہ سے ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے؟ کیوں اسے یہ سب کہہ ڈالا۔“ اس نے رکے ہوئے آنسو پھر سے بہہ نکلے تھے۔

”اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔ لگتا ہے اللہ بھی ہم سے خفا ہو گیا ہے۔ کوئی دعا قبول ہوتی تو آئی۔“

وہ پھر سے مایوسی میں گھرنے لگے۔ بکھرنے لگے۔ حالانکہ مایوسی گناہ ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ واپسی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سلامی مشین کی گھر گھر کی آواز ایک تسلسل سے اس کے کانوں میں پڑتی تھی اور وہ منظر پر کر کر ٹوٹوں پر کروٹیں بدلنے لگتا۔ حالانکہ ڈاکٹر نے اسے سختی سے زیادہ حرکت کرنے سے منع کیا تھا اس روز پولیس نے ان کے ٹھکانے پر ریڈ کیا تھا اور جب پولیس کے جوان ان کے گرد گھیراؤ بنے رہے تھے اور اس کے ساتھی بھرپور مزاحمت میں مصروف تھے۔ ایسے میں ان کا مانو سر جانا یا ملنا پورا کرتا ہے۔ وہ بھی اسی عزم سے لڑ رہے تھے اور گرفتاری نہ دینے کا تہیہ بھی تھا۔ فائرنگ کی آواز پورا جنگل گونج رہا تھا۔ ایسے میں امانت کی ایک ہی رٹ تھی۔

”تم بھابی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ مستقیم! پلیز چلے جاؤ۔ اس بار بہت بھاری فائرنگ ریڈ ہوا ہے۔ کچھ نہیں بچے گا یہاں پر۔ سب تباہ ہو جائے گا۔“

”ہونے دو۔ میں نہ بزدل ہوں نہ کم بہت۔ پھر کیوں میدان چھوڑ کر بھاگوں؟ امانت لڑتے ہوئے تو مر جائیں گے مگر اک دوسرے کو مصیبت میں نہیں چھوڑیں گے۔“

وہ اپنی گن اٹھاتے باہر کی جانب لپکا تھا کہ امانت نے اسے کمر سے دبوچ لیا۔
 ”تم سمجھتے کیوں نہیں ہو مستقیم! ہم سب کا منفقہ فیصلہ ہے یہ کہ تم بھابی کو لے کر یہاں سے

گے۔ ہماری بات الگ ہے مگر تم اب اکیلے نہیں ہو۔ صرف بھابی نہیں ہیں۔ تم باپ بھی بنے ہو۔ ذرا سوچو تو سبھی مستقیم! اگر ہم مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے یا گرفتار ہو گئے۔ بھابی کا کیا ہوگا؟ پولیس کی کمینگی سے آگاہ ہو تم۔ یہ لڑکی اس سلوک کی مستحق نہیں ہے خلیفہ۔“ وہ مسلسل اسے قہر تھا۔ مستقیم کو اس مقام پر آ کر چپ لگی۔ وہ عجیب مشکل میں گرفتار ہوا تھا۔ امانت کی باتیں

اور سوپ کا پیالہ سائینڈ پر رکھ دیا۔

”اس کا مطلب آپ ابھی تک مجھے نہیں سمجھتے مستقیم!“

وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے کتنے پیار سے اس کا منہ صاف کر رہی تھی۔ انداز کی دلربائی پر کوئی اور وقت ہوتا تو لازماً وہ فدا ہوتا مگر ان دنوں وہ ہر وقت جھلایا رہتا تھا۔

”میں نے کسی کو بھی کچھ نہیں سمجھا۔ ساری زندگی بس میں نے جھک ماری ہے۔ تمہیں پتہ ہے راجو پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ حسام پولیس کی حراست میں ہے اور امانت کا کچھ پتہ نہیں۔ زندہ یا مر گیا۔ اور پولیس کتوں کی طرح ہماری بوسہ کھتی پھرتی ہے۔ اس پر تمہاری ضد کہ میں صحت کی روزی کھا کر تمہیں کھلاؤں۔ کیسے؟ میرا تو سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔“

وہ جھلا کر بولتا بلکہ اسے اور خود کو کھتا چلا گیا۔ دیا نے اسے نہیں ٹوکا۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی اس کا خباہت نکل جائے۔

”نی الحال آپ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں ہیں مستقیم! ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ میں نے یہاں کی خواتین سے سلائی کی بات کی ہے۔ دراصل شہر کی بوتیک کا کام ملتا ہے اجرت پر کرنے کو۔ میں بھی یہی کام کروں گی۔ دادی غلط نہیں کہتی تھیں۔ ان کی دوراندیشی آج میرے کام آ رہی ہے۔ ہاتھ میں ہنر ہے۔ میں اسی ہنر کو روزی کا وسیلہ بناؤں گی۔ باقی رزق کا وعدہ تو اللہ سونے کا ہے ہی۔ آپ ریٹکس رہیے۔ کہ میں اب آپ سے خفا نہیں بلکہ خوش ہوں اس تعاون پر۔ شکایتیں مجھے پہلے تھیں آپ سے۔ اب بالکل نہیں۔ میں جھکنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے ہمت بھی نہیں ہارنی۔ بس مجھے آپ کا ساتھ چاہیے۔ دیں گے میرا ساتھ؟“

اس نے بات کے اختتام پر اس مندانہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ مستقیم کچھ دیر یونہی اسے جھک رہا۔ پھر بچنے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ چہرے کا رخ پھیر لیا۔ دیا کے چہرے پر تاریک سایہ ضرور لہرا مگر وہ ہمت نہ ہارنے، ہار تسلیم نہ کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

دیا کا مستقیم کی زندگی میں آنا ازل سے طے شدہ امر تھا۔ وہ تو ایک بھلے ہوئے راہی کو دھان لائے کا وسیلہ بنائی گئی تھی۔ جیسی اس بات کو سمجھ لینے کے بعد بڑی استقامت سے حالات کے سامنے ڈٹ گئی۔ وہ نازک کچلتی ڈھال جیسی لڑکی جو پہلی مرتبہ تخلیق کا مرحلہ طے کر رہی تھی۔ جسے اللہ نے مشکل راستے کا راہی بنانے سے قبل ہی مضبوط حوصلے عطا کر دیئے تھے۔ باقاعدہ اسے اس پر اس سے کچھ

تھوڑی دیر سے لواز کر مقصد سامنے رکھ دیا۔ مگر وہ تو ان باتوں سے تابلہ تھا۔ جیسی اس کے دلوں پر حیران ہوا کرتا۔ اس روز بھی وہ سلائی کا کام چٹا کر سبزی کی نوکری اٹھائے اس کے پاس آئی تھی جب وہ اسے دیکھ کر عجیب سے دکھ کا شکار ہو گیا تھا۔

”مجھے اکثر اپنی خود غرضانہ سوچ پر عداوت ہونے لگی ہے دیا! کن جگہوں میں ڈال دیا ہے میں نے نہیں۔ ملاں تو ہو گا تمہیں بھی۔“

اور جو بادو کتنی سادگی سے کس قدر شاکر انداز میں مسکرائی تھی۔

”میں تقدیر سے شاکی نہیں ہوں مستقیم! میں جانتی ہوں تقدیر اٹل ہوا کرتی ہے۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ آزمائش میں جھلا کیے جانے والے اللہ کے مقرب اور پسندیدہ اس لحاظ سے میں تو خوش لب ہوں۔ میں نے اس بات کو ذرا دیر سے ضرور جانا مگر جب جان لیا تو مانتے ہی صبر بھی آ گیا ذات بھی۔ میں جان گئی ہوں میرے رونے پینے سے یا غمزدہ رہنے سے حالات بدل نہیں سکتے۔ ہوتا تو وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہے۔ دادی کہا کرتی ہیں جو آزمایا گیا وہ خاص ہوا۔ میں بھی آزمائی گئی تھی۔ یہ میرا امتحان ہے تو میں اس میں کامیابی کی کوشش کیوں نہ کروں؟ لیکن مستقیم! میں پھر کیوں گی۔ مجھے آپ کا ساتھ، آپ کا تعاون درکار ہے۔ وعدہ کریں مجھ سے کہ ہم جیسے بھی حالات ہوں مگر اپنے بالکل گورنر حلال سے ہی پروان چڑھائیں گے۔ انہیں ملک و قوم کے معمار بنانا ہماری ذمہ داری ہے۔ انہیں اللہ کے نائب بنانے کے لیے کوشش اور دعا کرنا ہماری اہم ترین ذمہ داری۔ وعدہ کریں مستقیم!“ اس کی خوش نما آنکھوں میں کتنے ہی جھلکے کرتے خواب سجے تھے۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

”کیا وہ ان آنکھوں کو خوابوں سے خالی کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا؟ یقیناً نہیں۔“

جبکہ وہ اسے خاموش اور گم سم پا کر پھر سے کہہ رہی تھی۔

”ضروری تموژی ہے مستقیم! اگر دنیا یا دنیا کے چند فرد ہمارے ساتھ برائی کریں تو ہم بھی برائی ہی اترا آئیں۔ اس طرح تو ہر طرف برائی کا ہی راج ہو جائے گا۔ جبکہ رب کا حکم اچھائی کو پھیلانے والی کو روکنے کا ہے۔“

وہ پھر آس بھری جواب طلب نظروں سے اسے جھکتی تھی۔ مستقیم نے بوجھل سانس کھینچا پھر سر کو اٹھاتے میں جنبش دینے لگا۔

”میری اولین خواہش زندگی کے ہر راستے پر تمہارے ہم قدم چلنے کی ہے دیا! میں تمہیں خفا نہیں کرتا چاہتا مگر یہ لوگ، یہ معاشرہ، نہ تو کبھی میرے عیب ڈھکے گا، نہ مجھے زندگی کو نئے سرے سے شروع

کرتے دیکھ سکے گا۔ تم نہیں جانتیں یہ۔

”آپ ایک بار عہد تو کریں مستقیم! ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم واپسی پر آگے۔ آپ کے امی ابو کے پاس۔ میرے بابا اور امی سے بھی ملیں گے۔ آپ کو پتہ ہے؟ اللہ اگر کسی آزمائش میں مبتلا کرتا ہے تو حوصلہ اور ہمت بھی عطا فرماتا ہے۔“

وہ اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے اس کی اک ہاں کی ہی تو منظر تھی۔ مستقیم نے سر دھڑکائی۔
”واپسی کا سفر ہمیشہ تکلیف دہ ہو یہ ضروری تو نہیں۔ اگر واپسی اس طرف ہو جہاں لوگ چکر پر چرائے جائے آپ کے منظر ہوں، تو واپسی کیسی آسودگی سے بھرپور ہو سکتی ہے ذرا سوچیں مستقیم!“
وہ ایک کے بعد ایک اس کا جگنو اس کی منہی میں تھما رہی تھی۔ مستقیم کو اعتراف کرنا پڑا اس کی کو دل جیتنا ہی نہیں قائل کرنا بھی آتا تھا۔ وہ بھی قائل ہونے لگا۔

واپسی کا یہ سفر بہت تکلیف دہ ہو گا۔ بہت پرچ اور کٹھن، مگر میں اسے اختیار کرنے کی کوشش کر لیے بھی کروں گا کہ اس کی منزل بہت پرکشش ہے۔ میں گناہ کے راستوں پر چلتے بہت تھک گیا ہوں دیا! اب اندھیروں سے روشنی میں آنے کی خواہش ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ گمراہی کے اس دور میں میرا ضمیر کبھی بھی مطمئن نہیں ہو سکا۔ اور یہ بھی کہ مجھے ان آنکھوں کی روشنی سے بہت محبت ہے۔ اور میں انہیں ہمیشہ روشن ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اس نے جبکہ کر کہتے اسی محبت و اپنائیت بھری عقیدت سے اس کی آنکھوں کو چوم کر بوجھ سرگوشی اس کی سامتوں میں اندلی تھی اور مسکرا دیا تھا۔ دیا کے اندر ڈھیروں ڈھیر آسودگی اتر آتی تھی۔
واپسی نے کہا تھا۔ اگر وفا کرنی ہو تو ندی کنارے لگی گھاس کی طرح کرو۔ کہیں کوئی ڈوبتا ہوا اس کا ہاتھ لے لے تو وہ اس کو بچا لیتی ہے۔ یا پھر خود بھی کنارے سے ناپ توڑ کر اس کے ساتھ ڈوب جاتی ہے۔
حالات نے اسے ندی کے کنارے لگی گھاس کی طرح بنا دیا تھا۔ وہ کم ہمت تھی۔ ناتواں تھی۔ مگر وہ تھی۔ اللہ نے اسے مستقیم کو بچانے کا ذریعہ بنایا تھا۔ وہ اپنی کامیابی پر سجدہ و شکر بجالانے کو اسی دن اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کامیابی جو اس کے رب کی ہی بخشی ہوئی تھی۔ پھر شکرانہ تو اس پر واجب تھا۔

”نہیں بس۔“

وہ اسے اپنے ہاتھ سے سوپ پلا رہی تھی، جب دوسرے بیچ پر ہی مستقیم نے اس کا ہاتھ چپے دیا۔ وہ حیران رہ گئی تھی۔

”اتنا تھوڑا سا کیوں؟“

”بس دل نہیں چاہ رہا۔“

وہ معمول سے کچھ خاموش اور کم صم لگا تھا دیا کو۔ جیسی تشویش کا رنگ اس کی آنکھوں میں اترنے لگا۔

”دل کیوں نہیں چاہ رہا؟ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟ درد تو نہیں ہو رہی؟“

اس کا ماتھا چھوتی وہ فکر مند نظر آنے لگی۔ مستقیم آہستگی سے مسکرانے لگا۔

”بالکل ٹھیک ہوں دیا! کیوں اتنی پریشان ہو جایا کرتی ہو یا۔“

دیا جواب میں کچھ کہے بغیر اسے ایسی نظروں سے نکھتی رہی جیسے جاننا چاہتی ہو وہ سچ بھی کہہ رہا ہے کہ صرف بہانے کی کوشش ہے۔ مستقیم نے گہرا سانس بھرا۔

”آگ بات ہمیشہ کے لیے ٹوٹ کر لو پیاری لڑکی اتم سے نہ پہلے کبھی جھوٹ بولا۔ نہ بولوں گا۔“
قلیل کا یہ انداز بہت اٹوٹا اور دل موہ لیتا ہوا تھا۔ وہ ہلکی پھلکی ہونے لگی۔

”واپسی اتنی جین مرد و عورتا جھوٹ اس وقت بولتا ہے جب اس کی زندگی میں بیوی کے علاوہ کوئی اور محبت آتی ہے۔“

وہ مسکراہٹ دبائے کہہ رہی تھی۔ مستقیم نے کانڈھے اچکا دیا۔

”پھر تو تمہیں ہمیشہ کو بے فکر ہو جانا چاہیے۔ مجھے دیا کے بعد زندگی میں مزید کوئی خواہش نہیں۔“
”واقعی؟“

”مصنوی انداز میں آنکھیں پھینکا کر بولی تو مستقیم اسے گھورنے لگا۔

”دیا کوئی اتنی مشکل سے قابو کیا ہے۔ ویسے بھی کوئی اور لڑکی کسی ڈاکو کو کیوں پسند کرنے لگی۔“
یہاں اس نے اپنے میں ہر سمت آپ کے خُسن و جمال کی دھوم مچا گئی ہے حضرت لڑکیاں آپ کو ہانکے بیرو سے کیا ہی کم سمجھتی ہوں گی۔“

دیا کی فراہم کردہ اطلاع جو اسے سلائی سینئر سے کپڑے لاتے لے جاتے سننے کو ملی تھیں اس سے سننے لگی تو مستقیم کھسکا کر ہنس پڑا تھا۔

”لڑکیاں تو زہر تو ف ہوتی ہیں۔ ویسے تمہیں جیسی ہوئی؟“ وہ اسے ہچا چتی نظروں سے نکلنے لگا۔

”کوئی نہ۔“
”ہاں بھی نہیں۔ بلکہ سچ پوچھیں تو فخر محسوس ہوا۔ آخر میرے بڑبیز کی تعریفیں ہو

رہی تھیں۔

اس کا انداز شوخ تھا۔ چہرے پر جگمگاہٹ۔ مستقیم اسے دیکھے گیا۔

”کیا انہیں پتہ تھی یہ بات کہ ہمارا کیا ریلیشن ہے؟“

”نہیں۔ لیکن جب میں نے بتایا تب ان سب کی آنکھوں میں عجیب سا رشک اور حسد

آیا تھا۔“

”عجیب بات ہے۔ وہ تمہاری تعریف نہیں کر رہی تھیں؟ مجھے کب دیکھ لیا؟“ وہ ابھرا۔

”بہت شروع میں۔ آپ کے ایکسٹنٹ سے پہلے دیکھا تھا ان لوگوں نے آپ کو آتے دیکھا

اور اک راز کی بات بھی سن لیں۔ لڑکیاں کبھی دوسری لڑکی کی تعریف نہیں کرتیں۔ بس یہ بھی لیا

نفسیاتی خرابی ہوتی ہے۔ پتہ ہے ذیشان اور لائبہ جب ایف ایم سنا کرتے تھے تو ذیشان فی ٹیبلٹ

بے کی آواز کی تعریف کیا کرتا اور لائبہ کو میل کی آواز پسند آتی۔ اک بار لائبہ کہنے لگی۔ بھو یہ کیا

ہے بھلا؟ لڑکیوں کو لڑکوں میں جبکہ لڑکوں کو لڑکیوں میں انریکشن کیوں محسوس ہوتی ہے۔ میں ال

بات سن کر بہت ہنسی تھی۔ یہ تو فطری طور پر ہوتا ہے نا۔ اللہ پاک نے مخالف جنس میں کشش رکھنے

ساتھ ہی گناہ و ثواب کے راستے بھی کھول کر الگ بتا دیئے جو پرہیزگاری اختیار کرے گا۔ وہی

پانے والا ہے۔“

اس نے اپنی بات مکمل کی اور پھر اسے سوپ پانا چاہا۔ مستقیم نے پھر ہاتھ سے منع کیا تھا۔

”لیں نا۔ کیا ذائقہ اچھا نہیں بن سکا۔“

اس نے اصرار کرتے ہوئے کسی خیال کے تحت پوچھا پھر مستقیم کے جواب کا انتظار کیا۔

چمکا۔

”تم نے میرا جھوٹا کیوں پی لیا بھلا؟ اگر محبت ہوگئی تو۔۔۔؟“

مستقیم نے ٹوکا تھا پھر شرارت سے ہنسنے لگا۔

”اب کیسا خوف۔ ہو تو چکی جتنی گہری ہوگی اب تو اتنی ہی فائدہ مند ثابت ہوگی۔“

کچھ دیر اسے ہنسنے ہوئے دیا نے بہت روشن اور محبت آمیز نظر سے ہنسنے کے بعد

وہ مستقیم کے اندر دھڑک گلاب مہکا تا چلا گیا تھا۔ دیا کی ایسی باتیں یہ اس کے لیے تو

کی ڈور ثابت ہوا کرتی تھیں۔ وہ صرف کہتی نہیں تھی۔ اپنے عمل سے ہی ہر چیز ثابت کر کے

ان کڑے حالات میں اس نے اپنی عمر اپنی ہمت اور حوصلے سے بہت زیادہ حریف کا مقابلہ

اپنے نازک وجود سمیت جب اسے سہارا دیتی تو خود مستقیم شرمندہ ہونے لگتا۔ وہ خود محنت کر کے کمائی

تھی۔ پھر کھانا بناتی۔ اسے اپنے ہاتھ سے کھلاتی۔ اس کے زخموں کی مرہم پٹی کرتی۔ گھر کے اور سو

کام۔ اس کے باوجود اسے ہر دم مستقیم کا دھیان رہتا تھا۔ مستقیم نے پڑھا تھا۔

”مرد کی محبت میں اگر جلیبی ہو اور قہل کے ساتھ نرمابٹ ہو تو اکھڑی اور متغیر عورت بھی اس کے

پروں کی دھول بننے سے نہیں ہچکچاتی۔ اس کی اناریت کی دیوار کی مانند مرد کے پیروں تلے ڈیر ہو جاتی

ہے کہ اسے اپنی بار پر دکھ، افسوس یا پچھتاوا نہیں ہوتا۔ بلکہ اک طمانیت آمیز مسرت محسوس ہوتی ہے۔

اس کا دل بہت وسیع ہو جاتا ہے کہ مرد کی فتح اسے اپنی شکست سے زیادہ عزیز ہو جاتی ہے۔ عورت کا

قضا تو فقط اتنا ہے کہ پہل مرد کی جانب سے ہو۔ تاکہ اس کے نسوانی وقار کو دھچکا نہ لگے۔ کیا محبت

کرنے والا مرد اتنی گنجائش نہیں رکھتا کہ اسے یہ تحفظ دے سکے۔ اسے ہر دھچکا پہنچائے بغیر سمیٹ

لے۔

اس نے پہل کی تھی۔ اس نے عمل نیک کا بیج بویا تھا انجانے میں کسی۔ مگر اب وہ صلہ پار ہا تھا۔

کل جب دیا اس کے پیروں میں بیٹھی اس کی انگلیوں کا مساج اتنے دھیان سے کر رہی تھی تو مستقیم

نے ایک دم سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”ایسے کام تم نہ کیا کرو دیا! مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

وہ کتنا زور دینے لگا ہوا تھا۔ دیا نے اسے دھیان سے دیکھا تھا۔ کیفیت کو سمجھا اور محسوس کیا تھا پھر

رقم سے منکرانے لگی تھی۔

”مگر مجھے اچھا لگتا ہے۔ آپ کی خدمت کرنا۔ بلکہ خوشی ہوتی ہے۔ مستقیم! میں چاہتی ہوں آپ

بھلی نصیب ہو جائیں۔ پھر آپ کام پر جایا کریں۔ میں آپ کا انتظار کیا کروں۔ جب آپ آ جائیں

تو۔۔۔“

اس کی آنکھوں میں کتنے خواب تھے۔ کتنے رنگ تھے۔ وہ ان خوابوں کی تعبیر اسے بخشنا چاہتا تھا

مگر اسے لگتا وہ بار جائے گا۔ دیا تھک جائے گی۔

”تم بھی پچھتاؤ گی تو نہیں دیا!“

”مشرقی عورت ایک بار شادی کرنا چاہتی ہے۔ وہ محبت بھی ایک بار کرتی ہے۔ مستقیم میں

وہ کام کر چکی۔ پچھتانے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”لیکن تمہاری شادی تمہاری مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔“

وہ جتا رہا تھا یا پھر اس سے کچھ حوصلہ افزائی سن کر خود کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت معذوری کے پیرے سے گزر رہا تھا۔ چڑچاہٹ اس کے مزاج کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ وہ حساس اللہ زور رنج بھی ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھار تو دیا کو وہ بالکل کسی بچے کی طرح لگتا۔ شاکی، خفا اور بیزار رہتی ہوا۔ جو منانے لاڈ اٹھوانے کو یہ ساری حرکتیں کیا کرتا ہے۔ وہ اس کو منانے بیٹھ جاتی۔ کسی ماں کی طرح سے اس کے غم سے برداشت کرتی اور لاڈ اٹھائے جاتی۔ وہ کبھی اس سے بیزار نہیں ہوتی تھی۔ وہ کبھی اس سے اتنا ہی نہیں تھی۔ بسا اوقات وہ خود حیران ہونے لگتی۔ یہ خود ہی تھی جسے مستقیم سے چڑھتی۔ اس کی محبت سے نفرت تھی۔ مگر اب خود محبت کی تھی تو مستقیم کی ہر ادا پر پیار آتا تھا۔ غصہ کیا ہوتا ہے اسے بھول بھال گیا تھا۔ اس کے لیے سب کچھ یہی شخص قرار پا گیا۔ آنکھوں کی روشنی سے لے کر دلی کے قرار تک، وہ اللہ کی شکر گزار تھی۔ جس نے اس کو محبت کا انمول خزانہ عطا فرمایا تھا۔ محبت کے بغیر یہ راستہ کتنا دشوار گزار ہوتا۔

”بالکل ہوئی تھی مرضی کے خلاف۔ مگر کروانے والا اتنا پادری تھا کہ اپنی منوانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے سامنے میری اوقات ہی کیا جو انکار کر جاتی۔“

اس کے جذبات اپنے رب کے لیے ایسے ہی عقیدت مندانہ ہوا کرتے تھے کہ مستقیم مہبت ہو جایا کرتا۔

”آپ کو یاد ہے مستقیم! آپ نے کہا تھا۔“

میری آنکھوں کے جادو سے شاید تم ناواقف ہو جس پر مجھ کو پیار آ جائے، اس کو پاگل کر دیتا ہوں چھوڑ کے مجھ کو جانے والا لوٹ کے واپس آئے گا دائیں بائیں آگے لگا کر آگے جنگل کر دیتا ہوں

اس کی مسکان گہری ہو رہی تھی۔ اس نے مستقیم کی حیران آنکھوں میں جھانکا تھا پھر حیرت ہوئی۔

”آپ بہت چالاک تھے۔ ان آنکھوں کے سحر میں جکڑ لیا مجھے۔ کتنا چاہا تھا اس شخص دانستہ، قدم نہ رکھوں۔ کتنا بدکئی رہی مگر آپ نے اپنا کہا ج کر دکھایا تھا۔ میرے دائیں بائیں آگ لگی تھی۔ سامنے جنگل تھا اور ان ساحر آنکھوں کی جکڑتی ہوئی کشش۔ پاگل تو ہونا تھا مجھے۔“

اب کے اس کے لہجے میں مصنوعی ہچارگی اور بے بسی تھی۔ مستقیم کھل اٹھا تھا۔ جیسی ایک دم اٹھ کر

پہنچا۔ اس کی بجھتی آنکھوں میں کیسے روشنیاں جل اٹھی تھیں۔

”یار اتنی خوبصورت باتیں اور اتنے فاصلے سے۔ کچھ اتنی اچھی نہیں لگ رہی۔ یہاں آؤ تاؤ را۔“

اس نے اپنے پہلو کی جانب اشارہ کیا۔ انداز شوخی سموئے ہوئے تھا۔ دیا گز بڑا سی گئی۔

”آرام سے بیٹھ رہیں۔ بہت کام ہے مجھے۔ رات تھوڑی نہیں ہے روئیں جھاڑنے کو۔ میں حیران ہوں۔ آپ کے محبت کے خزانے آخر کتنے بھرے ہوئے ہیں۔ ختم ہی نہیں ہوتے۔“

شائیں مسکان لبوں پر سجائے وہ اسے پھیر رہی تھی۔ مستقیم نے جواباً اسے چمکتی نظروں سے دیکھا پھر رو آؤ بھری۔

”مخترم۔ ہم تو ہر کام ڈھنگے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔ چاہے وہ محبت ہو یا پھر کوئی گناہ۔ آپ کی طرح کسی کے سونے کا یقین کرنے کا انتظار نہیں کرتے۔“

اس کے جتنا تے ہوئے شریر مگر معنی خیز لہجہ پر دیا بے ساختہ چوکی اور کچھ خائف ہو کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

وہ لب کے بل ہراساں ہوئی اور اس سے جیسے نظریں چاٹنے لگی۔

”اب اگر ہم بتائیں گے تو مگر جائیں گی صاف۔ کاش کمرے میں کمرے لگے ہوتے۔ ثبوت فراہم کیا جا سکتا کہ مخترم دیا مستقیم آدمی رات کو چپکے سے اٹھ کر اپنے ہی شوہر کو چوری چوری گھنٹوں بچتی ہیں۔ صرف دیکھتی نہیں پیار بھی کرتی ہیں۔ ایویں تو خواہو آنکھوں پر قصیدہ نہیں پڑا رہی تھی۔ اتنی پسند ہیں میری آنکھیں اور انہیں چومنے کا دل کرتا ہے تو۔“

دیانے تاج سے چلتے چہرے کے ساتھ لپک کر اس کے من پر ہاتھ رکھا۔ مگر اس کی نظریں ٹھہر کر، اتنی کسان ہو رہی تھیں کہ اسے حیا آمیز خفگی سے گھورتی دیا کی پٹکیں لرز کر جھک گئیں۔ حیا کی لہجہ گفت، سیاہت، غصہ، خجالت، وہ ہونٹ کچلتی خفت سے سرخ پڑ رہی تھی۔ مستقیم کی چمکتی سیاہ آنکھوں کی معنی خیز چمک سے اس کا لودیتا چہرہ کچھ اور متمایا تو اس نے مستقیم کے کاندھے پر اپنی گھبراہٹ منانے کو بے دریغ کئی کے مارے تھے۔

”مخترم۔ زیادہ بدتمیز ہیں آپ۔“

مخترم کی حیا سے جھلتے چہرے کو باتوں میں ڈھانپتی وہ غصے میں چینی۔

”مگر جوا اب بھی۔ کمرے نہیں تھے کمرے میں۔ ثبوت تھوڑی ہے میرے پاس۔“

اس کا ارادہ دیا کو مزید زچ کرنے کا تھا مگر وہ بجائے جلتے کڑھنے کے اتر گئی۔

”میں کیوں مکروں۔ ہاں کر رہی تھی پیار، کسی کو اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہرگز مجھ پر نہیں ہے۔“

وہ ننھی سی ناک چڑھائے اب نخوت سے بول رہی تھی۔ مستقیم کے بلند قبضے نے اسے روکا تھا۔

”اب آپ ایسے جھگ کریں گے مجھے۔“

وہ لڑنے کو تیار تھی۔ اس نے ہنسی ضبط کرتے سر کو نفی میں جنبش دی تھی پھر یونہی ہنسی سے بے جا ہوتا ہوا ہلکا ہوا ہوا۔

”نہیں یار! یہ سب کچھ باور کرانے کا مقصد یہ ہے کہ تم اسی طرح اب بھی مجھ سے پیار جتاؤ۔ اس پیار سے شوہر کا حق ہے جو ہر وقت اپنی بیوی کی تعریف کرتا ہو اس سے پیار بھی کرتا ہو۔“

خوابیدہ۔ دھیمے ارمان جگاتا ہوا سر گوشیاں لہجہ دیا کے جسم و جاں میں پر حدت سنسنی پھیلا رہا تھا۔

”مذہور کھیں۔ اونہ۔ اب اتنی بھی حسین اور قاتل نہیں ہیں آپ کی آنکھیں۔“

اس کے شریرو شوخ معنی خیز انداز سے دیا کا شرم سے برا حال ہو رہا تھا۔

”بہت کھنور ہو۔ خیر میں بھی معاف کرنے والوں میں نہیں ہوں۔ پوچھ لوں گا رات کو۔“

ہے نامیرے پاس۔

وہ مصنوعی غصے سے کہتا منہ پر ہاتھ پھیر کر گویا عہد باندھ دیا تھا۔ انگ انگ سے سرور چھٹا رہا۔

دیا کی پلکوں پر ڈھیروں بوجہ آن گرا۔ کچھ کبے بغیر وہ تھمتھائے چہرے سمیت کچن میں چاٹھی۔

نیم کی شاخوں میں چڑیاں چھپ رہی تھیں۔ کچھ پیالے میں رکھے دانے اور پانی سے الٹی

مٹانے میں مصروف بار بار پھڑ پھڑا کر چار پانی پر نیم دراز مستقیم کو چوکا دیتیں۔ دیا کی سلاخی

آواز رکی ہوئی تھی۔ اس نے گردن منوڑ کر دکھایا۔ وہ سوئی میں دھاگہ ڈالے ترپائی کرنے میں

صبح چہرے پر بالوں کی موٹی لٹیں اس کے گالوں کو بار بار چومنے لگتیں۔ جنہیں وہ مصروفیت کے

میں کانوں کے پیچھے اڑتی مگر وہ بیتابی سے پھر لپک کر اس کے رخساروں پر انکھیلیاں کرتے

مستقیم کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکان بکھر گئی۔

چوم لیتی ہیں مچل کر ہونٹ کبھی گال

تم نے زلفوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے

شادی کے محض تیسرے دن جب وہ نہا کر نکلی تھی اور بالوں کو تو لیے کی قید سے آزاد کرنے کے

بعد سلی نے میں گمن تھی مستقیم نے اس کی لٹوں کو گال سے انکھیلیاں کرتے دیکھ کر شرارت سے کہا تھا۔

جب کتنی رو ہانسی ہو گئی تھی وہ۔ بات بات پر بھڑکتی اور بلی کی طرح پنچے مارنے کو تیار۔

”مجھے ہاتھ مت لگایا کرو۔ مجھ سے بات مت کیا کرو۔“

ان وقت بھی اس کی گستاخی پہ دیا کے سر پہ جیسے خون سوار ہو گیا تھا مگر نچال ہے جو وہ پرواہ کرتا

ہو اس کی ناراضگی کی۔

”سو رہی زوہ! اس کے بغیر تو گزارہ نہیں ہو سکتا۔“

اور وہ رو ہانسی ہو گئی تھی۔

”کاش۔۔۔ اے کاش! اس حادثے سے پہلے کوئی ایک مر گیا ہوتا۔ تم یا پھر میں۔“

اور مستقیم اس کی برہمی کی شدت سے بڑھ کر لہجے کی نفرت سے لخت لخت ہوا تھا۔

”میں نے تم سے محبت کی ہے دیا! تمہارا احترام بھی بہت کرتا ہوں۔ میرے جذبات کو پذیرائی

بھلے نہ بخشے مگر ان کی توہین بھی مت کرنا کہ میں ڈرتا ہوں۔ میرے اندر کا کوئی منفی احساس محبت کے

ان خوش احساس کو بد نما نہ کر دے۔ وارث شاہ کہتا ہے۔ ”محبت کی آگ میں جل کر انسان سونے

سے گندن بن جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات تپش محبت سونے کو پگھلا کر اس کی ہیست ہی بگاڑ دیتی ہے۔“

میں اک بار بگڑا اور نوٹ چکا۔ دوسری مرتبہ اس اذیت سے گزرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ میں جانتا

اول محبت کی تعین کردہ راہوں پر چلنا بہت کٹھن اور صبر آزما ہے کہ بعض اوقات طویل سفر کے بعد بھی

حوال نہیں ملتی۔ اور بے نام مسافت کی تحکین سے موت کی آغوش میں پناہ لے لی جاتی ہے۔ میں نے

تمہارے سامنے کارہ دل پھیلا دیا ہے۔ یہ تمہاری مرضی ہے اس میں اپنی توجہ اور التفات کے سکے ڈالو

یاد میں نہ جبر نہ ظفر ہوں گا۔ موت کی آغوش میں سونے سے پہلے تک۔ دیا! محبت کے بغیر بھی زندگی

گزر تو جائے گی مگر یاد رکھنا محبت زندگی کا بے حد اہم جزو ہے۔ اس کے بغیر یہ زندگی بے مقصد رہتی

ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا میری زندگی بے کار بے مقصد گزرے۔ فارسی کے یہ اشعار تمہارے نام کرتا

ہوں ہمیشہ کے لیے۔“

خبر رسیدا شب کہ نگار خواہی آدم

سرمں فدائے راہے کہ سوار خواہی آدم
باہم رسیدا جانم تو بہان کہ زندہ مانم
یہیں اذان کہ من غانم بہ چہ کا خواہی آدم
یار من بیا بیا ہاں من بیا بیا

(مژدہ سنا ہے کہ آج رات تو آئے گا۔ میرا سران راہوں پر قربان ہو جن سے تیری سواری
گزرے گی۔ میری جان لبوں پر آگئی ہے۔ تو آ کہ میں زندگی ہو جاؤں۔ میرے مرنے کے بعد آیا تو
تیرا آنا میرے کس کام کا۔ میرے یار آ جا۔ تو آ جا۔)
کتنی شدت تھی تب اس کے لہجے میں۔ اس کے انداز میں۔ جس نے اس وقت تو پہنچیں دیا کہ
کتنی اثر کیا تھا مگر اب جبکہ بے خیالی میں ہی اس کے ہونٹوں پر "یار من بیا بیا" کی گردان جاری ہوئی
تو ضرور دیا اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر اس کے پاس چلی آئی تھی۔
"خیریت؟"

وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ مسکراتے پر کچھ حیران ہوئی۔
"میں نے دل میں پکارا تھا تمہیں یار! تم آ گئیں تو اس کا مطلب دل سے دل کا تعلق کچھ اور گہرا
ہوا ہے۔"
مستقیم کی بات سن کر دیا نے منہ پھلایا تھا اور شاکی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"ہی ہاں ابائل۔ اتنا گہرا ہوا ہے تعلق کہ پہلے کی طرح کے سارے پیارے انداز بھولتے ہا
رہے ہیں۔"

عجیب شکوہ ہوا تھا۔ مستقیم کی تو آنکھیں ممتوں سے ابل پڑیں۔
"یار عجیب لڑکی ہو تم! پر سوں محبتوں کی شدتوں سے گھبرا کر شکوے کر رہی تھیں اور آج۔"
"مستقیم آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے۔ بدل رہے ہیں آپ۔ یاد ہے پہلے کیسے بات بات پر مجھے
شاعری سنایا کرتے تھے اور اب۔"

اس نے چھو لے ہوئے منہ کو کچھ اور سو نہ لیا تو مستقیم کی ہنسی چھوٹنے لگی تھی۔
"دادی کہتی ہوں گی اگر شوہر کو بدلتا ہوا محسوس کرو تو اسے آرام سے محبت سے پیار سے اصلاح
دلاؤ۔"

وہ مسکراہٹ دبائے کبہ رہا تھا۔ دیا نے چونک کر اسے دیکھا پھر فحالت سے سرخ پڑتی اس کے

ہارو پر گونسنے مارے گئی۔

"انہیں کیا ضرورت تھی مجھے ایسی پنی پڑ جانے کی۔" وہ خفا ہوئی۔

"ہاؤ کاٹش پڑھا دی ہوئی۔ میرا بھلا ہو جاتا۔ تم ہر اچھی بات اسنے فاصلے سے تو نہ کرتیں۔"
وہ مسکراہٹ دبائے کبہ تھا۔ دیا ناراضی کا تاثر چہرے پر سجائے اٹھی۔ مستقیم نے اس کا ہاتھ نرمی
سے تھام لیا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"آپ کو کیا؟" وہ نرموٹھے پن سے کبہ گئی۔

"مسکراؤ گی نہیں؟ میں تمہیں خفا نہیں دیکھ سکتا۔"

وہ مسکھارہا تھا۔ صاف لگتا تھا مسکھارہا ہے۔

"اونہ۔" دیا نے اپنا ہاتھ جھٹکے سے چھڑا لیا۔ مستقیم نے دوپٹے کا پلو بہت عجلت میں پکڑا تھا۔

میرا ایمان محبت ہے محبت کی قسم!

مسکرا جان بہاراں کہ سویرا ہو گا

دور صدیوں کے رواجوں کا اندھیرا ہو گا

عشق کی راہ کہاں روک سکے اہل ستم

میرا ایمان محبت ہے محبت کی قسم!

وہ بہت آہستگی سے گنگنایا تھا۔ دیا خوشگوار حیرت میں گھرتی بے اختیار اس کی جانب پلٹ گئی۔

"ہنس۔ یا کچھ اور؟"

"بہر اور۔۔۔" اس نے مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش میں ناکام ہوتے کھٹکھٹا کر کہا۔ مستقیم

نے غم کیا تھا اور گلا کھٹکا رہا۔

عجیب تعلق سا ہو گیا ہے۔

تمہاری آنکھوں کے جلتے بجھتے سے ان آئینوں سے

یہ کیا مراسم نکل پڑے ہیں

تمہارے دل کی اداس گیہوں میں رہنے والے

دکھوں کے سارے ہی دہریوں سے

کمال رشتے میں بندھ رہے ہیں

جو درد کا ہے جو روح کا ہے
جو زندگی کی شکستی کے عذاب کا ہے
یہ لگ رہا ہے کہ جیسے آنکھوں میں
سارا منظر ہی خواب کا ہے سراب کا ہے
عجیب تعلق سا ہو گیا ہے

تمہاری آنکھوں کے جلتے بجھتے سے ان آنکھوں سے
نظم سنانے کے دوران ہی اس نے دھیرے دھیرے دیا کا دوپٹہ کھینچتے اسے خود سے نزدیک کر
لیا تھا۔ باقی فاصلہ دینے خود سمیٹ دیا اور اسی کے سینے سے سر ٹھکا کر بیٹھ گئی۔

”یہ بالکل سچ ہے دیا!“
اس کا لہجہ مدح مگر مضبوط اور پُر یقین تھا۔

”میں جانتی ہوں۔“
دینے آنکھیں موند لیں۔ پھر یونہی بند آنکھوں کے ساتھ سر گوشی سے مشابہ آواز میں بولی تھی۔
مستقیم بہ تن گوش ہوا اور اس کے گرد اپنے دونوں بازو مائل کر دیئے۔
”آپ میری زندگی کی سب سے اہم خوشی ہیں مستقیم! میری زندگی کا سرمایہ اور اثاثہ۔ میں ہمیشہ
آپ کے ساتھ، آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ پلیز کبھی مجھ سے دور مت ہونا۔“
”جیتے ہی ایسا ممکن نہیں ہے۔ جان مستقیم اتم بھی سن لو۔ اگر بچے میں گمن ہو کر تم نے مجھ سے
دور ہونے یا نظر انداز کرنے کی کوشش کی تو مجھے برا کوئی نہیں ہوگا۔ ہر روز لڑائی ہوگی۔“
وہ بھی دھمکانے لگا۔ دیا جواباً کھٹکھٹا کر ہنس پڑی تھی۔ زندگی میں بہت کچھ نہ ہونے کے باوجود
زندگی مکمل تھی۔ آسودہ تھی اور بھرپور تھی۔ مگر ضروری تو نہیں وقت ایک جیسا رہے۔ البتہ یہ بات اگلی
دونوں ہی نہیں جانتے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ جیسی دوائے کر لیٹ گئی۔ آنکھ لگی تو بھلا وقت گزرتا
احساس کہاں رہتا تھا۔ جاگی تو سہ پہر شام میں ڈھل رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بال سینیٹی باہر آئی تو پہلے
پر ہی قہقہہ سی گئی۔ آگن دھلا دھلا یا صاف نہ تھا۔ گھر سمٹا ہوا چمکتا۔ حالانکہ جب وہ لٹھی پورا گھر
ہو رہا تھا۔ کل اسے آرزو پورا کر کے بھیجنا تھا جس میں لگ کر باقی کے کام رہ ہی گئے تھے۔ خاص

گھر کی صفائی۔ صبح بھی مستقیم کو بس ناشتہ ہی دیا تھا یا نماز پڑھ سکی۔
”یہ نہ نائیاں وغیرہ آپ نے کیں؟ اور اب یہاں کیا کر رہے ہیں؟“
وہ نے ان پریشان سی چکن میں آئی تو مستقیم کو رخ پھیرے مصروف پا کر اسے مخاطب کیا۔ وہ
پہنچ کر پانا تھا گھر دیا کو ہونق کر دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے۔ اس کے کہنیوں تک آنے لگی سے لٹھڑے
ہاتھ دیکھتی یکدم منہ پر ہاتھ رکھنے بیٹھ گئی۔

”پلیز! جان پھڑاؤ میری۔ میں تو مدد کر رہا تھا تمہاری۔ تم مذاق اڑا رہی ہو۔“
وہ زنی سے جھنجھلایا۔ دیا یونہی بیٹھ ہوئے اس کے قریب آئی پھر اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔
کس نے کہا تھا ایسی مدد کرنے کو۔

”دیا“ ”وہ دھاڑا۔“

”اوکے۔ اوکے۔ آئیے ادھر۔“ وہ خشک آنے سے گھبرا آنا اس کے ہاتھوں سے رگڑتی
زنی سے اتارنے لگی۔

”آپ مجھے اٹھا لیتے۔ اگر بھوک لگی تھی تو۔“

”اب برتن میں پانی لے کر خود اس کے ہاتھ دھو رہی تھی۔ مصروف رہ کر بولی۔

”طبیعت جو ٹھیک نہیں تھی تمہاری۔ اب کیسا محسوس کر رہی ہو۔“

”اللہ کا شکر ہے۔ آپ بتائیے اتنے کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ساری احتیاط بھلا دی۔“
وہ فرمندی تھی۔ مستقیم مسکرا دیا۔

”میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ سوچ رہا ہوں کل سے کس کام پہ بھی چلا جاؤں۔ بیکار بیٹھے عاجز آ
گیا ہوں سچ سچ۔“

”یہ بیکاری نہیں تھی مستقیم! احتیاط اور پرہیز تھی۔ میں خود آپ کے زخم دیکھوں گی پھر ہی بتا
سکتی گی۔ اچھی کام پہ جانا ہے یا نہیں۔ اور ہاں آئندہ ایسے کام نہیں کیجیے گا۔“

وہ اس کے ہاتھ دھو کر صاف کر چکی تھی۔ دوپٹے سے خشک کرنے کے بعد آنے کی سمت متوجہ ہو
گئی۔

”کیوں نہ کروں بھلا کام! ہاتھ بنانے میں کوئی حرج ہے؟ میں تو سوچ رہا ہوں باقاعدہ سیکھ لوں
تو آئے آئے جیسی تمہاری حالت ہو جانی ہے ڈیوڑی کے نزدیک جا کے تو مشکل نہیں ہوگی۔“

وہ عجیب تھا۔ پڑھی تھیٹ کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا تو دینے آنا گوندھتے ہوئے سر اٹھا

کرا سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر حجاب کا تاثر اتر رہا تھا۔

”آپ فکر نہ کریں۔ اس مسئلے کا حل تو بہت بہترین سوچا ہے میں نے۔“

وہ مطمئن تھی۔ مستقیم نے الجھ کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟ کوئی ملازم رکھو گی تم؟“

اس سوال پر دیا زور سے فہم پڑی تھی۔

”ایسی پوزیشن میں آنے کے لیے تو ہمیں بہت اسٹرنگل کرنے پڑے گی۔ میں نے کچھ سوچا ہے۔“

”ہاں۔“

”اتنی اسٹرنگل کہ تم میرا پہلا نہیں شاید بارہواں تیرہواں، بچہ جنم دینے والی ہو گی۔“

اس کے چہرے پر جھولتی لٹ کھینچ کر شرارت سے بولا تو دیا بڑی طرح سے جھینپی تھی۔

”اف۔۔۔ اتنے خطرناک ارادے ہیں آپ کے؟“

وہ چیخ پڑی۔ مستقیم ہنسنے لگا۔

”اس سے بھی زیادہ۔۔۔ بتاؤں؟“ وہ اس پر جھکا۔ دیا نے اسے آنے سے سنے ہاتھوں سے روک دیا۔

”بچے دھکیل دیا۔“

”قسم سے تم بہت ان رو میٹنگ لڑکی ہو۔“

وہ سرد آہیں بھر رہا تھا۔ دیا ان سنی کیے روٹی پکانے کی تیاری کرنے لگی۔ وہ چولہا جلا رہی تھی۔

بھی اک مرحلہ ہوا کرتا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی لکڑیاں نہیں جلائی تھیں۔ مگر اب زندگی کا یہ

ذہب تھا۔ وہ کتنی مشکل سے آگ جلا کر کھانا تیار کرتی تھی۔ شروع میں کئی بار اس کا ہاتھ جلا۔ مستقیم

اسے منع کرتا تھا اور تنور سے روٹیاں اور سالن بھی اتار رہا۔ مگر کب تک دیا خود بھی نہیں چاہتی تھی۔

عادی ہوتی جا رہی تھی۔

”تم نے بتایا نہیں دیا! کیا سوچا حل تم نے؟“

آگ جل چکی تھی۔ تو اچھو لے پر چڑھ چکا تھا۔ جس سے آگ کے لیے شعلے زبانیں نکال رہی تھیں

تھے دیا نے روٹی بیلے ہوئے اک مہا مچتی نظر اس پر ڈالی۔ وہ جیسے اس کے جواب کا ہی پتھر تھا۔

”پہلے بتائیں آپ خفا تو نہیں ہوں گے۔“

وہ محتاط انداز میں جس طرح سوال کر رہی تھی اس نے مستقیم کو حیران کر کے رکھ دیا۔

”ارے۔۔۔ ہر بات کیوں سوچتی تم نے بھلا؟ یا رمن مستقیم کے دل پر آپ کی حکومت ہے۔“

آپ سے فضا ہونے کی مجال۔“

خفا معاوہ ہنسنے لگا مگر دیا کی سنجیدگی کا وہی عالم تھا۔

”مجھے لگ رہا ہے۔ آپ لازمی خفا ہوں گے۔“

”اب تو مجھے اور بھی بے چینی لگ گئی ہے۔ آخر ایسی کیا بات ہے؟ اچھا چلو پر اس! نہیں ہوتا

خفا۔ تم بتاؤ تو۔“

وہ تجسس بھی تھا۔ حیران بھی۔ دیا نے روٹی سینک کر چنگیر میں رکھی اور سالن کی کنوری سمیت

اس کے سامنے کی۔

”آپ کھانا کھائیں۔ پھر بتاتی ہوں آپ کو۔“

وہ رساں سے کہتی اگلی روٹی نیل رہی تھی۔ مستقیم بد مزہ ہونے لگا۔

”یہ بھلا کیا بات ہوئی دیا! تم مجھے الجھا رہی ہو۔“

”داوی کہا کرتی تھیں مستقیم! جس بات کا پہلے سے خدشہ ہو کہ وہ سامنے والے کا موڈ خراب کر

وے کی اسے ایسے وقت میں کرنا چاہیے جب اس کا مناسب وقت ہو۔“

”یار سب سے پہلی بات تو یہ کہ تمہاری داوی مجھے اچھی خاصی لاجیکل خاتون لگی ہیں۔ ان کی

باتیں سن کر میرا اہنا دل بھی ان سے ملنے کو چاہنے لگا ہے۔ اور بات سنو۔ کیا یہ مناسب وقت نہیں

ہے بات کا تو پھر کب۔۔۔؟“

”ہے نا؟ میں خود یہ چاہتی ہوں کہ آپ کو داوی سے ملاؤں۔ وہ بہت پیاری بہت ہی مائس ہیں

مستقیم۔“

دیا جوش میں آ کر تیز تیز بولنے لگی۔ مستقیم نے اسے سنجیدگی سے دیکھا تھا۔

”تم نے میری دوسری بات کا جواب نہیں دیا۔“

دیا کا جوش و خروش دم پڑا اس کی جگہ ہلکی فٹکی نے لے لی۔

”آپ نے بھی تو میری بات کا جواب نہیں دیا مستقیم مگر میں۔۔۔۔۔“

معا اس نے سر جھٹکا پھر زور سے پن سے بولی تھی۔

”یہ کھانے کا وقت ہے۔ کسی گھمبیر نا پک کو اگر چھیڑا جائے تو کھانے کے وقت بد مزگی اور

انتھار پھیلتا ہے جو مناسب نہیں۔ رزق سامنے رکھ کر لڑنا جھگڑنا بالکل غلط ہے۔ داوی جیسی منع کرتی

تھیں اس بات سے۔“

”او کے فائن اوو بہت سمجھ دار خاتون ہیں بلاشبہ! خدا ان کی عمر دراز فرمائے آمین مگر بیوی اس وقت تو تم نے خود اپنا موڈ خراب کر لیا ہے۔“

وہ مسکراہٹ چھپاتا گویا اب اسے چھیڑ رہا تھا۔ دیا دیکھ سی گئی۔ مگر کچھ کہا نہیں۔
”چائے پیئیں گے؟“

وہ کھانا کھا چکا تو دیا نے سوال کیا تھا۔ مستقیم نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔
”تم کھاتی رہو کھانا۔ میں خود بنا لیتا ہوں۔ تم پیو گی؟“
”نہیں۔۔۔ موسم بدل رہا ہے۔ اب دل نہیں کرتا۔“
”اچھا پھر دو دھ ضرور پی لینا۔“

دیا نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ دونوں کچن سے نکلے تو عصر کی اذان کی آواز اٹھنا شروع ہو گئی تھی۔

”آپ بھی نماز پڑھا کریں مستقیم!“

وہ وضو کے ارادے سے ڈاش روم کی سمت جاتی معمول کی تاکید کر رہی تھی۔ جس پر مستقیم نے حسب سابق کان نہیں دھرا تھا۔

”میں مختصر ہوں دیا! اور سنو اب ہر گز بہانہ نہیں۔“

اس کا انداز اتنا سنجیدہ تھا کہ وہ سرد آہ بھر کے رو گئی تھی۔ کچھ دیر سر جھکائے انگلیاں چٹائی رہی پھر اسے دیکھا تھا اور ملتی ہو کر بولی۔

”آپ مان لیں گے تا میری بات؟“

”چلو۔۔۔ اب پھر شرطیں۔“

وہ جیسے سر پینے والا ہو گیا۔ پھر جیسے اس کے حال پر رحم کھایا۔

”چلو مان لوں گا۔ اب بولو۔“

دیا کے چہرے پر یکفخت روشنی ہی چھا گئی۔ انھی اور اس کے ہاتھ جو شیلے انداز میں قلم لے۔
”مستقیم! ہم واپس چلتے ہیں۔ آپ کے امی اور بابا کے پاس۔ دیکھیں۔۔۔“

وہ اگر سہم کر بات ادھوری چھوڑ گئی تھی تو اس کی وجہ مستقیم کا انتہائی سرد انداز تھا۔ جس میں اس نے یکدم دیا کے ہاتھ جھٹک دیئے تھے۔

”اچھا۔۔۔ تو یہ بات تھی۔ جس کے لیے اتنی شرطیں منوائی جا رہی تھیں۔“

وہ یکدم ضبط کھو کر چیخ پڑا۔ دیا اسی قدر گھبرائی۔ شہنائی۔

”خلیفہ میری بات۔۔۔“

”میں نے تمہیں کہا تھا دیا! اس موضوع پر بات نہ کرنا مجھ سے۔“

وہ فریاد اور انگلی اٹھا کر یاد دہانی کرائی۔ اس کی آنکھیں یکدم متنی سرخ ہو گئی تھیں۔ دیا کو کم از کم اب اس سے اتنے شدید رویے کی توقع نہیں تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں دہانے لگی۔

”اگر تم چاہتی ہو دیا کہ ہمارے تعلقات میں سرد مہری نہ آئے تو آئندہ یہ تقاضا نہیں کرنا۔ میں ابھی پہلے زخم بھرنے میں ناکام ہوں۔ تم چاہتی ہو میں پھر۔۔۔“

”سردی تو نہیں ہے مستقیم! حالات اب بھی ویسے ہوں۔ میں ممکن ہے وہ پچھتاوے یا بدل۔“

دیا کہن چاہتی تھی مگر خلیفہ مستقیم نے اسی شدید موڈ کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر اس کی بات قطع کر دی۔
”بات سنو۔۔۔ تم تو محض اک قیاس آرائی کر رہی ہوتی؟ اگر مجھے کوئی آکر یہ گواہی بھی دے

کہ وہاں ایسی کوئی صورتحال ہے تو بھی میں پلٹ کر وہاں جانا گوارا نہیں کروں گا۔ سمجھیں؟“
اس کے لہجے میں غرا نہیں در آئی تھیں۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا۔ تن فٹن کرتا ہوا گھر

سے ہی نکل گیا۔ دیا بے دم سی ہوتی گرنے کے انداز میں وہیں بیٹھ گئی۔ آنسو بے آواز اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ زندگی کا ہر مرحلہ کنھن تھا بہت کنھن۔ پتہ نہیں وہ کس حد تک لڑ سکتی تھی۔ نماز کے بعد دعا مانگتے وہ خود پر ضبط کھو کر اللہ سے ہمت اور حوصلے کے ساتھ جائز نیک مقصد میں کامیابی کی درخواست بھی پیش کر رہی تھی۔

نشد میں لیموں کے پھولوں کی ترش سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی سبز شاخوں میں سفید پھول کھلے تھے۔ لیموں کے پتے نیا پھل دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ گھنٹوں پر سر رکھے ان پتلی اور سیاہ

معدیوں والی تکیوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ جو ہر روز آتی تھیں۔ ساتھ اسے خلیفہ مستقیم کا بھی انتظار تھا۔
”تھک کا گیا واپس نہیں لوٹا تھا۔ وہ اداس تو تھی ہی مضطرب بھی ہونے لگی۔ مستقیم کی سخت اور تلخ کھامی

سبب نہ تھی دیا تھا اسے۔ اس پر طرہ یہ کہ خود خفا بھی ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے پہلو بدلتے ہوئے بے چینی سے پھر یہ دنی دروازے کی جانب دیکھا۔ جس کے پار اس کی آمد کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس نے گھبراہٹ سے بھرا منہ اور گھنٹوں پر سر رکھ لیا۔

"ہم بہت اکیلے میں مستقیم! مجھے کم از کم میرے اچوں سے تو ملنے کی اجازت دیں آپ۔"

وہ عاجزی سے کہہ رہی تھی۔ انداز میں دکھ بھرا ہوا تھا۔ مستقیم چونک کر، بلکہ ٹھٹھک کر اسے بھٹکے گا۔

"اپنی قسمت سے سمجھو یہ کرلو دیا! مجھے نہیں لگتا اب تمہاری فیملی تمہیں ایکسپٹ کرے۔"

اس کے نامحاذ انداز پر دیا جیسے تڑپ کر رہ گئی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا خلیفہ مستقیم! میں بے قصور ہوں میری فیملی آگاہ ہے اس بات سے۔"

مستقیم نظریں چڑا گیا تھا۔

"میں تمہیں شاید پہلے بھی سمجھا چکا ہوں کہ انوا شدہ اور گھر سے بھاگنے والی لڑکی کو ایک ہی نگاہ سے دیکھ جاتا ہے۔ ایک ہی سلوک سے نوازا جاتا ہے۔"

اس کا لہجہ مدھم اور بھرمانہ تھا۔ دیا چند ثانیوں کو ساکن رہ گئی۔ جانے کون کون سے ہراساں کر دینے والے خدشات اس کی دھڑکنوں میں اچھل چلنے لگے مگر اگلے لمحے وہ اس احساس کو سر جھٹک کر دبا رکھی تھی۔

"نہیں میرے والدین ایسے نہیں ہیں۔ وہ مجھے جانتے اور سمجھتے ہیں۔ کبھی میرے ساتھ ایسا بھی کر سکتے۔ بلکہ آپ دیکھیے گا۔ وہ منتظر ہوں گے میرے۔"

اس کا لہجہ خوش گمان اور پر دھوک تھا۔ مستقیم کچھ کہے بغیر اس کی آنکھوں میں جھلکاتی آس کو تکتا ہوا گھر اسانس کھینچا۔

"اندہ کرے تمہارا یقین سلامت رہے۔"

دیانے اس دعا یہ انداز پر چونک کر اور خوشگواریت میں گھر کر اسے دیکھا تھا۔ پھر ایک دم چوکی۔

"یعنی آپ کو برا نہیں لگا؟ خلیفہ میں مل سکتی ہوں نا اپنے گھر والوں سے؟"

"تمہارا گھر والا تو بس میں ہی ہوں۔ ہاں البتہ تم اپنے والدین اور ڈیزسٹ داوی۔ سے مل لو گی۔"

انہی کے ہلا کیے فرق پڑے گا۔

وہ کانٹے سے اچکا کر کہہ رہا تھا۔ دیا ایک دم سے نہال ہو کر کھلکھلائی۔

"اف! مستقیم! آپ کتنے اچھے ہیں۔ کاش میں آپ کو بتا سکتی۔"

وہ پچھلی آنکھوں سے ہنستی ہوئی بہت معصوم اور پیاری لگی تھی مستقیم کو۔ وہ کبھی اسے اجازت نہ دے دوسرے لفظوں میں آزمائش نہیں چاہتا تھا مگر جس طرح دیا کو جھڑکا تھا اور وہ اس بات کو لے کر اٹھ بڑھ ہو چکی تھی۔ اب وہ مزید اسے مایوس اور دل برداشتہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی

جاتی سردیوں کا دھیمان تپا سورج پردہ مغرب میں غراب سے ڈوب گیا۔ شیش کی سرفیٹے تاریخی شینڈل دھیرے دھیرے اندھیرے میں بدلے تھے اور مکمل طور پر دھرتی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد وہ پریشانی میں جھلا بیرونی دروازے کے پاس آ کر ٹھٹھکے لگی۔ تجاہلی خوف کے ساتھ مستقیم کی ناراضی اور یوں بے احتیاطی کا غم زیادہ کھارہا تھا اسے۔ اس سے پہلے کہ گھر کر رہی ہو وہ چلا آیا تھا۔ دستک سے بھی پہلے وہ اس کے قدموں کی آہٹ پہچان کر دروازہ کھول چکی تھی۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ؟ میرا دل بند ہو رہا تھا جیسے۔"

وہ بولی تو آواز بھرائی ہوئی تھی۔ مستقیم نے اک نظر اسے دیکھا ضرور مگر کچھ کہے بغیر اندھیرے چلا گیا۔ دیا دکھ سے شل ہوئی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ خاصی دیر سے اندر آئی تو صاف لگتا تھا ایک بار بہت سارا روٹی ہے۔ مستقیم کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"دیا!" وہ بے حد بوجھل آواز میں بولا تھا۔ دیا نے محض پچھلی چلیں اٹھا کر اسے دیکھا بولی کچھ نہیں۔

"آئی ایم ساری! مجھے تم سے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ پتہ نہیں کیوں۔ بہت غصہ آ رہا ہے مجھے۔"

وہ متاسفانہ انداز میں گویا تھا۔ دیا نے ہونٹ کچل کر گویا پھر سے بہہ جانے کو تیار آنسو ضبط کیے۔

"اٹس اوکے! میں آئندہ خیال رکھوں گی۔"

وہ رقت آمیز آواز میں بولی تھی۔ چلیں ہنوز جھکی تھیں۔ جن پر نمی چپکنے لگی تھی۔

"پلیز دیا! خفامت ہو۔ دیکھو۔"

"مستقیم! میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ میں تو۔"

وہ دکھ سے بوجھل آواز میں کچھ کہتے کہتے چپ کر گئی۔

"میں جانتا ہوں۔ مگر دیا! مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ سب دکھوں کا ازالہ ہو سکتا ہے مگر اس کے تم سمجھو تو۔"

وہ بے حد عاجز اور بے بس نظر آ رہا تھا۔

"ڈیلیوری کے وقت آپ مجھے نہیں سنہال سکتے ہیں مستقیم! کسی سمجھ دار بزرگ خاتون کا ساتھ ضروری ہے۔ جیسے حالات ہیں۔ ہم کسی پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتے۔ میرا مقصد یہی تھا۔"

دیا کے کہنے پر مستقیم نے سر دآہ بھری۔

"اللہ مالک ہے۔ تم فکر مت کیا کرو۔"

کہ وہ ابھی تک خود کو دیا کا مجرم سمجھتا تھا۔ اس کے دل پر بوجھ تھا۔ وہی تھا جس نے اس بے حد محنت لڑکی کی زندگی سے ہر حسین اور خوبصورت رنگ نوج کر پھینک دیا تھا۔ اب وہ مزید اس کی دل آزاری چاہتا تھا نہ ہی اس کی حق تلفی کا گناہ کرنا چاہتا تھا۔ جیسی اسے نرم مکان کے ساتھ تکتا رہا۔

”مثلاً کتنا؟“ اس کا انداز چھیڑتا ہوا اور شرارتی تھا۔

”بہت۔ بہت زیادہ۔ سب سے زیادہ۔ پوری دنیا سے بھی۔“

وہ اس طرح چپک رہی تھی۔ جھوم کر بولی تو مستقیم کو شرارت سو جھگنی۔

”وہ کیا ہے کہ فاصلوں سے کہی باتیں میرے حافطے میں محفوظ نہیں رہیں۔ پاس آکر سمجھاؤ بات بنے۔“

دیانے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں بلا کی شرارت فک رہی تھی۔ سرگوشیاں لہجے کا بھاری ہنسنے کا مخمور خمبہ اس کے روٹنگ موڈ کی غماز تھی۔ وہ یکدم حجاب اور سخت سے سرخ پڑ گئی اور نظریں چرائیں۔

”موسم بدل گیا ہے۔ میرا خیال ہے باہر سونا چاہیے۔ میں چار پائیاں بچھاتی ہوں۔“

وہ کتر کر ٹھٹھکا چاہتی تھی مگر مستقیم نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی نرمی سے تھام لی۔

”تم خوش ہو دیا!“

دیا کو وہ بہت سنجیدہ محسوس ہوا۔ وہ سرگوشیاں میں جنبش دیتے پھر پر جوش ہو گئی۔

”آپ دیکھیے مستقیم اداوی اور امی تو مجھے مشکل ہی ہے واپس بھی آنے دیں۔ وہ اپنے پاس رکھ لیں گی۔ ڈیویری تک۔ ان دنوں مجھے کیئر کی ضرورت ہے۔ جو ماں یا پھر ساس ہی کرتی ہوتی ہیں۔“

وہ مسکرا رہی تھی۔ آنے والے وقت کا دلکش تصویر ہی اس کے چہرے پر روشنی بن کر بھیل رہا تھا۔ مستقیم کچھ نہیں بولا۔ بس اس کی چمکتی ہنسی آنکھوں کو تکتا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرے گیا۔

”اگر امی نے مجھے واپس نہ آنے دیا۔ جو کہ وہ آنے ہی نہیں دیں گی تو آپ رہ لیں گے رات دن میرے بغیر؟“

ہونٹ کا کوندہ بائے وہ شرارتی نظروں مچلتی مکان کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ مستقیم چپکے چپکے دیا کو سمجھ نہیں آئی وہ اتنا گم صم کیوں ہے۔

”مجھے تمہاری خوشی زیادہ عزیز ہے۔ اگر تم وہاں رہنا چاہتی ہو تو۔۔۔ کروں گا تو اوروں کی طرح۔“

”طرح۔“

اس نے نرمی سے جواب دیا تھا۔ دیا کچھ سست سی پڑ گئی۔ اس کے خیال میں تو مستقیم کا یہ حال

نہیں تھا۔ وہ سمجھتی تھی وہ اس کے رہنے والے آئینہ بے کور و کرے گا اور صاف کہے گا۔

”کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں پتہ ہے میں نہیں رو سکتا تمہارے بغیر۔“

مگر صورتحال کی تبدیلی نے اسے آزدو کرنا شروع کر دیا تھا۔

”کب جاؤ گی تم؟ اور ہاں یہ تو بتایا ہی نہیں تم نے کہ تم میرے بغیر رہ لو گی؟“

وہ بالآخر تاخیر سے سہی مگر اس کے دل میں مچتا سوال کر چکا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں نہیں رہ سکوں گی خلیفہ! مجھے آپ بہت یاد بھی آئیں گے اور مجھے آپ کی فکر بھی رہے گی۔“

وہ اپنے جذبات غفلت نہیں رکھ سکی۔ جیسی پوری دیانت داری سے جواب دیا تھا۔ مستقیم کے چہرے پر بھی جیسے رونق سی اتر آئی۔

”تو پھر مت رکتا واپس آ جاتا۔ ٹھیک؟“

”نہیں خلیفہ! یہ رسم ہوتی ہے۔ سینکے والے بنی کا پہلا چلہ اپنے ہاں کرواتے ہیں۔ خیر یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ آپ مجھ سے ملنے تو آیا ہی کریں گے۔“

یہ اگر سوال ہوتا تو وہ نظر انداز بھی کر دیتا۔ وہ تو اپنا خیال بلکہ یقین ظاہر کر رہی تھی۔ شاید اپنے ساتھ ساتھ اس کی حیثیت کو بھی فراموش کر گئی تھی۔ کہ وہ اغوا شدہ بنی ہے۔ اور داماد بھی کوئی اور نہیں اغوا کرنے والا شیرا ہے۔

”یار کیوں سرالیوں سے جوتے پڑوانے کے پروگرام سیٹ کرتی ہو۔“

تمام توافیت کے باوجود وہ بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں بولا تھا۔ دیا نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اسے اٹھنے سے دیکھا۔

”جیسی باتیں کر رہے ہیں آپ مستقیم! کیا آپ کی عزت میری عزت نہیں ہے؟“

اس کے انداز سے ظاہر تھا۔ اسے اس بات نے کتنا دکھ دیا ہے۔

”میں کب انکاری ہوں، مگر آپ کے والدین تو حالات جانتے ہی سب سے پہلے شوٹ کریں گے۔ زبردستی کے اس داماد اور نواسے کے خواہو اپنے والے باپ کو۔“

”یہ سب تب ہو گا تا جب میں کوئی ایسی فضول بات انہیں بتاؤں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔ اس قسم کی کوئی صورتحال پیدا نہیں ہوگی۔ ان شاء اللہ!“

☆.....☆.....☆

چوتھا حصہ

”گند، مثلاً“ کیا کہیں گی آپ وہاں سب سے میرے متعلق؟

مستقیم مسفرانہ نظروں سے دیا کوٹھنے لگا۔ اس کی نظروں کی آنچ سے دیا نے اپنا چہرہ جھپٹا محسوس کیا۔ ”کم از کم ایسا کچھ نہیں جو آپ کی عزت میں کمی کرنے کا باعث ہو۔ اک بات یاد رکھیے گا مستقیم! میرے رشتے میرے لیے بہت اہم ہیں۔ مگر ان کی اہمیت کسی بھی طور آپ سے بڑھ کر نہیں ہے۔“

اس کے لہجے میں جو رومان کے ساتھ مان کی کیفیت تھی وہ ایسا کر لینے کی صلاحیت سے مالا مال تھی مستقیم پہ قدرتی سا اثر ہوا۔ اس کے نقوش میں ابھر آنے والا تناؤ خود بخود اپنا تاثر کھونے لگا۔ ذہنی ریلیکس ہوا تو لبوں کے گوشوں میں نرم مہکان اتر آئی۔ اس کا مطلب تھا دیا اسے اتنا سمجھنے اور جاننے لگی تھی کہ اس کے اندر کی کیفیات اس کے خدشات تک پر بھی رسائی حاصل کر چکی تھی۔ کچھ کہے بغیر اس نے دیا کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ انداز میں عقیدت اور محبت کا ایسا جادو اثر رنگ تھا جس کا مہکتا احساس دیا تک بھی پہنچا تھا۔ جب وہ جھینپ کر مسکرانے لگی۔

”قدرت ہے اللہ پاک کی۔ نواز نے پائے تو رمتوں کے دیا بہا دے۔ دیا میں نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا تم کبھی اتنا بھی بدل جاؤ گی۔ اتنا بھی مجھے چاہو گی۔ ساری عمر اپنی قسمت سے شاکی رہا میں اور اس حدیث پہ دل سے ایمان لانے سے گریزاں۔“ اللہ اپنے ایک بندے سے بھی ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔“ مگر اب مجھے کسی قسم کا کوئی شبہ۔ کوئی شک نہیں رہا۔ تمہارا ساتھ تمہاری محبت و مظافر ما کر اللہ نے یہی تو بتایا مجھے۔ یہی تو سمجھایا ہے دیا کہ وہ مجھ سے بھی اتنا ہی پیارا کرتا ہے۔ جس قدر اپنی ساری حقوق سے۔ اُس نے مجھے یقین کامل سونپا۔ مجھے ایمان کو مضبوط کرنے کا موقع دیا ہے۔

وہ بول رہا تھا تو اس کا ایک ایک لفظ مہکتا تھا۔ دیا مسکراتے ہوئے طمانیت و آسودگی کے احساس سمیت اسے دیکھتی اسے سنتی رہی۔ یہی تو چاہا تھا اس نے مستقیم کا یہی رنگ دیکھنا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں مستقیم! اللہ کے ہر کام میں ہمارے لیے بہتری اور مصلحت پوشا

ہوتی ہے۔ میں بھی شروع میں نہیں سمجھی اور شاکی ہوتی رہی۔ مگر اب

دور کی جھینپی اور پھلا ہونٹ دبا کر مسکراہٹ روک گئی۔ مستقیم جو اس کی ادھوری بات پہ بے چین ہو چکا تھا۔ لینے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”مگر اب“ اس کا لہجہ سوالیہ، انداز اشتیاق امیز تھا۔

”یہ نہیں“ دیا کا گریز بڑھا۔ اسے شرم محسوس ہوتی تھی۔ اس اظہار میں جو وہ کرنے جا رہی تھی۔ مستقیم نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

”بات ادھوری نہیں چھوڑ سکتیں تم۔ یاد کرو۔ میں دن میں ستر سو مرتبہ اظہار محبت کرتا ہوں تم سے۔ اگر تم بھی اک بار کہہ دو گی تو ہرگز بھی نسوانیت کی توہین نہیں ہوگی۔ آخر یہی ہو تم میری۔“

اس نے گھر گ رہا تھا مگر انداز سے چھلکتا ہوا لاف اور مان ہی تھا جو دیا کی مسکراہٹ کو گہرا کرتا چلا جا رہا تھا۔

”اب ضروری نہیں ہے کہ میں بھی محبت کے اظہار کے جواب میں اظہار کرنا شروع کر دوں۔“

اب دیا نے دانستہ مستقیم کو تنگ ہی کیا تھا۔ مستقیم نے کچھ کہے بغیر اس کی کھائی پکڑ کر مروڑ ڈالی۔ ”اندھوری ہے۔ بہت ضروری۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے دیا! میری توانائیوں کے لیے کیا پاور فل ٹانگ ہے یہ۔“

”اس کے لہجے میں جو پیاس تھی۔ جو تھکنی تھی۔ اس نے دیا کو جکڑ کر رکھ لیا۔ وہ جانتی تھی مستقیم کی محبت کا ہاتھ اس کی ہر پے کلی کی۔“

”میں نے اپنا سب کچھ کھویا تو آپ مجھے ملے تھے مستقیم! اور کھونا اتنا آسان کبھی بھی نہیں ملا میری بڑی مشکلوں سے آتا ہے۔ مجھے بھی آ گیا۔ اس وقت میرے لیے اللہ کی تمام نعمتوں کا سب سے انمول نعمت آپ ہیں۔ بہترین تحفہ آپ کی محبت ہے۔ مجھے عمر بھر بھی اب کچھ اور نہیں ملے گا تو میں آپ کے ساتھ ہمیشہ شا کر اور آسودہ رہ سکتی ہوں۔“

اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ محبت کا جانفز احساس تھا۔ آنکھوں میں اس پل اعداد و نغمے جگنو ٹپکتے تھے۔ جو اس کے الفاظ کی سچائی کی گواہی دیتے تھے۔ مستقیم اسے دیکھنے لگا۔ اسے لگا وہ اللہ کی دی ہوئی ہے۔ روشنی کا پیکر ہے۔ بے حد خاص انعام۔ ایسا انعام جو خدا سے معافی کے مفہم سے کائنات کا ثبوت بن جایا کرتا ہے۔ دیا نے اس کی جامہ خاموشی کے جواب میں جھپٹی پٹکیں اٹھا کر اسے

دیکھا۔ اتنے خوب صورت اور والہانہ اظہار کے جواب میں یہ خاموشی اسے حیران کرنے کا باعث بنی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“

مستقیم کی وارفتانہ نظروں کو محسوس کرتے ہی وہ سرخ پڑنے لگی۔ مستقیم نے جواب نہیں دیا بلکہ اس کی نظروں کا تبسم معنی خیزیت سمیٹ لایا۔

”اپنی بیوی کو دیکھ رہا ہوں۔ میں سمجھتا تھا تم صرف حسین ہو۔ مگر آج انکشاف ہوا تم باتیں بھی بہت خوب صورت کرتی ہو۔“

وہ متبسم ہوا تھا۔ دیا اس قدر چمکتی اور لجائی۔ مستقیم کی نظروں کے مخصوص مردانہ رنگ اسے خوب صورت رنگ میں نہلانے لگے۔ وہ آج بھی اس کی ان نظروں سے شہنائے لگتی تھی جیسی منسنائی۔

”ایسے مت دیکھیں نا مجھے۔“

اور مستقیم کا قبضہ چیت اڑانے لگا تھا۔

”کیوں نہ دیکھوں بھئی؟ بیوی محبوبہ بھی ہوتی میری۔“

مستقیم نے اس کی کمر کے گرد بازو حائل کر کے خود سے قریب تر کیا۔ وہ اس قدر گھبراہٹ کا شکار کسمانے لگی۔

”میں کھانا لاتی ہوں۔ چھوڑیں۔“

”بھوک نہیں ہے یار۔ اور پلیز۔“ نوک نہیں مجھے۔ محترمہ میکے جانے والی میں۔ پھر پتا نہیں مجھے لفت گہرا کراہیں ہمیں۔“

وہ اس میں تکیں ہو چکا تھا۔ بھاری لہجہ مزید بوجھل اور فحار آلود ہوتا چلا گیا۔ دیا نے گہرا سانس لیا اور شرمیلیں چہرہ اسی کے سینے میں چھپا کر آنکھیں موہ لیں۔ زندگی اس پل مکمل تھی اور پھر نعت۔ جس کا وہ تکی جان سے شکر بجالانے کو تیار تھی۔

☆ ☆ ☆

”سب ٹھیک تو ہے نا مستقیم! شادی کے بعد پہلی بار میکے جاتے لڑکی بہت ایکساٹینڈ ہوتی ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں کوئی کمی نہ رہے۔ دادی کی خواہش تھی میں سارے سنگھار شادی کے بعد کروں۔ جیسی تو وہ مجھے ڈھنگ کا پہننے اوڑھنے نہیں دیتی تھیں۔ لیکن اب اگر مجھے سادہ دیکھا تو ہرے تو بھی ہوں گی اور یہ پراندہ۔“

بات ادھوری چھوڑ کر وہ کھٹکھٹائی اور ست رنگ پراندہ جو چوٹی میں سجا رکھا تھا پکڑ کر اس کی پٹھوں کے آگے لہرایا۔

”اماں کو بہت پسند ہے۔ وہ چاہتی تھیں میں ہر وقت پراندہ پہنوں۔ لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ یہ تو بال ہی اتنے تھے۔ پراندہ پہن کر اور زیادہ مصیبت میں جان پڑ جاتی۔ جیسی پہنتی نہ تھی ان کی بات کے باوجود مگر آج یہی پہنوں گی تاکہ انہیں بھی اچھا لگے۔“

وہ خوش تھی۔ بہت پر جوش۔ یہ اس کی بات چیت ہر انداز سے عیاں تھا۔ چمکتا چہرہ، جگمگاتی ہتھیلیں زندگی سے بھرپور جوشیلی آواز۔ صحیح معنوں میں اس کے قدم زمین پہ نہیں پڑتے تھے۔ اس نے کبھی تیاری کی تھی اور مستقیم کا سارا جمع شدہ پیرہ لگ گیا تھا۔ لیکن وہ اسے نہال اور خوش دیکھ کر خوش تھا۔

”آپ کو اندازہ ہے مجھے دیکھ کر سب سے زیادہ خوش کون ہوگا؟“

راتے میں جب وہ بس کے اڈے پر اپنے روٹ کی بس کے انتظار میں کھڑے تھے دیا نے اپنا ہاتھوں سے بھرا ہاتھ اٹھا کر مستقیم کو شانے سے ہلا کر اپنی جانب متوجہ کیا وہ مسکرایا اور حجاب سے ہجائکتی آنکھوں کو ناگہمی کے تاثر سمیت پٹکنے لگا۔

”یار! وہ مجھے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ دادی سے بھی زیادہ۔“

وہ چنبلی تھی اور یونہی چبکتی رہی۔ اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا ضروری نہیں سب کچھ اس کی طرف اور توقع کے مطابق ہو۔ کچھ الٹ بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ ہٹ کے بھی۔ وہ ان کی بیٹی ضرور تھی۔ مگر لگا بیٹی جو انہیں بچی تھی۔ وہ بیٹی ضرور تھی۔ مگر ان کے ہاتھوں رخصت نہیں ہوئی تھی۔ نہ مرضی سے نہ شرمندگی کا باعث تھی۔

وہ ذات نا بھی باعث تھی۔

اور بہت واقعات اتنے تلخ ہوتے ہیں کہ انہیں بھول جانا ہی بہترین اور فائدہ مند ہوتا ہے۔ غمناک میں مافیت ہوتی ہے۔ یا پھر ان سے مکر جانا بھی سودمند ثابت ہوا کرتا ہے۔ وہاں ایسا کچھ ہو گیا ہے۔ وہ ان احمق اور جذباتی لڑکی آگاہ نہیں تھی، نہیں جانتی تھی۔ قربانی آزمائش اور کھونے کا یہ طوطا کبھی ختم نہیں ہوا۔ اسے اس کے ساتھ چلنا ہے۔ نہ جانے کہاں تک۔ نہ جانے کب تک، وہ شرمندہ آواز اور مطمئن تھی مستقیم اس کے بالکل برعکس اسی قدر خائف، مضطرب اور خدشات کا شکار تھی جیسی کم سن اور کھوپا ہوا لگتا تھا۔

"افوہ... دیکھیں ذرا میری عقل۔ منجائی لی نہ پھل وغیرہ، خالی ہاتھ جائیں گے بھلا۔"

"وہ چلتی ہوئی ایک دم تھی۔ دین انہیں اتار کر جا چکی تھی۔ اور مین روڈ سے پہلی گلی ہی تو تھی جہاں گھر تھا اس کا۔ اس کے سینے کی دلفریب گلیاں۔ جہاں کھینٹے کودتے اس نے اپنا سارا بچپن گزار دیا تھا اور جہاں قدم رکھتے ہی ان گنت خوش گواریاں اس کا گھیراؤ کرتی چلی گئی تھیں اور بیکانے ہو جانے کے بعد سینے کی یہ فضا تھیں، یہ گلیاں اور ماحول کی اپنائیت، کس درجہ مانوسیت کا باعث لگتی ہے یہ بھی اس نے ابھی جانا۔"

"اوہ... سوری یار۔ مجھے ہی خیال کر لینا چاہیے تھا۔ تم رکو میں ابھی لاتا ہوں۔"

مستقیم اچھا خاصا شرمندہ نظر آیا تھا اس کی بات کے جواب میں۔ گلی کے کنارے پہلوں کے نیچے اور چند قدم آگے سویت شاپ بھی تھی جسے وہ ابھی دیکھ چکا تھا۔ جیبی تھپتھپاتا ہوا پلٹا تھا کہ دیکھو بے اختیار ٹوکا۔

"خلفہ...! بات سنیں۔ اب یہاں میں کیا کھڑی رہوں گی، یہ دیکھیں... یہ ہے گھر تارا۔ پھل وغیرہ لے کر یہی آ جائیے گا۔ ٹھیک ہے۔"

اس نے ہاتھ سے چند گز کے فاصلے پر براؤن دو منزل سفید چھتا پھری عمارت کی جانب اشارہ کیا جس کے تازہ رنگ و روغن کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا تھا اس کی قدامت چھپانے کو یہ کوشش اچھا بھرم ہے۔

"یار... اتم میرے ساتھ ہی چلو ناں۔ اکیلا آنا کچھ۔"

اس کے ہاتھ کے اشارے کے جواب میں سرانی گھر پر اس نے اک ٹکاہ ایسے ڈالی گویا سرالیوں کو ہی دیکھا ہو۔ عجیب ہچکچایا ہوا انداز تھا۔

"ساتھ...؟" دیا نے انہیں سے اسے دیکھا۔

"یہ وہ شاپس ہیں جہاں ہم اپنے بچپن سے لڑکپن تک کروڑوں چکر لگا چکے ہیں۔ اور وہ کتا چاہے ماے اب بھی مجھے پہچانے میں اک لمحہ نہیں لگائیں گے۔ مستقیم مجھے شرم آئے گی تاہم وہ ایسے بھی اب مجھ سے اک لمحہ بھی صبر نہیں ہو رہا جاری ہوں میں۔ آ جائیے گا اب خود ہی۔"

وہ بہت تیز تیز بولی تھی۔ مستقیم گہرا سانس بھر کے رو گیا۔ دیا اب براؤن دروازے کے آگے کھڑی کال بیل پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ چہرے کی تھابت مستقیم اتنی دوری کے فاصلے سے بھی محسوس کر سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

انہوں نے دودھ اہالا اور آٹا پیس کر کے اس پر جھالی رکھ دی۔ تب ہی بیرونی دروازے کی کھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے صاف ستھرے کچن کو مطمئن نظروں سے دیکھا اور باہر نکلتے اپنے پیچھے کچن کا دروازہ بند کر دیا۔ کچن کے اختتام پر براؤن بلی میز صحن کے پہلے زینے پر کھات لگائے بیٹھی تھی۔ دروازہ بند ہوتا ہی کچھ کر جیسے اس کی آنکھوں کی چمک مانند پڑ گئی۔

"افوہ... کون آ گیا اس وقت؟"

تسلسل سے کھنٹی بیل کی آواز پر وہ جھنجھلائی تھیں۔ ذیشان کی یہی عادت تھی۔ مگر ابھی تو اس کے کالج سے واپسی کا ٹائم نہیں ہوا تھا۔ لائبہ بھی دادی اور بابا کے ساتھ کچھ پہلے ہی شاپنگ کے ارادے سے نکلی تھی۔ انہیں اسی کا خیال آیا تھا۔ جیسی بھی تیز قدموں سے لپک کر بنا پوچھے چنٹی گرا کر دروازے کے دونوں پت اک ساتھ وا کرتے بولی تھیں۔

"چو گھر بھول گئی تھیں جو۔"

محالان کی بات ادھوری رہ گئی۔ لائبہ کی بجائے دیا کو اتنے عرصے بعد رو برو پا کے انہیں سکتے ہوئے دوتے رہ گیا تھا گویا، مگر اس کیفیت میں خوشی کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ شاک اور ناگواری غالب تھی۔

"انی...!! وہ جیسے کراہی تھی۔ سکی تھی اور اگلے لمحے ان کے ساکن وسامت وجود سے آچنی درج۔ تب اس کا لمس پا کر ہی جیسے ای گہری نیند سے بڑبڑا کر جاگ اٹھی تھیں۔ اگلے لمحے ان کے چہرے۔ ان کی آنکھوں میں رعونت و غمراہ آ یا۔

"تم...؟" انہوں نے ایک خفیف سے جھٹکے سمیت اسے خود سے الگ کیا اور ایک طرف سے گھٹا۔ دیا بکا بکا ہو کر رو گئی۔

"کیوں آئی ہو اب؟"

ان کا لہجہ کڑا تھا۔ شاید ملامتی بھی۔ دیا شاک نہ ہونے لگی۔

"انی... لم... میں۔"

وہ کبھی اور جیسے روی دی۔ ان کا یہ اجنبی بیگانہ انداز جیسے اسے دور درحاری تلواری بن کر کاٹ رہا تھا وہ اسے پہچان نہ پاتیں تو اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ وہ اسے جان لینے کے باوجود جھٹلا رہی تھیں تو کسب کا اندازہ کون کر پاتا۔ نہ سوال، نہ جواب، نہ وضاحت، نہ صفائی، نہ کشادگی، کچھ بھی تو نہیں۔ کوئی حق بھی نہیں اور صرف سزا اسے یقین نہ آتا تھا۔ وہ اپنی ماں کے رو برو کھڑی ہے۔

”چلی جاؤ یہاں سے۔ اس سے پہلے کہ کوئی دیکھ لے، جاؤ۔“

انہوں نے بیجان زدہ مگر دبی آواز میں کہتے اسے ہلکا سا دھکا دیا۔ مگر اس سے قبل وہ اس کا ہاتھ جانتے ہوئے چکی تھیں۔ اس کا بھرا ہوا جسم جو متوقع تبدیلی کا مظہر تھا۔ از خود اس پہ بیت چائے کی داستان کا گواہ بنا ہوا تھا۔ دیا گنگ ہونے لگی تھی۔ ان کی نظروں کی ٹھنڈی آنکھیں ان کے لہجے کی کاشت سے۔

”ماں بننے والی ہو تم؟ بچہ جائز ہے یا۔۔۔؟“

”امی۔۔۔۔“

وہ ایسے پھڑ پھڑائی اور بے ساختہ ہلکی جیسے جانور چھری تلے آخری بار کسمسائے۔ لہالہ پانچویں سے بھری آنکھیں لمبے کے ہزاروں حصے میں پھٹک گئیں۔ وہ خود پر ضبط کھو کر ہیمسک کے ہو چکی۔

”میری شادی ہوئی ہے امی اور۔۔۔۔“

”دیا میری بیوی ہے اور یہ ہمارا جائز بچہ ہے۔“

دیا کی بھرا ہوت زدہ آواز پہ مستقیم کی مضبوط بھاری آواز غالب آگئی تھی۔ یونہی بھرا ہوا اور کھول کر وہ جانے کب اندر آ گیا تھا۔ دیا حواسوں میں کہاں تھی جو جان پاتی۔ انہوں نے گلو بھرا ہوا اس اونچے پورے مضبوط جسم کے مالک بے حد شاندار نوجوان کو دیکھا تھا۔ پھر گہرا سانس بھرا ہوا بے حس مگر کشور لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

”دیکھو بڑے تمہاری جیسے بھی اس سے شادی ہوئی مجھے دلچسپی نہیں ہے جاننے میں۔ میں یہ جانتی ہوں کہ اس کی وجہ سے ہمارا پہلے ہی بہت نقصان ہو چکا۔ مزید کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں۔۔۔۔“ انہوں نے توقف کیا پھر بالخصوص دیا کو دیکھا جس کے آنسو گہرے صدمے کی شدت کے باعث بارش وار برستے تھے۔

”دیا! لاپہ کی شادی بڑی مشکلوں سے طے ہوئی ہے۔ ہمارے معیار سے بہت کم زور ہے۔ اور یہ بھی تمہاری وجہ سے، ہم تمہیں مردہ سمجھ کر تم پہ رو دھو کر صبر کر چکے۔ سمجھ لو ہماری زندگی میں تمہاری کہیں کوئی گنجائش باقی نہیں۔ میری مجبوری کو سمجھو۔ جیسے ہم تمہارے بغیر جینے کے عادی ہو گئے۔ ویسے ہی تم بھی ہم پہ صبر کر جاؤ۔ واپس چلی جاؤ۔ اس سے پہلے کہ کوئی تمہیں دیکھے۔ میں۔۔۔۔۔ ہم مزید نقصان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔“ انہوں نے دیا کی پھرانی ہوئی آنکھوں میں سے

ہوئے اپنے ایک ایک لفظ پہ زور دیا تھا۔ مستقیم کے ہاتھوں سے فروٹ اور منٹائی کے شاہ جہاں کی کسی بہت خصوصی اہمیت کی تو توقع تھی ہی نہیں اسے مگر اس قدر ذلت آمیز سلوک کا بھی

اپنی ماں کا بدلا ہوا رویہ دیکھا تھا۔ آج اک اور ماں کی نظروں کے بیگانے رنگ دیکھے تو یوں پراسنے دم بھر رسنے لگے تھے۔ کچھ کہے بغیر اس نے دیا کو شانوں سے قدام لیا۔

”آؤ دیا! چلتے ہیں۔“

اس کا لہجہ مدہم اور نونا ہوا تھا۔

”ہاں جاؤ اور اپنا چہرہ پھر ڈھانپ لو۔ میں نے کہا تھا۔ یہاں سب تمہیں بہت پہلے مار چکے۔“

انہوں نے گویا تابوت میں آخر کیل ٹھوکی تھی۔ مستقیم کے ہونٹوں پر زہر خند مسکان اتری اور ہر لمحہ ہر ہلکی چلی گئی۔ واپسی کا یہ سفر بہت کٹھن تھا۔ بہت تکلیف دہ۔ وہ سارے رستے روتی سسکتی رہی تھی۔ تڑپتی رہی تھی۔ کہنے کو بہت کچھ تھا مگر وہ دونوں خاموش تھے۔ یوں جیسے الفاظ کھو گئے ہوں اس انوکھے غیر متوقع دکھ کے سامنے۔

☆ ☆ ☆

پھر وہ دونوں نہیں بہتوں تک سنبھل نہ پائی تھی۔ طویل، غمگین، اور شرمسار۔ مستقیم سے نظریں بھی چار نہ کرتی اور مستقیم۔۔۔۔۔ وہ اسے سمجھاتے بہلاتے بھی تھکنے لگا تھا۔ مگر جھجھکتا نہیں تھا۔ دونوں نے جان لیا تھا۔ اس کائنات میں بس وہی اک دو بچے کے لیے زندگی جینے کا باعث ہیں۔ اس وقت بھی مستقیم تھوڑے سے روئی لایا تھا۔ ٹرے سجا کر اس کے سامنے رکھی پھر اس کی جانب دیکھ کر بالخصوص مسکرایا۔

”دیا! اب بس بھی کرو یا۔۔۔“

اور جواب میں دیا کی آنکھیں پھر سے جھلکاتی چلی گئی تھیں۔

”آپ ٹھیک کہتے تھے مستقیم! انوشاہ اور گھر سے بھاگنے والی لڑکی سے معاشرہ ہرگز امتیازی سلوک نہیں کرتا۔ مگر وہ تو میرے اپنے۔۔۔۔۔ میری ماں تھیں۔ وہ بے اختیار سسکتی گئی۔

”مگر یہ بھی تو سوچو وہ صرف تمہاری ماں نہیں تھیں دیا! ان کی باقی اولادوں پر بھی ان کا حق تھا۔“ مستقیم کا انداز نامحسانہ تھا۔ مگر وہ تڑپ اٹھی تھی۔

”جی تو میں کہہ رہی ہوں خلیفہ! وہ میری بھی تو ماں تھیں۔ صرف لاپہ کی تو نہیں۔“

وہ سک کر کہہ رہی تھی۔

”ان کی مجبوری کو سمجھو دیا! سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ تمہیں صبر آ جائے گا۔ انہوں نے تمہیں آباد دیکھا تھا۔ تم دنیا میں بے سہارا نہیں۔ وہ جان کر مطمئن ہو گئی تھیں۔ اب وہ دوسری بیٹی کی جانب سے

بھی ایسے اطمینان کی خواہاں تھیں تو مجب تو کچھ بھی نہیں تھا۔

اس کے پُر رسان انداز پہ دیا ساکن و جامہ بیٹھی رو گئی۔ صاف لگتا تھا وہ اسے بہلانے کی خاطر صورت حال کو اس قدر جامع بنا کر اس کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ سب کچھ ہو جانے کے باوجود گھپاؤ رکھ کر سوچنا بھی مثبت فعل کی جانب پیش رفت کا ذریعہ بنتا ہے۔ مستقیم اس ذریعہ کا خواہاں تھا۔ وہ دلی ہوئی تھی وہ اسے جوڑ رہا تھا۔ بالکل ویسے جیسے کبھی دیا نے اسے جوڑا تھا۔ اسے جوڑنا چاہا تھا۔ حالات کی تمام تر مایوسی اندھیرے کے باوجود۔

”میں کتنے دنوں سے سوچ رہا ہوں کام پہ جانے کا، مگر تمہاری جانب سے مطمئن نہیں ہوں۔ دیا! پلیز خود کو سنبھالو۔ تمہیں پتا ہے اب یہ ٹینشن ہمارے بچے پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔“

نوالہ اس کے منہ کی جانب بڑھاتے اس کا لہجہ اس کا انداز زندگی کی جانب بلاتا ہوا تھا۔ حوصلہ افزا اور خوش امید کی کا باعث۔ دیا بوجھل دل کے ساتھ جبرانی مسکرائی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“

مستقیم نے اس کا سر تھپکا تھا پھر اسے کھانے کی جانب متوجہ کیا۔ دیا بے دلی سے لقمے لینے لگی۔ مستقیم کے کتفی سے بھرتے ذہن میں کبھی کی پڑھی نظم کے اشعار ابھرنے لگے جو اس وقت کی کیفیات کی بالکل صحیح عکاس تھی۔

ہمارے قافلے کا ہر گھڑی منظر بدلتا ہے
کبھی رہزن بدلتا ہے کبھی رہبر بدلتا ہے
لباس فخریہ کی آرزو تو سب ہی کرتے ہیں
کہاں لمبوس کے اندر کوئی پیکر بدلتا ہے
تم اک انسان کے بدلے ہوئے تیور پہ حیراں ہو
یہ وہ موسم ہے پچھمی بھی اپنے پر بدلتا ہے

”آپ بھی انہیں نامستقیم!“

دیا کے ٹوکنے پہ وہ چونکنا ہوا جیسے خیالوں سے باہر آیا، اور سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ اس کے ساتھ نوالہ لیتے ہوئے وہ یہ سوچ کر منہ نہایت حیران کہ ان کشن حالات میں اللہ نے انہیں اک دلوں کے
وہ اس آسرا اور آس بنا دیا تھا۔ ورنہ زندگی کی فی بالآخر بہت جلد ہزپ کر لینے میں کامیاب نظر آتی۔

☆ ☆ ☆

دیا نے آخری سلائی لگا کر مشین روک دی۔ قینچی سے دھاگہ کاٹا اور جھٹک کر شرٹ کی تہہ اگانے کے بعد یہ جیس بھی باقی قمیضوں کے ساتھ شاپر میں ڈال کر گرہ لگا دی۔ پھر انھی اور ادھر ادھر بے ترتیب ہوئی ہوئی چیزیں اٹھا کر ان کے ٹھکانوں پر رکھنے لگی۔ وہاں تھا ہی کیا۔ دو چار پائیاں، چند گھسے ہوئے بزرگ اس کے اور مستقیم کے جوڑے اور کچھ دوسری انتہائی ضرورت کی چیزیں۔ جنہیں ہر بار اہرے سے پہلے وہ خرید لاتی تھی۔ یہ ترقی تھی اس کی۔ یہی کامیابی۔ مگر وہ پھر بھی خوش رہنا چاہتی تھی۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اسے امی کا لہجہ بھولتا تھا نہ آنکھوں کا تاثر کسی میں بھی تو اس کے لیے منجائش نہیں تھی۔

وہاں تھیں۔۔۔؟

وہ خود سے سوال کرتی تو آنکھیں نم ہونے لگتیں۔

ماں ایسی بھی ہوتی ہے؟

ماں ایسے کر لیتی ہے اولاد کے ساتھ؟

وہ ابھی ماں بھی نہیں تھی۔ اس مرحلے میں تھی مگر اسے اپنے بچے سے ایسی انسیت ایسی رتی محبت ایسا یاد محسوس ہوتا کہ اکثر اس کے لمس کو پانے کی شدید خواہش اسے گہری نیند سے جگا دیا کرتی۔ وہ آٹھنوں تصور میں اسے اپنی گود میں بٹکتے محسوس کرتی اور تھکتی نہ تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا لمس اس کا روتی کے گالے جیسا وجود کیسی گدگدی سی ہوتی تھی دیا کو سوچ کر بھی۔ جب جیسی بھی تو اتنے نوسلے سے وہ اس مرحلے کی ہر اذیت کو بڑی ہمت اور جرأت سے جھیل رہی تھی۔

اسے مستقیم کے دکھ کا اندازہ ہوا۔ وہ بھی ایسے ہی ٹھکرایا گیا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی ٹوٹنے کے مرتے سے گزرا تھا۔ اسے تو مستقیم نے سنبھال لیا تھا۔ تب مگر وہ اکیلا تھا۔ پتا نہیں ان کے راستے ایک ہوئے تھے تو نصیب کیوں ایک جیسے ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ہٹکنے لگیں۔ وہ بار بار خود سے مہم ہانڈے لیتی وہ کبھی اپنی اولاد میں امتیازی سلوک کرے گی نہ کبھی کیسے ہی حالات ہوں انہیں یوں ٹھکرا رہی اذیت سے دو چار کرے گی جس کا شکار اسے اور مستقیم کو ہونا پڑا۔

سورج کی کرنوں کی پیش بدر تہج کم ہوتی جا رہی تھی۔ دھوپ سنٹی دیواروں پر جا چڑھی۔ تب اس نے کمرے سے نکل کر رات کے کھانے کی تیاری کا آغاز کیا۔ یہاں اس گھر میں لائٹ تو تھی مگر وہ بجت پہ نرس پر ابھرت کم بجلی استعمال کرتی اور سر شام ہی کام ختم کر دیتی۔ وال صاف کر کے رکھی تھی۔ اس نے ہانڈی میں پانی ڈالا اور وال چھوٹے پر چڑھا دی۔

"ہاں بس کام میں دیر سویر ہو جایا کرتی ہے۔"

اسے سامنے سے ہٹا کر مستقیم دروازہ بند کرتا ہوا اندر آ گیا۔ دیا نے لپک کر پہلے چار پائی بچھائی تھی۔ مستقیم نے ہاتھ میں پکڑا شاہر چار پائی پر رکھ دیا۔ جس میں کھیرے اور گٹری تھی اور اپنی میض کے بن کھولنے لگا۔ وہ جانتا تھا دیا کو سلاہ پسند ہے کھانے کے ساتھ اور یہ سستا ترین شوق بھی آج کل بہت شایانہ خرچہ لگتا تھا۔

"میں کپڑے رکھتی ہوں آپ کے، پہلے نہ لیں۔"

دیا اٹھ کھڑا قدموں اندر بھاگی۔ مستقیم نہا کر باہر نکلا تو دیا کھانے کی ٹرے سجائے اس کی منتظر تھی۔

"سارے کھیرے کیوں کاٹ دیے، میں تمہارے لیے لایا تھا۔"

اس کی نگاہ نفاست سے سج سلاہ پر پڑی تو نو کے بغیر نہیں رہا۔ دیا نرمی سے مسکرائی۔

"اور مجھ سے آپ کے بغیر کچھ نہیں کھایا جاتا۔"

مستقیم نے پلیٹ اٹھائی مگر منہ سے بے اختیار سسکاری سی نکل گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" اسے پلیٹ چھوڑتے پا کر دیا نے پریشان کن نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ جس کے

اگلے چہرے پر خفیف سی سرخی کا رنگ اتر آیا تھا۔

"کچھ نہیں۔ پانی دینا مجھے۔"

مستقیم نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ دیا کی نگاہ اس کے ہاتھ پر ہی تھی۔ مستقیم کی کوشش ناکامی کا شکار

ہوئی تھی۔ جب بھی دیا اس کے ہاتھوں پر اترے ہوئے زخم اور آبلے دیکھ چکی تھی۔ جیسی ہاتھ پکڑ کر

سیدھے کرتے وہ چند ٹانگوں کو شدید صدمے کے باعث کچھ بول نہیں پائی۔ مستقیم کے ہاتھوں کے

آبلے پھٹنے کے بعد زخم مزید گہرے کر چکے تھے۔ شفاف زخموں کے ساتھ خون آلود بھی تھیں۔ دیا کی نم

آنکھیں اتنی تیزی سے چمکیں کہ بے قرار موتی ٹپ ٹپ اس کے ہاتھوں پر برے تھے۔ اگلے لمحے وہ

اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے انہی پر چہرہ انکائے سسکس پڑی تھی۔ مستقیم کے چہرے پر ناقابل بیان

گرب کا تاثر ابھرا آیا۔

"پلیز دیا اس طرح کرو گی تو میں بار جاؤں گا۔ میرا عزم مہر ہمت ہار جائے گی۔"

کچھ دیر ہونٹ بیچنے رکھنے کے بعد وہ بے حد بوجھل اور تھکن زدہ لہجہ میں بولا تھا۔ دیا نے ہچکیوں

کو روکتے اس کے ہاتھوں کو لبوں سے چھوا تھا۔ اور ہونٹ بے وادی سے کچلتے آنکھیں رگڑ کر پوچھنے

لگی۔ مگر صورت حال یہ تھی کہ وہ جتنا خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ضبط اتنا ہی بکھرتا جاتا تھا۔

اب اسے آگ جلانے میں بالکل کوئی دقت نہیں ہوا کرتی تھی۔ کچھ دیر چو لھے کے آگے بھی راکھ کریدتی رہی پھر اٹھ کر بیرونی دروازے کی جانب گئی۔ جس کی دیوار نسبتاً چھوٹی تھی۔ جیسے گھوڑا گاؤں کے گھروں کی ہوا کرتی ہیں۔

اس کی نظریں گاؤں کی طرف آنے والی جکی سڑک پہ جم گئیں۔ جہاں اس وقت عملاً بھیڑیوں اور

کسانوں کا قبضہ تھا۔ گاؤں کے باسی دن بھر اپنے جانوروں کو چرانے اور نہر پہ سنبھالنے کے بعد اب

واپس لوٹ رہے تھے۔ برگد اور پھیل کے درخت پہ چڑیوں اور کوؤں کے علاوہ دیگر طائروں نے شہر چ

رکھا تھا۔ فضا میں تندور اور چولہوں سے نکلنے والے دھوئیں کے ساتھ مختلف پکوانوں کی مہک رہتی ہوئی

تھی۔ مارچ کے مہینے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی حساب سے گندم کے کھیت میں بری شاخص ہالفت پر

اونچی ہو گئی تھیں۔ سورج اب اپنے اختتامی مرحلے میں تھا۔ دیا کو مستقیم کا انتظار تھا۔ جو آج پہلے دن کام

پہ گیا تھا۔ مزید کتنی دیر وہاں کھڑی وہ اس کی راوتریختی رہی تھی۔ مغرب کی اذان کی آواز سن کر دھوکے

ارادے سے اندر آ گئی۔ خود کو ہزار سنبھال لیا تھا۔ مگر اک اداسی اور بے چینی تھی کہ ہر لمحہ دل میں گم

کرتی جاتی تھی۔ یہ خیال کہ وہ اب کبھی بھی اپنوں سے نہیں مل پائے گی۔ جیسے کوئی کند چھری تھی۔ جو

اسے بھنبھورتی اور کاٹتی رہتی تھی۔ حالانکہ اس کی اس بات کو دیکھتے مستقیم نے اسے اس کی بات یاد دل

کرائی تھی۔

"تم تو سب کچھ کھو کر بھی میرے ساتھ پہ قانع و شاکر رہ سکتی تھیں اور۔۔۔"

مجھے سب کچھ یاد ہے خلیفہ! کچھ بھی نہیں بھولا۔ جیسی تو دکھ کی اس شدت میں بھی باحواس نظر آتی

ہوں آپ کو۔ ورنہ۔۔۔"

"بھول جاؤ دیا! یہی بہتر ہے۔"

خلیفہ نے دانت بھینچ لیے تھے اور وہ آنسو ضبط کرنے لگی تھی اور وہ آنسو جب ضرور بہتے جب اب

کے الفاظ دل میں شکاف ڈالتے اور مستقیم سامنے نہ ہوتا۔ اب بھی دُعا کو ہاتھ پھیلاتے ہی تم آنکھوں

کے رستے پہنے کو تیار تھا۔ ٹپ ٹپ اس کی گلابی شفاف و گداز ہتھیلیوں پر کتنے آنسو گرے تھے۔ جب کی

بیرونی دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ دیا نے آنسو پونچھے۔ جائے نماز تہہ کی اور حیرت سے

بیرونی دروازے کی جانب آ گئی۔

"بہت دیر کر دی آپ نے۔"

"وہ گرد مٹی اور پسینوں میں نہایا تھا ہوا پڑ مردہ اس کے سامنے تھا۔"

آنسو آپس، بے قراری، مستقیم سخت مضطرب ہوا۔

”یہی تو چاہتی تھیں تم دیا! پھر اب“

”میرا اتنا ضرر زق حلال تھا۔ خلیفہ میں“

”اور رزق حلال اتنا آسان نہیں ہوا کرتا۔ خاص طور پر ان حالات میں“

مغزور ڈاکو ہوں۔ مت بھولا کرو تم۔“

وہ ناچا جے ہوئے بھی تنگ ہوا۔ اس کے لہجے میں کڑواہٹ بھی تھی اور بد بھی تھی۔ دیا کے چہرے کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ انھی تھی۔ اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ واپس لوٹی تو ہاتھ میں سرسوں کے تیل کی شیشی تھی۔ تیل میں تھوڑا سا پانی ملا کر اس نے اس کے زخموں پر نرمی سے لگایا تھا۔ کپڑے کی پٹی باندھتے وہ منہ ہی منہ میں سورہ فاتحہ پڑھ کر دم بھی کرتی رہی تھی۔ جب یہ سمت تھالی ہوتی ہے اور بے یار و مددگاری بھی۔ تب خدا سے بڑھ کر کوئی حامی و ناصر اور بہرہ و نمکسار نہیں لگتا تھا۔ اس کا بھی سارا ادھیان، ساری توجہ عرصہ ہوا سمت کر اللہ پہ آگئی تھی۔ اور یہ سچ ہے بھی حالات جیسے بھی ہوں۔ اللہ سے بڑھ کر کوئی حامی و ناصر بہرہ و نمکسار نہ ہوتا ہے نہ ہوگا۔ مگر انسان جو ازل سے کاشما اور کم طرف ہے۔ یہ اہم راز مصیبت پڑنے پہ تکلیف میں مبتلا ہونے پہ جان پاتا ہے اور جان بھی وہی پاتا ہے۔ جسے اللہ کی جانب پلٹنا ہو اور انسانی تاریخ گواہ ہے ہر شخص کو کھانے والا ضروری نہیں سننے والا بھی ہو۔ یہ سنبھلنا ہی خوش بختی کی علامت ہے اور دیا اس خوش بختی پہ اللہ کی شکر گزار تھی۔

”میں خود کھالوں گا۔ ابھی معذور تو نہیں ہوا ہوں۔“

دیانے نوال اس کے منہ کی جانب بڑھایا تو مستقیم کے چہرے پر بد مزگی پھیل گئی تھی۔

روزگار کا پہلا کٹھن اور کڑا دن اس کا حوصلہ اور ہمت بہالے جانے میں کامیاب رہا تھا۔ دیا کا دل غم اور فکر سے بھرنے لگا۔ وہ جانتی تھی یہ تنگی حالات کی بخشی ہے۔ اس کا برا کیا مانتا۔

”نیکن میرا دل کر رہا ہے کہ اپنے ہاتھ سے کھلاؤں آپ کو۔“

وہ زیر دستی مسکراتی تھی اور یاس زدہ نظروں سے مستقیم کے غفلت چھٹکاتے چہرے کو دیکھا۔ وہ کچھ دیر یونہی اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر گہرا سانس بھر کے جیسے ہتھیار ڈال دیے اور اس کے ہاتھ سے کھانے کا رخصتا مند ہو گیا۔

دیکھو مجھے ڈر لگتا ہے غصے سے تمہارے

تم مجھ سے خفا ہو بھی تو اظہار نہ کرنا

وہ بولے سے دھیرے سے گنگنائی تو مستقیم نے بے طرح چونک کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔ کچھ جھنجھلاہٹ سے۔ کچھ غصے سے۔ پھر اسے خائف ہوتا پا کر بے اختیار ہنس دیا تھا۔ دیا کی جلی پٹنی جان جیسے غلامی پا گئی۔

”تھینک گاڈ! کچھ تو موڈ بحال ہوا۔“

وہ واقعی ریفلکس لگ رہی تھی۔ مستقیم کے ذہن و دل اور جسم کا پہچان آمیز تناؤ بھی دور ہونے لگا تھا۔ اس نے گہرا پرسکون سانس بھرا اور دیا کا ہاتھ پکڑا دیا اور دھیرے سے دبایا۔

”دیا! یہ سچ ہے۔ زندگی کے اس مقام پہ اگر تم میرے ساتھ ہو تیں تو میں خودکشی کر لیتا۔ مجھے اپنی زندگی نہیں جینی تھی۔ جس کا کوئی مقصد نہیں تھا۔“

اس کی رنگت میں کسی اضطراب کا احساس پھر سرخیاں بھر رہا تھا۔ دیا نے کچھ کہے بغیر چنگیر اٹھا کر سائینڈ پہ رکھی اور پھر خود اس کے پیروں میں اس طرح بیٹھی کہ سر اس کے گھٹنوں پہ رکھ دیا تھا۔

”اللہ پہ بھروسہ کریں مستقیم! اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوا کرتی ہے۔ میں نے یہ جانا ہے تو بہت پرسکون ہوں۔ آپ بھی محسوس کر کے دیکھیں۔“

اس کا لہجہ مدہم تھا۔ پرسکون اور آسودہ۔ اس کا اندازہ دل موہ لینے والا تھا۔ اس کی ادا بہت پائی تھی۔ وہ صرف خود خوب صورت نہیں تھی۔ دل بھی حسین رکھتی تھی۔ اسے محبت کرنا آتی تھی۔ جب بھی وہ مضطرب ہوتا۔ بے قرار ہوتا دیا کی محبت نرم پھوار کی صورت اس پر اپنی عنایت برسانے لگتی۔ حالات کی کسنائی۔ تمام تر تنگی جیسے بھاپ بن کر اڑنے لگتی۔ اگر وہ سمجھتا اگر وہ جانتا تو یہ بھی اللہ کی نعمت تھی اس پر اس کی محبت کا اظہار جو وہ دیا کی صورت اس پہ نازل فرما رہا تھا۔ اگلے دن دیا نے کام پہ جانے سے منع کیا تھا مگر مستقیم نے انکار کر دیا۔

”بڑی مشغلوں سے کام ملا ہے مجھے دیا! ان کے پاس مزدوروں کی کمی نہیں ہے۔ ایک دن کی ہفتی گویا کہ مستقل پیمانی ہوگی اور جب زندگی کا یہی ذہب ہے تو مجھے اس نازک مزاجی کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ بات ایسے بننے والی نہیں ہے۔ اس گھر کو۔ تمہیں بہت ساری توجہ اور بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت پیسے سے ہی پوری ہوگی۔“

اس کے پڑوسان لہجہ پہ دیا کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ گرمی کا موسم نہیں ہو رہا تھا اور دیا کے پاس موجود لباس جگہ جگہ سے گھس چکا تھا کثرت استعمال کے باعث تن بھرنے لگا تھا۔ دیا نے کو پیسہ بنیادی اور اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ اس

نفت زدوسی وضاحت پیش کرتی وہ مستقیم کو کھل کر ہنسنے پہ اکسا گئی تھی۔
 ”بہنہ دو دیا! اچھی لگ رہی ہو مجھے تو ایسے بھی۔“

وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ دیا نے ان سنی کی اور دوپٹہ کھول کر پھیلا لیا۔ پھر گیارہ کپڑا
 تلے میں دیکھ کر کھٹکال کر باہر نکالا۔ اس کے بازوؤں کی آستینیں کہیں تک مڑی ہوئی تھیں۔ جگہ گاتے
 ہوئے آہٹ مگر گداز بازو شفق رنگ کرنوں اور پانی کے قطروں سے جھلکا رہے تھے۔ مستقیم کی نگاہ اس
 پر پڑ گئی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ اس جاذب نظر لڑکی کے حسن کو کہیں لگ جائے۔ اس کی خاطر ہی تو
 سب تہہ کیا تھا اس نے وہ لحوہ کھلے گوارا کیسے کر لیتا۔ وہ آگے آیا اور ہاتھ بڑھا کر دیا کا بازو گرفت
 میں لے لیا۔ پانی کے ٹھنڈے قطرے اس کی ہتھیلی میں جذب ہو گئے۔ اس ٹھنڈک میں بھی اک لودیتا
 احساس تھا۔ آج تھی۔ جو جذبوں کی تھی۔ جو محبت کی تھی۔ جس کا اثر براہ راست دل پہ ہوتا تھا۔ دیا نے
 ہنک کر اسے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نیم باز آنکھوں میں عجیب سا سوز اور شکوہ بھرا ہوا تھا۔
 ”ف اپنے دل کی نہیں۔ اس سلطنت کی بھی ملکہ بنایا تھا تمہیں، کہ اس نے مشکل راستوں کا
 انتخاب کر لیا ہو دیا!“

دیا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دھلے ہوئے کپڑے اٹھا لے۔ اس کی گرفت سے نکلنے والے
 پردہ کو دیکھ کر نازک شفاف جلد پہ مردانہ انگلیوں کی گرفت کے دباؤ اور سختی سے سرخیاں سی پھیل گئی
 تھیں۔ بازو کا وہ حصہ سلگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ”اس جہان کی تن آسانی اس جہان میں بہت نقد ان کا
 باعث بنے۔ ان ہے مستقیم اعظم رکھتے ہوئے بھی عمل نہ کرنا بہت بڑی بد نصیبی ثابت ہوا کرتی ہے۔ یہ آزمائش
 گناہ سے چاہا تو جلد کٹ جائے گی۔ میں ہمت ہار کر اپنے رب کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔“
 اس نازک نظر آنے والی لڑکی کا حوصلہ مضبوط اور لہجہ مستحکم تھا۔ مستقیم اسے دیکھتا رہ گیا۔
 ”اور اگر تم تھک گئیں؟ اگر تم پیچھتا سکتی ہو۔۔۔۔۔؟“
 پتا نہیں وہ اسے آزمایا تھا یا خود کو۔ دیا ضرور تڑپ گئی تھی۔ لرز گئی تھی۔
 ”اللہ نہ کرے۔ اللہ نہ کرے خلیفہ!“

اور وہ نہ جسے اچکا کر رہ گیا تھا۔ دیا کو خوف آنے لگتا۔ اسے اپنے سے زیادہ مستقیم کی فکر ہونے
 لگی تھی۔ وہ ایسی طرز زندگی کا عادی نہیں تھا۔ وہ تھک بھی سکتا تھا پیچھتا بھی۔ یہی وہ نہیں چاہتی
 تھی کہ وہ سبک نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ جیسی اس کی ذواؤں میں شدت آتی جاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

کے جانے کے بعد وہ خود بھی سلائی کا کام پٹانے لگی۔ اللہ جانے مہنگائی بہت زیادہ تھی یا ان کی
 ضروریات کہ دانتوں سے پکڑ کر خرچ کرنے کے باوجود بھی اخراجات پورے نہیں ہو پاتے تھے اور
 ضروریات منہ پھاڑے نکلنے کو تیار نظر آتیں۔ مکان کا کرایہ، بجلی کا بل اور گھر کی ہر چیز کا سٹے سرے
 سے بننا۔۔۔۔۔ زندگی واقعی آزمائش تھی۔ جو اس کی خوب صورتی، دلکشی نزاکت و جاذبیت کو بے دہنی
 سے نگل رہی تھی۔ وہ کیا سے کیا ہوتی جا رہی تھی اور شاید اسے اس بات کا احساس بھی باقی نہیں رہا
 تھا۔ اس بات کی فکر کرنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ کچھ دن قبل جب شام کے ڈھلتے سایوں کے مہرہ
 وہ اپنے اور مستقیم کے اکلوتے جوڑے اکٹھے کر کے دھونے کے ارادے کے معن میں لگے نکلے کے پاس
 آ کر بیٹھی تب بھی اسے اس تبدیلی کا احساس نہیں تھا۔ شاید ماحول یا پھر حالات تغیر نے از خود اس کے
 اندر پیدا کر دی تھی۔ مگر کمرے سے نکل کر آتے مستقیم نے ضرور محسوس کیا تھا اور اسے دیکھتا بے اختیار
 ماتم سام گیا تھا۔ نکلے کے نیچے پکے فرش پہ پلاسٹک شیٹ بچھائے دیہاتی عورتوں کے انداز میں دوپٹے
 کو سر پہ منڈھ کر دونوں سروں پر پیچھے کی جانب گرہ لگائے، آستین چڑھائے چھپ کپڑوں پر ہاتھ مار
 رہی تھی۔ سورج کی تاریکی گلابی کرنیں اس کے زردی مائل ابلے چہرے پر لالیاں بکھیرنے کی اچھا سی
 کوشش میں مصروف تھیں۔

اس نے جو لباس پہن رکھا تھا۔ وہ کثرت استعمال کے باعث کھس چکا تھا۔ جسے جسم کی بدلی
 ساخت کے باعث اس نے سائیزوں کی سلائیاں کھول کر دوبارہ لگائی تھیں۔ جب بھی وہ کچھ اور بھی
 عجیب اور برا لگتا تھا۔ مستقیم کا دل جانے کس کس احساس کے تحت بھاری اور بوجھل ہوتا چلا گیا۔ یہ
 لڑکی تھی، جس نے اس پر اس کے دل پہ حکومت کی تھی۔ جس کے سامنے وہ اتنا بے بس ہوا تھا کہ خود
 ہر قسم کا اختیار کھو دیا تھا۔ اتنی اہم اتنی ہی خاص تھی وہ اس کے لیے۔ جب بھی تو اس کی خواہش تھی
 اس من موہنی لڑکی کے قدموں میں ساری دنیا کی نعمتیں ڈھیر کر دے مگر۔

”کیا دیکھ رہے ہیں آپ ایسے؟“

دیا اس کی نظروں کی تپش محسوس کر کے ہی متوجہ ہوتی تھی۔ اس کی محویت کے عالم پہ قدرت
 مسکرائی تھی۔ مستقیم چونک سا گیا اور گہرا سانس بھر کے خود کو سنبھال لیا۔

”یہی کہ تم چند دنوں میں ہی کچی دیہاتن نکلنے لگی ہو۔“

دیا اس کی بات سے زیادہ اس کی نظروں پہ جھپٹی تھی اور حیلے ہاتھ اٹھا کر کپڑا سر سے کھینچ لیا۔
 ”داہی ایسے کپڑے دھویا کرتی تھیں۔ دوپٹے تک نہیں کرتا پھر۔“

مٹے ہیں بعد مدت کے بلا کے سرو ہیں لہجے
کہ جہنا بھی نہیں ممکن، پھلنا بھی نہیں ممکن
امیدیں ٹوٹ جانے سے تعلق ٹوٹ جاتے ہیں
دلوں میں حسرتیں لے کر بہنا بھی نہیں ممکن
بہت ناکامیاں لے کر ہوئے ہیں خاک کے قیدی
چلو اب آج سے گھر سے نکلتا بھی نہیں ممکن
اسے اتنا نہ سوچا کر، تیری عادت نہ بن جائے
پھر ایسی عادتیں محسن! بدلنا بھی نہیں ممکن

وہ بچکیوں سے روتی تھیں۔ جانے کیسا روگ لگا تھا جو بڑھتا جاتا تھا۔ بابا حیران دادی پریشان
ہوئی جاتیں۔ لائپ کی عزت و آبرو سے ہو جانے والی شادی تو ایسی تسلی بخش احساس تھا جو تمام گھروں
سے آزادی بخش گیا تھا۔ کچھ دن قبل ہی دونوں مستقل انگلینڈ رہائش پذیر ہونے کو رخصت ہوئے
تھے۔ پھر یہ رونا عجیب تھا۔ یہی تو سب چاہتے تھے۔ لائپ پہ دیا کے حوالے کا معمولی سا یہ بھی نہ
پڑے۔ اب جب کہ اللہ نے خواہش پوری کر دی اور اس کے چانس تک ختم ہو گئے تو یہ خطرناک کچھ
سے باہر تھا۔ دیا کو بھلائے اور اس زخم کو سب سے تو ایک خاموش سمجھوتہ ہو ہی چکا تھا۔

”کیوں ایسے خود کو ہانک کرتی ہو بیٹی! بچی اپنے گھر کی ہوئی ہے۔ عزت سے رخصت ہو کر
اپنے گھر خوش بھی رہے گی انشاء اللہ! بس دعا کرو اور حوصلہ جمع رکھو۔“

دادی نے بہو کا شانہ چھپتا کر اپنے مخصوص وحشیہ انداز میں تسلی سے نوازا تو ان کے منہ سے جھپٹا
کراہیں نکلتی چلی گئیں۔

”اس کی جانب سے تو بے فکری ہی ہے۔ فکر تو اس بد نصیب کی ہے۔ جو جانے کیسے زندگی کے
دن پورے کرتی ہوگی۔ میرے جگر کا ٹکڑا تھی وہ اماں! سب سے پہلی اولاد۔ بھولنا اتنا آسان تو نہ
ہے۔“

وہ زار و قطار رونے لگیں۔ دادی کے اعصاب پر صدمے کی تیز ضرب لگی تھی۔ یہ دیکھ کر ایسا تھا جس
پر قرار نہیں آتا تھا۔ مرے ہوؤں پہ صبر آ جانا قدرتی قفل ہے۔ چھڑے؟ بس کو انسان عمر بھر کا تاج ہے
لیکن انہیں تو خود اپنا آپ مجرم لگتا تھا۔ اللہ جانے اتنی خود غرض اور۔ فاک۔ دیں ہو گئی تھیں وہ ان کے
کہ صرف لائپ کی ماں رو گئیں اور اس کی کچھ بھی نہیں۔ اس کی آنکھوں کی آس کو مارتے دیکھا تھا۔

چہرے پہ اترتی مایوسی اور غیر یقینی یاد کرتیں تو جیسے خود کو کسی برزخ میں محسوس کرنے لگتیں۔ کتنا
ہی تھا وہ وقت۔۔۔ اسی قدر کڑا بھی۔ وہ اتنی ہی بدحواس ہو گئی تھیں کہ ڈھنگ سے بات کرنا بھی
نہیں تھیں۔ خود اپنے ہاتھوں اسے چہرے کے لگا دیے۔ کوئی اتنا نہ پتا۔ اب اگر ڈھونڈنا بھی چاہیں تو
نہیں پتا۔

کیسا نقصان ہو گیا تھا کیسا گناہ۔۔۔ جس پہ شاید ہی معافی ملتی وہ تو خود کو معاف کرنے پر
نہیں تھیں۔

”اے تو اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ وہی محافظ و نگران ہے اس کا۔ ساری دعائیں اسی کے نام تو
کر رہی۔ اللہ نے چاہا تو اک دن دیکھ بھی لیں گے۔“

دادی آنسو پونچھ رہی تھیں۔ وہ مزید کمزور مزید بوڑھی ہو گئی تھیں۔ امی اس پل ان سے نکالیں
یہ کر سکیں۔ یہ ایسا گناہ تھا۔ ایسی لغزش تھی جس پہ زبان کھولنے کی ان کی ہمت نہیں تھی۔ اللہ راز داں
تھی۔ کار بھی، اب دادی کی طرح انہیں بھی اسی سے غم کہنا تھا۔ معافی طلب کرنی تھی اور ازالے
موقع فراہم کرنے کی التجا بھی، کہ ساری غلطی جاننے کے باوجود معاف کرنے درگزر کرنے کی شان
اللہ ہی رکھتا ہے۔

☆ ☆ ☆

سورن کی کرنوں کی تپش آہستہ آہستہ کم پڑتی جا رہی تھی۔ اس کے اٹھتے ہوئے قدم بوجھل تھے
تھیں وجود کے ساتھ ساتھ جیسے ہڈیوں کے گودے میں بھی سرایت کرتی جا رہی تھی۔ اس کی زخم
تھیلی میں اس کی دن بھر کی اجرت کے طور پر دو سو روپیہ دبا ہوا تھا۔ جان تو زحمت کے بعد اتنا
کھانا کھا۔ یہاں گاؤں میں تو اجرت اور بھی کم ملتی تھی۔ اس جیسے نئے اور کام سے تازہ آدمی کو
کمی فصل سناکی کا کام ختم ہوا تو ایک بار پھر بے روزگاری نصیب بن گئی، وہ اس علاقے میں
نہیں کھینچ کر نکالتے پیش نہ کر سکنے کے باعث اسے کوئی باعزت پیشہ نہیں مل سکا تھا۔ مثال کے طور پر
کھانہ میں سبز مین جیسی نوکری بھی۔

آٹ کل نہروں کی بھل صفائی ہو رہی تھی۔ فوجی جوان اس کام میں لگے ہوئے تھے۔ گاؤں کے
لوہان بھی اس قومی خدمت میں حصہ ڈال رہے تھے۔ ٹریکٹر ڈرائیواں اور دوسری مشینیں نہروں سے
کھانہ کرنا روں پہ ڈال رہی تھیں۔ افسران ان کی نگرانی میں مصروف تھے۔ مستقیم نے یہ منظر دور
دیکھا تھا اور تو قیصر عمارت کو بھگنے لگا۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ خود کو یہاں کھپا دیتا۔ اس

نے گہرا سانس بھرا تھا اور فحیکہ ار سے بات کرنے کو آگے بڑھ گیا۔ سارا دن اس نے خود کو گرفتار رکھا۔ شام ڈھلے وہ تھکن سے لبریز تھا تو ملنے والی اجرت نے اس تھکن میں اضافہ کر ڈالا تھا۔ وہ سہولت، آرام اور سکھ دینے کی کوشش میں ناکام ہوا جاتا تھا تو ناامیدی اس کے اندر گھر کر کے نکلتی تھی۔

”السلام علیکم!“

اس کی دستک کے جواب میں دیا نے دروازہ کھول کر پر جوش انداز میں سلامتی بھیجی۔ مستقیم نے نگاہ بھر کے اسے دیکھا۔ پتا نہیں وہ کیسے اتنی تگن اور مطمئن رہ لیتی تھی۔ اک لمحے کو مستقیم کو اس کے اطمینان پر رشک آیا۔ مگر اک لمحے کو پھر وہ اس بے دلی سے اسے سامنے سے ہٹا کر اندر چلا آیا تھا۔

”سلام کا جواب تو دیا کرتے ہیں مسٹر خلیفہ مستقیم!“

وہ اس کے بازو کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر ہلکا سا جھنجھوڑتے ہوئے ناز بھرے انداز میں گویا ہوئی تھی۔ مستقیم نے پھر اسے دیکھا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اس کی شعاعوں کی ٹھنڈی پرسکون لالی اس کے چہرے پر بکھر کر انوکھی سی روشنی اور دمک پیدا کر رہی تھی۔ وہ بکھنے سے قاصر رہا۔ یہ روشنی اور دمک امید کی تھی۔ جو صلے و عزم کی یا پھر اس کی خوب صورتی و خوب سیرتی کا اجالا اسے منور کر رہا تھا۔

”علیکم السلام!“

وہ اسے دیکھے گیا۔ البتہ سنجیدگی و رنجیدگی میں ہرگز فرق نہیں آیا تھا۔

”بہنیں۔ پانی لاتی ہوں آپ کے لیے، پھر نہا لیجیے گا۔“

وہ اسے چار پانی کی جانب سے ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے نرمی سے کہتی جیسے ہی چلی۔ مستقیم نے اس کی بانہ پکڑ کر روک لیا۔

”رہنے دو دیا!“

وہ آنکھیں بند کرتا وہیں نیم دراز ہو گیا۔ انداز کی پڑمردگی اور بے زاری صاف عیاں تھی۔

”بہت تھک گئے ہیں۔“

دیا اس کی پانچ کی جانب آئی اور نرمی سے اس کے چہرے پر دبانے شروع کیے۔

ہاں تھک تو بہت گیا ہوں۔ ہر لحاظ سے

وہ متاسف بھی تھا۔ طول بھی دیا کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ آنکھیں نم ہو گئی۔ وہ معمول سے زیادہ زودور بخ نظر آتا تھا۔

”کوئی بات ہوئی ہے مستقیم!“

دیا فکر مند تھی۔ اس کی اداسی جیسے دیا کے دل میں بچے گاڑنے لگی۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔ مستقیم دانستہ نظر انداز کیے اسی طرح پڑا رہا۔ دیا نے کچھ دیر منتظر جواب طلب نظروں سے اسے دیکھا تھا پھر بے تاب ہوتے اس کے چہروں پہ دباؤ ڈالا۔ گویا توجہ حاصل کرنی چاہی۔

”مستقیم.....!!“

”تمہارے مطلب کی نہیں ہے۔“

وہ جیسے طوعا و کرہا بولا تھا۔ دیا کچھ مزید ابھئی۔

”آپ کے مطلب کی ہے؟“

سوال ہوا تھا۔ مستقیم چند ثانیوں کو ساکن رہ گیا۔ پھر گہرا سانس بھر کے محض نہکا را بھرا۔

”تو بس پھر ٹھیک ہے۔ اگر آپ کے مقصد کی ہے تو میرا انٹرسٹ خود بخود ہو گیا۔ بتائیے..... وہ مگر اتنی تھی اور اس کے پہلو میں سرک آئی۔ ہاتھ بڑھایا اور اس کا بازو آنکھوں سے ہٹا دیا۔ مستقیم کو لگتا پڑا تھا۔

”کچھ معاملوں میں ہمارے انٹرسٹ بالکل میچ نہیں کرتے ہیں دیا! سو بہتر ہے رہنے دو۔“

وہ صاف اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔ دیا نے اب کے فحلی سے اسے دیکھا۔

”اس بات کا فیصلہ بعد میں ہوگا، بس آپ بتائیے مجھے۔“

اس کے لہجے میں جو مان اور دھونس تھی۔ وہ مستقیم کی محبت کی ہی بخشی ہوئی تھیں اور کبھی وہ وقت بھی تو بے مستقیم تر سا کرتا تھا اس کی جانب سے ایسے مان و اصرار کو جو اس وقت اسے کچھ اتنا خاص لگتا تھا۔

”تم بہت ضدی ہو۔“

”بھئی بھی ہوں۔ آپ جناب کی ہی ہوں اب تو میں۔“

وہ جواباً چٹکی اور مستقیم کے چہرے پہ بڑبستی و بے ساختگی کے ساتھ اپنائیت کے اس مظاہرے سے کوفت و بے زاری کو دور کر کے مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

”ہاں یہ تو ہے۔ بجا فرمایا۔ خوب فرمایا۔ مگر بہت فاصلے سے فرمایا یہاں تشریف لائیے

”نیکم صلیب!“

اس کا موڈ لمحوں میں تبدیل ہوا تھا۔ آنکھوں میں شوخی بھرتی چلی گئی دیا اتنی ہی جھینپی اور خفت سے

سرخ پڑ گئی۔ بجائے قریب آنے کے وہ مزید دور ہوئی۔

”آپ کچھ کہہ رہے تھے غالباً۔“

وہ جیسے کترائی۔

”ہاں یہی کہ ذرا قریب آؤ۔“

مستقیم مسکراہٹ دوبارہ ہاتھ دیا کی نفٹ بڑھی مگر اسے گھورا ضرور۔

”اصل بات سے نہ بھریں۔“

اور مستقیم ہنستا چلا گیا تھا۔

”ہمارے ٹریک پہ آتے ہی رومانس کی پڑی سے اگلے قدموں بھاگتی ہو تم۔“

وہ جیسے چھیڑ رہا تھا۔ دیا اسی لحاظ سے سرخ پڑ گئی۔ ”آج میں نے دال چاول پکائے ہیں۔“

باتوں میں غصہ کر دیا کھانا آپ نے۔ نہالیں تو میں کھانا نکال لاؤں۔“

وہ اٹھتے ہوئے بولی تھی۔ مستقیم گہرا سانس بھرتا خود بھی کھڑا ہو گیا اور جب نہا کر وہ اس کے

ساتھ کھانا کھانے بیٹھا تو اس کے کہنے خود ہی اس موضوع کو چھیڑ لیا تھا۔

”آج جس گھر میں مزدوری کی میں نے..... پتا ہے کس کا تھا وہ.....؟“

نوالہ منہ میں لے جاتا دیا کا ہاتھ اسی زاویے پر لٹھ بھر کر ساکن ہوا اور سوالیہ نظریں اسی کے

چہرے پر آن ٹھہریں۔

”امانت اور شائلہ کا۔ وہ دونوں عنقریب شادی کر رہے ہیں۔“

مستقیم کے جواب نے دیا کا سارا سکون غارت کر کے رکھ دیا۔ چہرے پر اضطراب اور گھبراہٹ

بتدریج گہری ہوتی چلی گئی۔

”کیا غماں ہیں امانت کے۔ میں تو اسے دیکھتا رہ گیا۔ جبکہ وہ اسی قدر متاسف تھا مجھ پر۔“

مستقیم کا لہجہ بجا ہوا تھا۔ دیا کے حلق میں کچھ اٹکنے لگا۔ اس نے بولنا چاہا مگر کامیابی نہیں ہو سکی۔

خلیفہ تو جیسے کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا۔

”مفرور وہ بھی ہے، مگر ہماری طرح ڈل نہیں رہا۔ اس نے جو مال وہاں سے اٹھایا تھا اس پر

میش کر رہا ہے۔ جبکہ تم نے کچھ بھی استعمال نہیں کرنے دیا مجھے..... دیا.....! زندگی ایک بار ہی ملتی

ہے۔ کیوں اپنے ساتھ میری بھی برباد کرنے پر تکی ہو۔“

وہ اسی ٹرانس میں بول رہا تھا۔ دیا کا پھیکا چہرہ اس لمحے بالکل زرد پڑ گیا۔

اس نے غمناک نظروں میں سہم بھر کے مستقیم کو دیکھا تھا۔

”آگئے نا آپ اس کی شیطانی باتوں میں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے دوبارہ اس سے ملنے کی۔“

وہ دبے ہوئے لہجے میں چپٹی تھی اور غصے میں پلیٹ دور سرکائی۔ مستقیم نے چونک کر اس کا لال

ہوکا چہرہ دیکھا اور حیران رہ گیا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“

”یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟“

وہ بے اختیار سسکی۔

”تو اور کس سے پوچھوں؟ بلاوجہ تم چیخ رہی ہو کوئی اور نہیں۔“

مستقیم بھی سخت بد مزاج ہوا تھا۔ جیسی بھی ناگوار ریت سمٹ آئی تھی اس کے لہجے میں۔ دیا ایک

لمحے کو سد سے سے ٹنگ رہ گئی۔ یہ ضبط کا چھٹکنا، بات بے بات تلخی لہجوں میں سمٹ آنا، حالات کی سختی

کی دین تھی اور اسے یاد رکھنا چاہیے تھا۔ یہاں اس مرحلے اس مقام پہ ساری ہمتیں ساری توانائیاں

اسے ہی صرف کرنی تھیں۔ ساری ذمہ داریاں اسے نبھانا تھیں۔ خلیفہ کو سنبھالنا، اسے قابو میں رکھنا اور

ہائی راہوں کی کشش سے بچانا آسان نہیں تھا۔ اس کی دعاؤں کے ساتھ اس کے حوصلوں اور بے حد

اسے عرف کی ضرورت تھی یہاں۔ اسے خود کو کمپوز کرنا پڑا۔ جیسی گہرے سانس بھرنے لگی۔

”اک بات کہوں آپ سے خلیفہ!“

وہ بے اختیار چٹکی ہو گئی۔ مستقیم نے بچنے ہوئوں کے ساتھ اس بے بس لڑکی کو دیکھا۔ جس کی

جنت اور بے چارگی قدم قدم پہ رکاوٹیں کھڑی کر دیتی تھی اس کی راہ میں۔

اور وہ اس جیسا خود پسند، من موہی اور اکھڑا انسان اس معمولی، عام نازک سی لڑکی کی مرضی کے

خلاف جانے کا حوصلہ کر ہی نہ پاتا تھا۔

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

وہ تھکے ہوئے انداز میں مسکرایا۔ یوں جیسے بنا کہے اس کا مطالبہ جانتا ہو۔ اتنا ہی تو سمجھنے لگا تھا وہ

عقاب۔

”آپ امانت سے نہیں ملیں گے۔ بلکہ اس کے سائے سے بھی بچیں گے۔ وعدہ کریں۔“

وہ اس پر ہراساں تھی۔ مگر پیاری لگتی تھی۔ ہر نی کی جیسی معصوم معصوم سی۔

”میں اب بھی نہیں ملا تھا۔ وہی مجھے پہچان کر میرے پاس آیا تھا۔ اب کیا بات کا جواب بھی نہ

گیا۔ کچھ کہے بغیر اس نے اپنا ہاتھ اس کے بازو سے گزار کر خود کو اس کے نزدیک کیا اور سر اس کے کاندھے سے ٹکا دیا تھا۔ ڈھارس کا یہ بھی ایک بہت پاورفل انداز تھا۔ دونوں بنا کہے اک دوسرے کے دکھ کو محسوس کرتے اور رنجیدہ ہوتے رہے تھے اور محبت ان کے درمیان ڈھارس بنی اپنا احساس بخشی رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”یہ کچھ پیسے ہیں رکھ لو۔ اور کسی جاننے والی سے کہہ کر بازار سے اپنے لیے چند جوڑے منگواؤ۔ پہلی فرصت میں۔“

مستقیم نے پس انداز کی ہوئی رقم جو چند سو پچاس تھی اس کے ہاتھ پہ رکھی۔ دیا سوچ میں پڑ گئی۔ دیگر کئی ضروریات بھی منہ کھولے کھڑی تھیں۔ مگر کپڑے ہٹائے بغیر بھی گزارا ممکن نہ تھا کہ لباس اب جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔

”کھانے میں کیا ہے؟“

قمیض کے بٹن کھولتا ہوا وہ چار پائی پر جا کر بیٹھ گیا۔

”کیری کی چٹنی بنا کی ہے۔ ساتھ میں کیری کا ہی مربہ۔ لے آؤں کھانا؟“

وہ اپنے کسی خیال سے چونک کر اسے ٹکٹے لگی تھی۔ انداز سوالیہ تھا۔ مستقیم نے کف کا بٹن کھول کر آستین کہنی تک فولد کر لی اور کالر پیچھے کی جانب لڑھکایا۔ اس کا لباس بد رنگ تھا۔ کئی جگہ سے گھسا ہوا۔ وہ واقعی کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ امانت صبح ترس کھاتا تھا اس پر۔ آج پھر وہ اسے سمجھاتا اور اس کا ہاتھ لگا تھا۔ اس کی خاموشی کے جواب میں کتنا جھنجھلائے لگا تھا۔

”تمہیں خود پر رحم کیوں نہیں آتا خلیفہ؟ اور اتنی تلاوی مت کرو بیوی کی۔“

”تم جاؤ یہاں سے امانت!“

وہ ٹوک کر سرد انداز میں بولا تھا۔ امانت نے ہونٹ بھینچ لیے۔

”اتنا ڈرتے ہو بھابھی سے۔؟ یا روو دیکھ نہیں رہی ہیں تمہیں۔“

وہ جسنے لگا تھا اور مستقیم اسے گھورنے

”یہ ڈر نہیں محبت ہے، لحاظ ہے، احساس ہے۔“

وہ سنا اور امانت کی ہنسی گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

”تو بالکل ہی سہیا گیا ہے خلیفہ! سچ کہا سناؤں نے، محبت شاہوں کو ملنگ بنا سکتی ہے۔“

دیکھ کر یقین آ سکتا ہے۔“

اور خلیفہ مستقیم نے ایسا تاثر دیا کہ بولتے رہو۔

”اگر تم کہو تو عزت ماب بھابھی سے میں سفارش کر دوں؟“

”وہ سر پھاڑ دے گی۔ تمہارے ساتھ میرا بھی، کہ میں نے کیوں آنے دیا تمہیں۔“

اور فرمانبرداری والا ڈکا یہ مظاہرہ امانت کو سخت گراں گزارا تھا۔ جیسی مانتھے پہلے پڑ گئے۔

”عورت کو سر پہ سوار نہیں کیا کرتے ہیں مستقیم! کاسے جوگا نہیں رہتا انسان۔“

اس کے لہجے کی ناگواری مستقیم کو بری لگی تھی۔

”میں انسانوں کو ان کی حیثیت و مرتبے کے مطابق مقام دینے کا عادی ہوں۔ دیا اس قابل ہے کہ اسے اتنی اہمیت دی جائے۔“

اس نے سرد مہری دبانے کی کوشش نہیں کی تھی اور امانت سرد آؤ بھر کے رو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی! لیکن تھوڑی سی منجائش نکالو ہمارے لیے بھی۔“

اس کا انداز متلبی نہ تھا۔ مستقیم نے الجھ کر نا فہم نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہماری شادی ہے۔ تم بھابھی کے ساتھ شامل ہو گے تو میری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔“

مستقیم اتنا تو کر سکتے ہوتا تم؟ یہاں اس انجان ہستی میں اتنے غیروں کے بیچ صرف ہم

شہساز ہیں۔ اک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھ۔“

اس کا انداز قائل کرتا ہوا تھا اور مستقیم نے اسے نالے کو محض کاندھے اچکا دیئے تھے۔ ورنہ

حقیقت یہ تھی کہ اب وہ اپنا اور امانت کا کوئی جوڑ میل نہیں پاتا تھا۔ اس کا ہر بار کا امانت کا سامنا اسے

کتنی کے احساس سے لہریز کر جایا کرتا تھا مگر امانت نہیں سمجھ سکتا تھا شاید۔ جب بھی تو اصرار کرتا جاتا

تھا۔

”کیا سوچ رہے مستقیم! کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہیں؟“

ایا کی آواز پہ وہ چونکا تھا اور گہرا سانس بھرتے سر جھٹکا۔

”تم بھی کھاؤ نا۔ آ جاؤ۔“

”سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ دیا پانی کا جگہ لیے قریب آ گئی۔“

”پریشان لگتے ہیں۔ خیریت۔۔۔۔۔؟“

”پریشان تو تم بھی لگتی ہو۔ تم بتاؤ خیریت ہے کہ نہیں؟“

وہ اپنی پریشانی یا اضطراب جھٹک کر پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا۔ دیا کے بجھے ہوئے چہرے پر موجود اضطراب گہرا ہو کر رہ گیا۔

”ہنا نہیں یہ آزمائش ہے یا اللہ ہم سے ناراض ہے۔ مجھے رونا آنے لگا ہے مستقیم!“

اس کی آواز بجلی ہوئی اور بھراہٹ زدہ تھی۔ مستقیم فطری طور پر مضطرب اور بے چین ہوا تھا۔ کچھ کہے بغیر اس کی جانب سر کا اور اس کا سر اپنے کانہ سے لگا کر تھپکا۔

”کیا ہوا ہے؟ بتاؤ مجھے۔“

”وہ ہچکیاں بھرتی خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔“

”سلائی سینئر بند ہو گیا ہے مستقیم! یعنی مزید پیسے کی کمی، ہم اب کیا کریں گے۔“

وہ باقاعدہ رونے لگی۔ مستقیم کے کشیدہ اعصاب یکدم ڈھیلے پڑنے لگے۔

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے دیا! اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو میں خود روک دیتا۔“

اب تمہیں سلائی سے۔ یہ کام مناسب نہیں ہے تمہارے لیے۔ ہمارے بچے کے لیے۔ میں کسی لیے محنت کر رہا ہوں۔ تمہاری خاطر ناں۔ چلو رونا بند کرو۔ میں سمجھا پتا نہیں کیا ہو گیا خدا نخواستہ، بہت بے وقوف ہو تم۔“

وہ اس کا سر زری سے تھپک رہا تھا۔ دیا کے دل پہ دھرا بے انت بوجھ تھوڑا سا سرکا۔

”ایسا کیسے چلے گا مستقیم! ہمارے اخراجات اور قبیلی بڑھنے والی ہے۔“

وہ آنسو پونچھتی بھی فکر مند تھی۔ مستقیم ہولے سے مسکرایا تھا۔

”خود ہی کہتی ہو اللہ مالک ہے۔ اب بھی اسی پہ بھروسہ کرو۔“

اور دیا ٹھٹھک گئی تھی۔ ساکن ہو کر اسے ٹکٹے لگی۔ دیر سے دیر سے اس کی آنکھوں میں مسرت کے جگنو اترنے لگے تھے۔ اب جیسے کچھ کہنے کچھ سننے کی گنجائش اور طلب نہیں تھی۔ یہ احساس محسوس کرنے کا تھا۔ خوش ہونے کا تھا۔ شکر بجالانے کا تھا۔ ایسے بندے کو رب یاد آیا تھا جسے بھولا ہوا تھا۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی بات طمانیت کا باعث ہو سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

دھرونی دیوار کے ساتھ سرو کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ٹکڑیٹ کی دیوار کے پار جاکر اور ٹیم کے بیڑوں کے جھنڈ تھے۔ سہ پہر کے وقت ادھر کوئی گہما گہمی نہ ہونے کے باعث درختوں کے جھنڈ پر ہو کا عالم طاری رہتا۔ فضا کے سکوت کو کبھی کبھی ابھرنے والی کونل کی آواز توڑ جاتی اور پھر

ای خاصوشی کا راج ہو جاتا۔ اس نے سراٹھا کر آسمان کے بور سے لدی ہری شاخوں کو دیکھا۔ جن کی مخصوص مہک ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ کیسی ست مگر دلچسپ زندگی تھی یہاں کی۔ مگر دلچسپی کا باعث نہیں کہ ان کی خوشیاں اور سکون جس سے وابستہ تھا۔ اسے خود کھویا تھا۔ زندگی کے اس مقام پہ آ کر دونوں خود کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ صرف اپنی نہیں۔ وہ اپنے بیٹے کی بربادی کے بھی خود ذمہ دار تھے۔ یہ مال۔ یہ بچتا داول کا روگ بن چکا تھا۔ دکھ کا کوئی شمار تھا نہ بچتا داول کا۔

انہیں دل کا دوسرا دورہ اس روز پڑا تھا جب انہیں معلوم ہوا تھا۔ ان کے لخت جگر کے سر کی قیمت دو کروڑ مقرر ہوئی۔ وہ مفلور تھا۔ زندہ یا مردہ حالت میں پولیس کے حوالے کرنے والے کو انعام کا تھنڈا ٹھہرایا جاتا۔ ایک قیامت تھی جو ان پر ٹوٹ پڑی تھی۔ ایک طوفان تھا جو آ کے ٹھہر گیا تھا۔ اضطراب سا اضطراب تھا۔ اذیت سی اذیت وہ دوتے جاتے تھے اور چپ ہونے کو دل نہ کرتا تھا۔ آنسو ختم ہو گئے۔ مگر غم نہیں ڈھل سکا۔ دُعاؤں میں لرزنا دل اور ہونٹ بھی ہمتیں کھونے لگے۔ استحان ختم ہو کر نہ دیتا تھا۔

ڈاکٹر نے ان کی صحت یابی کے لیے کھلی آب و ہوا کے علاقے میں رہنے کا مشورہ دیا جب کہ وہ مگر چھوڑ کر جانے پہ کسی طور پر آمادہ نہ تھیں۔

”نہیں عبدالحمید ماجد صاحب! مجھے یہاں سے نہ لے کر جائیے۔ ایسا نہ ہو۔ میرا بیٹا یہاں آئے اور ماں کی خنجر آنکھوں کو نہ پا کر مایوس لوٹ جائے۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی تھیں گر لاتی تھیں۔ ان کو سمجھانا بھگانا کسی کام نہ آتا تھا۔ ہرگز رتا دن انہیں کمزور تر اور لاغر بنا جاتا۔ مگر امید دم نہ توڑتی تھی۔

”میں نے جس در سے آس لگائی ہے۔ وہاں سے ناامیدی کا خیال بھی گناہ عظیم ہے۔“

اُس کے ہاں دیر ضرور ہے۔ اندھیر بالکل نہیں۔ میں اپنے حصے کا انتظار کروں گی۔ وہ دے گا مجھے۔ میرا ایمان کامل ہے۔“

وہ ہر بار اصرار پر بھی فقرہ دہرایا کرتیں۔ جو اتنا مخصوص تھا کہ اب انہیں بھی اذیر ہو گیا تھا۔ سب کچھ تھا ان کے پاس مگر وہ نہیں تھا۔ جس کی عدم موجودگی کے باعث ہر شے ہر نعمت کا احساس مانہ پڑتا جا رہا تھا۔ وہ اسی ایک لمحے میں جی رہی تھیں۔ جس میں انہوں نے اپنے بیٹے کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کر دیا تھا۔ وہ خود کو یہ لمحہ کبھی بھولنے نہیں دیتی تھیں۔ کیوں بھلا وہ ماں ہو کر ماسٹا کے تقاضوں پہ لاری نہ اتر سکیں۔ وہ صرف مستقیم کی مجرم تھوڑی تھیں۔ وہ تو اپنے پیدا کرنے والے کی مجرم بن گئی

وہ صبحا لگا کر فیس رہی تھی۔ وہ اس وقت جیسی میں حد سے زیادہ تلخ اور بے لحاظ ہو رہی تھی۔
 "شٹ اپ شائل! میں ہرگز تمہیں اجازت نہیں دے سکتا کہ تم میرے گھر پہ کھڑی ہو کے میری پوری کی توہین کرو۔ کبھی ہو تم؟"

مستقیم کا سارا ضبط جیسے ختم ہو گیا۔ اس کا لہجہ اتنا درشت، اس قدر فصیلا تھا کہ ایک لمحے کو خود دیا بھی سہم گئی۔ کہیں وہ اٹھ کر شائل کو پھٹرنہ رسید کر ڈالے۔ کچھ کہے بغیر وہ پلٹ کر وہاں سے تیزی سے نکل گئی۔ اسے لگا تھا۔ شائل نے دانت اسے ذلیل کیا ہو۔

"ہرٹ کیوں ہوتے ہو میرے ہنڈ سم شہزادے! چلو میں کچھ نہیں کہتی۔"

وہ دانت نکال رہی تھی۔ مستقیم کو وہ کوئی بد صورت چڑیل سے مشابہ لگی۔

"تم یہاں سے چلی جاؤ۔ میں ہرگز کوئی فضول بات برداشت نہیں کر سکتا۔"

وہ فرایا تھا۔ امانت گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کام ڈاؤن مستقیم! اور شائل

اس نے رخ شائل کی جانب پھیر کے جیسے دانت کھکچائے۔

"کہا بھی تھا تم سے کہ۔"

"آئی ایم سوری مستقیم! میں تمہاری بیوی سے بھی ایکسکووز کر لیتی ہوں۔"

وہ ننگی اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر بے باکی سے مسکرائی۔ مستقیم نے ناگوار تاثر کے ساتھ

الٹے رخ سے اس کا زانو یہ بدلتے چہرے کا رخ پھیر لیا۔

امانت! دیا کو تمہارا یہاں آنا پسند نہیں آیا۔ اور شائل کا مجھے۔ مجھے امید ہے مجھے اور کچھ تمہیں

بھانسنے کو نہیں کہنا پڑے گا۔"

اس کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ اس کی آواز میں بیگانگی تھی۔ امانت کا رنگ غصے سے سرخ پڑ گیا کچھ

بغیر وہ شائل کا ہاتھ دبوچے اسے گھسیٹتا ہوا وہاں سے لگا تھا۔

"تم بہت بد فطرت عورت ہو۔ تمہاری وجہ سے مجھے بہت جگہوں پر شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔"

وہ شائل پہ برساتیرونی دروازہ پار کر گیا۔ دیا نے پھر بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ

ان کی ٹارنسٹی اور دکھ کو محسوس کرتا ہوا مستقیم وہیں اس کے پاس آ گیا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے دیا! اس عورت کو بکواس کرنے کی عادت ہے۔"

مستقیم نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔ اس کا لہجہ بھی نرم تھا۔ دیا کی آنکھیں بھیکتی چلی گئیں۔

تھیں۔ جو اپنی محبت کو ستر ماؤں کی محبت سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ اسی بے ریا، پر غلوں محبت میں شک اور غرض کی آلائش کی جرم دار ٹھہری تھیں۔ وہ خود کو معاف کیسے کر دیتیں، وہ خود کو معاف نہیں کر سکتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"تم کام پہ نہیں آئے تو مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ بس آ پہنچا تمہیں ملنے کو۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں تمہیں ڈھونڈنا اتنا مشکل یا ناممکن تھوڑی ہے۔"

امانت اس کے سر ہانے آ بیٹھا تھا۔ ساتھ میں شائل بھی تھی۔ پہلے سے بڑھ کر چلتی دھکی حسین اور دل آفریں۔ مگر وہ مستقیم کو دیکھتی تھی۔ یک لک۔ مبہوت کہ اسے وہ نظر آیا تھا جس کے نظر آنے پر اس کے محسوسات بڑی لے بڑی ترنگ میں آ جاتے تھے۔ اسے یوں کسی کا بھی احساس کیے بغیر مستقیم میں گم پا کر دیا کا دل بہت دور گہرائیوں میں ڈوبا وہ جتنی جز بڑ تھی۔ باقی سب اس قدر رگن اور خوشی ہاں۔ مستقیم کو موسمی بخار نے آن لیا تھا۔ دیا نے ہی اسے کام پہ جانے کی اجازت نہیں دی تھی اور امانت کو تو جیسے بہانہ چاہیے تھا یہاں آنے کا۔

"دیا! چائے بنا لاؤ۔"

مستقیم کو ہی خیال آیا تھا۔ جیسی اس نے دیا کو احساس دلانے والے انداز میں کہا۔ وہ بے دلی سے انھی تب جیسے شائل کی نظروں میں آ گئی۔ اس کے چہرے پہ پہلے حیرت اندی پھر عجیب سا مسکراہٹ تھوڑا بھر آیا۔ اس کی آنکھوں میں اشتیاق بھی تھا دیا کے لیے، حسد بھی نفرت بھی تھی۔ جلن اور رگبت بھی۔ وہ اسے دیکھتی نہیں..... بلکہ گھورتی تھی۔

"افوہ..... تو یہ ہیں وہ محترمہ! جن کی خاطر تم نے مجھے ہمیشہ ٹھکرایا۔ معاف کرنا خلیفہ مجھے تو اس

میں کچھ بھی ایسا خاص نہیں لگا کہ تم اسے باقی سب پر ترجیح دے بیٹھے۔"

اس کے لہجے میں طنز کی واضح آمیزش تھی۔ حقارت آمیز خرازا تا تضحیک زدہ لہجہ دیا کے ساتھ

خلیفہ اور امانت کو بھی یکدم سے خاموش کرنا گیا۔ دیا کا چہرہ دھواں ہوا تھا۔ اس نے جڑے ہنسنے لگے

اور اک نظر مستقیم کو دیکھا۔ جس کی رنگت بے تحاشا سرخ پڑ رہی تھی۔

"شائل.....!!!"

امانت کا لہجہ تھنی تھا۔ احساس دلاتا ہوا کہ اپنی حد سے باہر نہ نکلے۔ مگر شائل کو ایسی حد بندیاں

کیا کہہ سکتی تھیں۔

"جو تھوڑی بہت خوب صورتی تھی وہ بھی جاتی رہی بچاری کی۔ اب تو بالکل خالی اور بے کار ہے۔"

کچھ کہے بغیر وہ آکر اس کے ساتھ لگ کے کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں واقعی اب بہت حسین نہیں رہی ہوں ہوں نا مستقیم؟"

وہ دیکھی تھی۔ مستقیم مضطرب ہونے لگا۔

"حسن خوش بختی کا باعث کبھی نہیں ٹھہرا دیا! میرے نزدیک بہت سے زیادہ اہم تمہاری پاکیزگی

اور خوب سیرتی ہے۔ انہی کا اسیر ہوا ہوں میں اور یہ خوابیں ڈھلنے یا ختم ہونے والی نہیں ہیں۔

وہ اس کا گال سہلا رہا تھا۔ شاید بہلا رہا تھا۔ دیا کا دل غم سے بھرنے لگا۔ اس کے اندر خواہش

ابھری کہیں سے آئینہ مل جائے۔ وہ دیکھے وہ کیسی ہو گئی ہے کہ مستقیم بھی اسے بس تسلی دے رہا ہے۔

"لیکن آپ نے کہا تھا۔ امی کی خواہش تھی آپ کی بیوی خوب صورت بھی ہو۔ جو آپ کو بیڑ

باندھ کر رکھ سکے۔"

وہ جیسے سخت گھبراہٹ اور فکر مندی کا شکار لگ رہی تھی۔ مستقیم سب کچھ بھلا کر ہنستا چلا گیا۔

"پہلی بات تو یہ ہے دیا کہ تم واقعی ابھی بھی بہت حسین ہو۔ حالات کی ستم طرینی بھی تمہاری

جاذبیت اور دلکشی چھیننے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور اگر خدا نخواستہ ایسا ہوا بھی کبھی تو مجھے فرق نہیں

پڑے گا۔ دیا تم میری روح کی تسکین کا باعث بنی ہو۔ صرف جسم سے محبت نہیں کی میں نے، کیسے نہیں

دلاؤں کہ تم میں کون سی معنوی کشش تھی۔ جس نے جکڑ لیا تھا مجھے۔"

وہ تائید طلب نظروں سے اسے دیکھتا تھا۔ دیا کچھ نہیں بولی۔ ہنوز ملول اور یاں مدہ نظر آتی رہی

تھی۔ مستقیم نے گہرا طویل سانس کھینچا۔

"کیا میری محبتوں کی تمام تر شدتوں کو محسوس کر لینے کے باوجود تمہاری غیر یقینی نہیں جاتی؟"

اس کا سوال بہت اہم تھا۔ دیا سب کچھ بھلا کر سرخ پڑ گئی تھی بے تحاشا شرم کے باعث۔

"یار سنا ہے پر لکھنی پڑی میں عورت تھوڑی سی بے ڈول ہو ہی جاتی ہے۔ مگر نہ کرو۔ تم بھی بعد

میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

اس نے پھر اس کا گال سہلایا تو دیا سخت فردہ سی مسکرانے لگی۔

"اب وعدہ کریں۔ آپ امانت سے نہیں ملیں گے۔ مجھے ان دونوں سے بہت ڈر لگتا ہے مستقیم

وہ پھر سے مضطرب ہونے لگی۔ مستقیم نے اب کی مرتبہ کچھ کہے بغیر محض اس کا ہاتھ چسپا ہوا تھا۔

شام فہم کی سحر نہیں ہوتی

یا ہمیں کو خبر نہیں ہوتی

ہم نے سب دکھ جہاں کے دیکھے ہیں

بے کلی اس قدر نہیں ہوتی

ایک جاں سوز نامراد خلش

اس طرف ہے ادھر نہیں ہوتی

رات آ کے گزر بھی جاتی ہے

اک ہماری سحر نہیں ہوتی

بے قراری سہمی نہیں جاتی

زندگی مختصر نہیں ہوتی

☆...☆...☆

وہ کب سے نیچے میں منہ دیے ساکن پڑا تھا۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے کچھ کھائے پیئے بغیر۔

دیا نہیں کرتے بھی تھک گئی تھی۔ رورہ کرنا حال ہو گئی۔ مگر۔۔۔ بولنے پہ اس کی نہ اٹھنے پہ کیا

آرتی وہ۔۔۔؟ بات تھی بھی نہیں معمولی۔ زندگی نے دوسرا مرتبہ اس کے ساتھ وہی بے رحمی والا

سلوک کیا تھا۔ اس میں قسمت کا کتنا عمل دخل تھا۔ معاشرے کی بدسلوکی غیر انسانی سوز رویوں کا

کتنا۔۔۔؟ دیا کی مفلوج ہو جانے والی صلاحیتیں بکھنے اور جاننے سے قاصر تھیں۔ ابھی چند دن قبل تو وہ

بہت خوش تھا۔ اسے بتا رہا تھا۔ اس اتنی مشقت سے اس کی جان چھوٹ رہی ہے۔ مزدوری یا پھر گندم

کی کٹائی کا کام آسان نہیں تھا۔ اس کی بہ نسبت کسی دوکان پر سیلز مین کی نوکری بہتر تھی۔ ماوندہ بھی

اجتہاد جاتا تھا اور امانت نے اسے یقین دلایا تھا وہ اسے نوکری دلا دے گا اور یہ یقین ہی میں تھا۔

اگلے دن واقعی اس کو اس قبضے کے سب سے بڑے جنرل اسٹور پہ سیلز مین کی ملازمت مل گئی تھی۔ چھ

پڑا ماہوار پر۔ یہ بھی بہت تھا۔

ابھی وہ دونوں ڈھنگ سے شکر ادا کر پائے تھے نہ ہی پر سکون ہو سکے کہ ایسا دھچکا لگا تھا۔ جس

نے اپنی طور پر بالکل مفلوج اور بے کار کر ڈالا۔ مستقیم کی ملازمت کے تیسرے دن دوکان میں رات

کے وقت ڈاکہ پڑا تھا اور الزام مستقیم پہ آ گیا تھا۔ ابھی وہ اس شاک سے باہر نہیں نکلا تھا کہ مالک

دوکان سمیت دیگر نے مل کر اسے زبانی کھائی لعن طعن کے ساتھ زد و کوب بھی کرنا شروع کر دیا۔

وہ شاکزد تو تھا ہی پھر سام گیا تو پھر سنبھالنے میں نہیں رہا تھا۔ اب وہ آٹھ سال پہلے کا کمزور اور

نوروز کا تو تھا نہیں کہ یہ دنیا اس کے ساتھ بدسلوکی کا رویہ اپناتی اور وہ بے بس تماشا دیکھتا رہتا۔ اک

عمر جرم کی دنیا کا باسی رہا تھا اور اس کے فنون سے بھی آگاہ۔ وہ اکیلا بھی سو پر بھاری پڑ سکتا تھا اور پڑا تھا۔ مگر اس کا اپنی ذات کے لیے اپنا دوقای انداز گویا اس پہ نگے جرم کے الزام کو گہرا اور پختہ کر گیا۔ اس کا پیشہ دارانہ مجرمانہ بد معاشرانہ انداز کافی تھا تا جرم ثابت کرانے کو۔

لازمی طور پر اسے پولیس کے حوالے کیا جاتا اگر جو امانت بچ بھاؤ نہ کراتا آکے۔ ہر جان اسے بھرا تھا اور اس کی خلاصی کراہی۔ مگر اس کے اندر کی دنیا تہہ وبالا ہو گئی تھی۔ دنیا نے ثابت کیا تھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی سفاک ہے۔ اسی قدر بے رحم۔ وہ مجرم نہیں تھا۔ محض اس پر اس لیے الزام دھر دیا گیا کہ وہ نیا تھا۔ کوئی واضح اور مستحکم حیثیت نہیں رکھتا تھا اور ایسے میں اگر امانت نہ ہوتا۔۔۔۔۔؟ اس نقصان کو پورا کر کے اس کی جان نہ چھڑواتا تو۔۔۔۔۔؟

کتنے سوال تھے جو پن بن کر چھپتے تھے۔ کیسی شرمندگی تھی جو اسے دیا سے بھی نکالیں چارہ کرنے دیجی تھیں۔

”کیا سمجھے گی وہ کہ میں نے واقعی کیا یہ سب؟“

اس کا دل پھر پوری دنیا کو آگ لگانے کو چاہنے لگا۔ ویسی ہی آگ جو دنیا نے دوسری مرتبہ اس کے لیے برزخ کی صورت دہکائی تھی۔ وہ سسکتا تھا۔ وہ تڑپتا تھا مگر اس اذیت سے چھٹکارا نہیں ملتا تھا۔ ایسی مایوسی، دلگیری اور وحشت کی گھڑیوں میں اس نے وہ حرکت کی تھی جو اس نے تب بھی نہیں کی جب پہلی بار اس پہ الزام لگا تھا۔ تب بھی وہ اتنا دل برداشتہ نہیں ہوا تھا جتنا اب ہرٹ ہوا۔ جیسی تو اس نے دیا کا بھی کچھ نہیں سوچا، نہ اپنے دنیا میں آنے والے بچے کا۔ اس نے خود کشی کر لی تھی۔ یہ اس کی مایوسی کی انتہا تھی۔ یہ اس کی اذیت کی اور دلگیری کی بھی انتہا تھی۔

☆ ☆ ☆

شام کو یادوں کے آئینے میں اتر جاتا ہوں

اور اس بزم سے پھر رقت سحر جاتا ہوں

مجھ کو مقصود ہے ہر حال میں راحت تیری

بوجہ ہوں مگر تو تیرے دل سے اتر جاتا ہوں

میں تو قائم ہوں ابھی عہد وفا پر اپنے

مگر تجھے راس نہیں ہے تو مکر جاتا ہوں

پتا نہیں وہ کیوں بچ گیا تھا۔ پتا نہیں اسے بچا کرا بھی اور کتنی ذلت مسلط کرنی باقی تھی۔ وہ

بھی شاکی ہونے لگا۔ دیا کا رو رو کر سسک سسک کے برا حال تھا۔ مگر اب اسے اپنے سوا اور کسی پہ دم نہ آتا تھا۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی بد نصیب نہیں تھا یہ طے ہو گیا تھا۔ دیا بھی نہیں۔ کم از کم اس پہ جو الزام تو نہ لگے تھے۔ الزام۔۔۔ وہ بھی جھوٹا بہت تکلیف بہت اذیت کا باعث ہے۔ وہ تو ہماری مرتبہ اسی صورت حال سے گزرا تھا۔ کیوں؟ کیسے؟ اس پر غور کیے بنا۔ فرصت اور ضرورت بھی کسے تھیں۔

”آپ نے ایسا کیوں کیا تھا مستقیم؟“

دیا اس کی پٹی سے لگی حال سے بے حال تھی۔ مگر اس کی چپ ٹوٹی سی نہ تھی۔

”کیا آپ کو مجھ پہ یقین نہ تھا؟“

وہ شاکی ہوئی۔

”خود سے بڑھ کر اعتبار کرتی ہوں آپ پر پھر۔۔۔“

وہ جیسے بنا کہے اس کا درد جان گئی تھی۔ سمجھ گئی تھی۔ مستقیم کو اس ساری اذیت ناک سچویشن میں جلی۔ تجویزی سی راحت اور سکون کا احساس ہوا۔ یوں جیسے گھورتا ریکی میں کہیں کوئی موہوم سی روشنی تک آنے اور زندگی کا احساس دلانے۔

”میرا نہیں تو اپنے بچے کا سوچا ہوتا مستقیم! کیا آپ کو اس سے بھی محبت نہیں ہے۔“

او گھٹ گھٹ کے رو رہی تھی۔ مستقیم نے کچھ کہے بغیر اسے اپنے بازو کے حصار میں لے لیا۔

”بس کریں بھابی! وہ آل ریڈی اب سیٹ ہے۔ حوصلہ دیں اسے بس۔“

امانت نے فو کا تھا۔ جو فروٹ کے شاہرزادہ اٹھائے ابھی وہاں آیا تھا۔ دیا جھک کر مستقیم سے الگ

ہوئی۔ اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔ البتہ اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر بہت گہرا تھا۔

”کچھ کھا لو مستقیم اور خود کو سنبھالو۔ اس طرح کے معاملات سننے نہیں ہیں جنہیں ہم ہینڈل نہ کر سکتے۔“

وہ رساں سے کہہ رہا تھا۔ دیا اسے گھورتی رہی۔ اس کی نظروں کا انداز تند تھا اور ان میں بے

تفاوتی بھری ہوئی تھی۔ ہونٹ اس نے ایسے بھیج رکھے تھے جیسے بہ مشکل خود کو کچھ سخت کہنے سے

روک رہی تھی۔ امانت سب کاٹ کر پلیٹ میں رکھ رہا تھا۔ پھر اس کی جانب بڑھائی۔

”آپ بھی لے لیں بھابی!“

دیا کا تضرع مزید بڑھ گیا۔ کچھ کہے بغیر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ جب تک

امانت موجود رہا وہ جیسے کانٹوں پر لٹتی رہی تھی۔ اس کے جاتے ہی دھپ دھپ کرتی اندر آگئی۔
 "آپ اسے فی الفور یہاں آنے سے منع کریں۔ ہمیں اس کا کوئی احسان نہیں چاہیے۔"
 اندر آتے ہی وہ ترخ گئی تھی اور جھنجھک کر اپنا مطالبہ اس کے سامنے رکھا تھا۔ اس کا یہ مطالبہ
 ٹیکنک سے واپس گھر آ کے اور شدت بکڑ گیا تھا۔ وہ ہرگز بھی امانت کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں
 تھی۔

"وہ میرا محسن ہے دیا!"

"محسن.....؟"

وہ چیختی۔ اس کی آواز صدمے سے پھٹ گئی تھی۔ مستقیم حیران رہ گیا۔

"اس نقب زن کے ہاتھوں اتنا بڑا دھوکہ کھا کر بھی اسے محسن سمجھتے ہیں آپ خلیفہ؟"

اس نے بے حد تکلی میں آتے ہوئے کہا تھا۔ مستقیم پہلے حیران نظر آیا پھر ایسے جیسی انداز میں
 گھورا۔

"دیا تم.....؟"

"پلیز خلیفہ! دوست اور دشمن کی پہچان کرنی سیکھ لیں۔ یہ سب کیا دھرا امانت کا ہے اور
 کیوں کیا ہے یہ بھی بتاؤں آپ کو.....؟"

وہ جیسے رو دینے کو تھی۔ بلکہ روی پڑی تھی۔ خلیفہ نے تادمی نظروں سے اسے گھورا۔

"بدگمانی کی کوئی حد بھی ہوتی ہے دیا اور نفرت کی بھی۔"

"یہ نفرت ہے نہ بدگمانی۔ حقیقت ہے۔ اسی لیے چاہتی ہوں کہ اس سے کنارہ کریں۔"

وہ اب کے چیختی نہیں تھی۔ منت پہ اتر آئی تھی۔ خلیفہ کچھ کہے بغیر اسے سرد نظروں سے ٹکھا ہوا
 کو اس کی انہی نظروں سے دکھ ہوا تھا۔ جو اس کا یقین کرنے کو تیار نظر نہیں آتی تھیں۔

"آپ کو اعتبار نہیں ہے نا میرا؟"

وہ سسکنے لگی۔ مستقیم نے نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔ اس کا دماغ ماؤف تھا۔ البتہ اسے دیا پہ ضرور حسرت
 رہا تھا۔ جو اسے اس مرحلے پر بھی ٹیز کر رہی تھی۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا اسے بیٹھ اس کا ساتھ بھانے
 والی یہاں کیوں خیال نہیں کر رہی تھی۔

"مجھے اکیلا چھوڑ دو دیا! پلیز۔"

اس نے سر ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ چیخ پڑا تھا۔ دیا بکھت سہم کر رہ گئی۔ اس نے خوف چھانکنا

نظروں سے خلیفہ مستقیم کو دیکھا۔ جو پہچان زدہ لگ رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر اس کی جانب
 ہلی۔

"کیا ہوا مستقیم آپ کو؟"

وہ جیسے ہی قریب آئی اور اسے چھوا مستقیم نے اسی ہسٹریائی کیفیت کے زیر اثر اسے زور سے
 ہٹا دیا۔

"میں نے کہا مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ تمہیں سنتا نہیں ہے۔"

سرخ آنکھوں سے اسے گھورتا وہ طلق کے بل غرایا۔ دیا کی سر اسٹیلی کچھ اور بڑھی۔ اسے یاد آیا
 مستقیم ایسے ہی ڈپریشن میں پہلے بھی خودکشی کر چکا تھا۔

"آپ کو میری بات بری لگی..... آئی ایم سوری خلیفہ! معاف کر دیں پلیز، پلیز معاف کر
 دیں۔ آئندہ نہیں کہوں گی۔ ہر وہ بات جو آپ کو بری لگے۔ آئی سوئیر پر اس۔"

دونوں ہاتھ جوڑ کر وہ بے اختیار رو پڑی۔ مستقیم سرخ دیکتی مگر غم آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا پھر
 کچھ کہے بغیر اسے بازوؤں میں بھر کے خود میں سولیا۔ دونوں دھکی تھے۔ دونوں رو رہے تھے اور اس
 ہٹ دونوں ہی اک دوسرے کی ڈھارس اور سہارا تھے۔

☆.....☆.....☆

لفظ بہت محدود ہیں میرے
 سوچتا ہوں کہ اپنی ہر الجھن
 زندگی کے سفر کی ساری محسن
 اپنے دکھ کی تمام تصویریں
 جبر کے غم کی ساری زنجیریں
 اپنی تباہیوں کے اشکوں کو
 اتنا لکھوں کہ داستان کر دوں
 ہاں مگر بے بسی یہ ہے
 لفظ تھوڑے ہیں زخم زیادہ ہیں

پتیل کے درخت میں چڑیا چھپاتی تھیں۔ وہ ساکن بیٹھا کسی عیش سوچ میں غم تھا۔

سوچیں جن کی لامعت حدود سے باہر ہو رہی تھی۔ جو پھرا ہوا ایسا سمندر تھیں جس کے تلاطم اور

تندی کے آگے ہر چیز اپنا تاثر اور مضبوطی کھو کر اس کے بے رحم تھپیڑوں کے رحم و کرم پہ آ جاتی ہے۔ دیا نے کہا تھا۔ یہ سب کیا دھرا امانت کا تھا۔ اس پر گتے والے الزام سے لے کر خود کشی تک کے مرحلے تک۔ حالات ایسے پیدا ہوئے نہیں تھے۔ کر دیے گئے تھے۔ یہ دعویٰ تھا دیا کا اور اب۔۔۔ اب اگر وہ کڑیوں سے کڑیاں ملاتا تو بات اتنی بھی غلط نہیں تھی۔ اب جب کہ امانت نے اسے بدنام ترین چوڑی پھر سے اپنانے کا مشورہ دیا تھا۔

کیسے پھر گیا تھا وہ پھر سے اس کی نوکری کی تلاش کا ارادہ جان کر۔

”پاکل ہو تم مستقیم! کیوں خود کو ایک بے کار عہد کی خاطر برباد کرنے پہ تل گئے ہو۔ تمہارا اسٹنڈرڈ یہ نہیں ہے۔ تم اس دنیا کے باسی بھی نہیں ہو۔ جرم کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہو۔ اپنی حیثیت، اپنا مرتبہ مت بھولو۔ واپس اپنی دنیا میں چلو۔ وہاں سب ویسا ہی ہے سب کچھ تمہارا منتظر۔“

اور خلیفہ خاموش ہو گیا تھا یا اسے چپ لگ گئی تھی۔ اسے دیا کی بات اس کا دعویٰ کچھ ایسا غلط بھی نہ لگا۔ دکھ کون سا نہیں تھا۔ دوستی کے بھرم کے نوٹنے کا اعتماد کے بکھرنے کا۔ اس کی اذیت کا انت نہیں رہا۔ اسے یاد نہیں کرنا پڑا کہ امانت نے ہی اسے مزدوری چھوڑ کر سیلز مینی کا مشورہ دیا تھا۔ پھر ملازمت بھی خود دلوائی تھی۔

”کس سوچ میں ڈوب گئے شہزادے؟“

امانت کا دھوکا اسے سوچوں کے بھنور سے نکال لانے کا باعث بنا تھا۔ وہ ہوش میں آ جانے کے باوجود جیسے ہوش میں نہیں لوٹا تھا۔ حقیقت سے کوسوں دور تھا۔ سچائی سے دوری اسے یکدم خالی کر کے رکھ گئی۔ شاید کم از کم اسے امانت سے ایسی توقع نہیں تھی۔ یہ صدمہ بھی انوکھا تھا۔ اس کی نوعیت بھی۔ مگر وہ پھر بھی یقین کرنا چاہتا تھا نہ ہی اس پر اعتماد کھوتا۔ یا شاید وہ اسی خاموشی سے ٹٹنے پر آمادہ تھا کہ لوٹنے والا بھی شرمندہ ہو جائے۔

”پولیس تمہاری تلاش میں باؤلے کتے کی طرح دوڑی پھرتی ہے مستقیم! ہمارے کچھ اور ساتھی بھی ایسے ہی بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ہم اس معاشرے میں ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تم نے بھی دیکھ لیا نا شرافت کو اپنا کر۔۔۔ کیا ملا؟ کچھ نہیں نا؟ مستقیم ہم مس فٹ تھے یہاں۔۔۔ اور ہم رہا گئے۔ بتاؤ کیا ہم پھر کیوں نہ واپس لوٹ جائیں اپنی دنیا میں۔ جہاں ہم لوگوں سے نہیں لوگ ڈرتے ہیں ہم سے۔ یاد کرو۔ میں نے کہا تھا نا غوا کف اور ڈاکو کو تو پکڑ لینے کے باوجود کوک۔ معاف کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں نہ قبول کرنے میں۔ وہ سوال پہ سوال داغ رہا تھا۔ گویا سوچنے کا موقع فیصلہ کرنے

میں آسانی مہیا کر رہا تھا۔ خلیفہ خاموش رہا۔ شاید وہ فیصلہ کر نہیں پایا تھا۔ یا شاید فیصلہ تھا ہی بہت مشکل۔ وہ یونہی گم صم کیفیت میں وہاں سے اٹھ کر واپس چلا آیا تھا۔ جیسا بے خیال تب تھا ویسا ہی اب بھی۔ دیا نے روٹیاں پکاتے ہوئے کئی بار اس کا یہ انداز دیکھا تھا مگر نوک نہیں۔ روٹی کپڑے میں لپیٹی۔ گڑی چوڑھے سے کھینچ کر آگ پہ پانی کے چھینٹے ڈالے اور سالن کنوری میں نکالتے پھر مستقیم کو دیکھا۔ جس کی پوزیشن میں ذرہ برابر فرق دیکھنے میں نہیں آ سکا تھا۔

”کھا نا کھا لیں۔“

وہ چتیراٹھائے قریب آ گئی۔ مستقیم نے چوٹے بنا نگو کا زاویہ بدل کر پہلے اسے دیکھا پھر چتیر میں موجود ڈیزل روٹی کو آج پھر سالن کی جگہ آم کی چٹنی تھی۔ یہ بھی اس لیے شاید میسر تھی کہ گھر کیڑوں کا درخت موجود تھا اور مالک مکان نے بخوشی آم استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

وہ بادل خواستہ ہی بولا۔ دیا البتہ بے چین نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیوں بھوک نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔“

اس کی خشکی نظروں کے جواب میں وہ گڑ بڑا کر خود ہی وضاحت بھی پیش کرنے لگی۔

”اس وقت اس لیے نہیں کھاؤں گا کہ روٹی نا کافی ہے۔ صبح اس لیے نہیں کھایا تھا کہ میں ایسا ہشت نہیں کر سکتا۔ ہو گئی تمہاری تسلی اب جاؤ یہاں سے۔“

جواب میں وہ زور سے پھٹکا رہا تھا۔ ضبط اور حوصلہ کھو کر۔ اس کی آواز میں بادلوں کی سی گھن گرج تھی۔ دیا اس کے اس طرح مشتعل ہونے کی وجہ تو نہیں سمجھی مگر سراسیمہ ضرور ہو گئی اسے قطعی سمجھ نہیں آ گیا اب جواب میں کیا کہے۔ جیسی آنکھیں بے بسی کے شدید احساس سمیت آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔

”کیوں کھڑی ہو۔ جاؤ یہاں سے۔“

وہ پھر چیخا تو دیا کے آنسو اس کے گالوں پہ اتر آئے تھے۔ کچھ کہے بغیر وہ منہ پر ہاتھ رکھے پلٹ کر گئی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ مغرب ہوئی پھر عشاء بھی۔ دونوں نے اپنی پوزیشن بدلی نہ جگہ وہ وہاں اور مذاہنوں میں گھرا تھا۔ دیا کو روٹنے سے فرصت نہیں تھی۔ پھر اس نے ہی بار تسلیم کی تھی اور لمحہ سے جیسے گال رگڑتی اٹھ کر بیٹھ گئی صحن میں چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ پھیل اور آم کے درخت کی شاخوں کا سایہ چاندنی کے غبار میں صحن کے کچے فرش پر دور تک لمبا پھیلا ہوا تھا۔ اس سائے میں وہ کسی

مجھے کی مانند ساکن بیٹھا نظر آتا تھا۔ ہنوز اسی پوزیشن میں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے پاس چلے ہوئے جھکی۔ ایسی ہی بیگانی اور اجنبیت چمک رہی تھی اس کے خدو خال سے۔ جو اس کے حوصلوں کو پست کرنے کا باعث تھی۔

”خلیفہ!“

وہ جیسے بولی نہیں سکی تھی۔ جواب میں خاصی تاخیر سے خلیفہ نے اسے اپنی ہوتی ناخوشی گور نگاہ سے نوازا اور وہ جس جیسے کچھ بولنے سے کچھ کہنے سے قبل ہی سب کچھ بھولنے لگی کہ اس کا وہ یہ بھی کہتا تھا۔ فاصلہ رکھو۔ اپنی اوقات پہچانو۔ تکلیف دہ خاموشی غیر محسوس مگر بہت مضبوط انداز میں ان کے پیچ در آئی جسے توڑنے، دور بنانے کی ظاہر ہے خلیفہ کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اک دو بے اک احساس نے اسے توڑا تھا۔ اب وہ یہی حربہ آزما کر اپنا کام نکالنا چاہ رہا تھا۔ اس نے جان لیا تھا۔ یہ نیکی کا دور نہیں ہے۔ اب نیکی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ حالانکہ نیکی کا کوئی مخصوص وقت مقرر نہیں۔ اس کا حکم تو ہمیشہ کے لیے ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے معاشرے کے رویوں سے غلط اور تکلیف دہ اثرات موجب ضرور ہوا کرتے ہیں۔ جو قوموں اور نسلوں کی تباہی کا باعث ٹھہرا کرتے ہیں۔

”کیوں خفا ہیں؟“

بالآخر دینے پر مجبور ہو گیا تھا اسے مخاطب کرنے کا۔ اسے دیکھنے کا۔ جواب اس کی نظروں کی سرد مہری کا تاثر مزید گہرا ہونے لگا۔ بیگانگی کچھ اور دیر ہوئی۔ وہ بے اختیار وہ بے ساختہ رو پڑی کہ اس کا رویہ ایسا ہی ناقابل برداشت تھا۔ زیادہ وقت تو نہ گزرا تھا۔ جب وہ دونوں ایک دوسرے کے ہم و ہمزات تھے۔ بنا کہے پر دکھ کو بھگنے جانے والے۔ کسمپرسی کے باوجود کسی ڈھارس تھی اس اپنا جیت و یکجہت کے باعث اور اب وہ یکجہت فاصلوں پر جا کھڑا ہوا تھا تو دیا خود کو ریشمی دیوار کی مانند ہرگز نہ ہوا پار ہی تھی۔

”کوئی ناراضگی ہے تو بتائیں۔ اس طرح مت کریں میرے ساتھ۔“

اس کے رونے میں شدت آگئی تھی۔ خلیفہ مستقیم نے لہو چمکاتی نظروں کو لہو بھر کو اس پر ڈھالا تھا۔ پھر گھٹا گھٹا۔

”تم مان لو گی میری بات؟“

”آپ کہیں تو۔ کیا اعتماد نہیں رہا ہے مجھ پر؟“

دیا کے اندر اس کی آواز سن کر ہی زندگی جنم لینے لگی۔ اس نے بچوں کے بل بیٹھے ہوئے اپنے

روں ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھ دیے تھے اور خنجر سوا لہنگا ہوں سے مستقیم کو بکنے لگی۔

”امانت نے ایک پروپوزل دیا تھا مجھے۔ میں اسے ایکسپٹ کر چکا ہوں۔“

اس سے نگاہیں چار کیے بنا وہ قدرے دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ دیا کی نظروں کا استعجاب و حیرت خوف کی چادر میں سینٹے لگا۔

”کیسا.....؟ کیسا پروپوزل؟“

آواز اس کے حلق سے پھنس کر نکلی تھی۔ خوف چہرے کے خدو خال سے بھی چمک پڑا۔

”دو بارہ مہینے کی سربراہی کا پروپوزل۔“

اب بھی اس سے نگاہ ملائے بغیر بولا تھا اور کرتے کی جیب سے سگریٹ نکال کر ساگانے کے پیش لینا شروع کر دیا۔ جب کہ وہ فحش چہرے کے ساتھ منہ پر ہاتھ رکھے زمین پر ڈھے کر رہے۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کرتا تھا اور تنہا ہوتے ذہن کی فیس جیسے پھٹنے کے قریب ہونے میں۔ مدد و شاک کا گہرا احساس اس کی آنکھوں میں پھر سے آنسو بھرتا چلا گیا۔ کتنی دیر وہ پھرانی آنکھوں کے ساتھ مستقیم کی بے نیازی کو کتنی رہی تھی پھر ضبط کھو کر زار و قطار رو پڑی۔

”آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں مستقیم! آپ نے وعدہ کیا تھا مجھ سے کہ۔“

”چپ ہو جاؤ دیا! فارگاڈ سیک! نام مت لینا میرے سامنے کسی وعدے و عہد کا۔ سنا تم؟“

”مشتعل ہو کر کہتا ایک جھکے سے کھڑا ہو کر حلق کے بل چیخا۔ اس طرح کہ دیا سہی ہوئی چپ ہو کر۔“

”کیا مل گیا تمہیں شرافت کی اس زندگی سے.....؟ بولو؟ مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے تو آج جانتا جانا میرے لیے اس شرافت کے نام نہاد شوقیت کے ساتھ یہاں کوئی جگہ کوئی عزت نہیں ہے۔ میں مزید تمہاری نہیں مان سکتا۔ دوسرے لفظوں میں تمہاری غلامی نہیں کر سکتا۔ میں ناکام ہوا۔“

”تم مان لو گی میری بات؟“

اس کا لہجہ ہنوز تند اور غصیلا تھا۔ اس کے خدو خال میں تناؤ کی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ دیا آنسو آنکھوں کے ساتھ اسے چیتے چلاتے سنتی رہی۔ ہمیشہ نرمی سے بات کرنے والا، پیار اور شرارت

سے چھیڑنے والا۔ باتوں باتوں میں معنی خیز جملے کہنے والا اس وقت کیساتھ اور بد لحاظ ہو رہا تھا۔ وہ اس کے اس روپ کو قبول کرنے سے قاصر تھا۔ دکھ بھی کوئی نہیں تھا نہ صدمہ ہی۔ وہ کس دکھ پہ آنسو بہاتی اور کسے چھوڑ دیتی۔ آج پہلی بار اس نے دیا کو اس کے والدین کی بے بسی کا طعنہ دیا تھا۔ آج جب وہ خود ایک لفظ اور ناجائز کام کی پھر سے ٹھان چکا تھا۔ ان کے تعلق کے سچ سے محبت اپنائیت، مان کب کیسے ختم ہو گیا، معلوم ہی نہ ہوا تھا۔ سرخ چہرے کے ساتھ ضبط کی شدت سمیت بچہ لب کاٹتی وہ رحم طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”مم میں نے کہا تھا ناں کہ امانت.....“

”فضول باتیں مت کرو، مجھے امانت نے نہیں اس دنیا کے بے رحم اصولوں نے مجبور کیا ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر اسے گھورتے ہوئے چلایا۔ دیا نے ہنگامی بھری۔ اسے لگا یہ موقع اگر اس نے گنوا دیا۔ اپنے حصے کی جنگ نہ لڑی تو سب کچھ تباہ ویراں ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ اس کی ہنسی سلب ہو رہی تھیں۔ تو انائیاں زائل مگر وہ پھر بھی جدوجہد میں مصروف ہوئی۔

”حالات اور دنیا جتنی بھی بے رحم ہو مستقیم! نیکی اور سچائی پر کاربند رہنا ہی نیکی اور دیانت کی کامیابی ہے۔ ہمیں اس آزمائش میں پورے اترنا ہے۔ یہ حالات ہمیشہ کشن نہیں رہیں گے آپ۔“

”شٹ اپ دیا! انف، میرے سامنے یہ لیکچر نہیں جھاڑو۔ مجھے نیکی کے سچی یاد نہ کرو۔ مجھے آج بھی سب کچھ ازبر ہے۔ مگر میں اس پر قائم رہنا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے کہ مجھے اس پر قائم رہنے نہیں دیا جا رہا۔ بات سنو.....“

وہ بھڑک کر زور سے چیخا۔ اس کا فتن چہرہ دیکھ کر لمحہ بھر کو رکا اور لہو رنگ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے بے رحمی سے پھٹکار کر بولا تھا۔

”اگر واپسی کا راستہ میرے لیے کھلا ہے ناں دیا! تو میں اسے تمہارے لیے بھی کھلا چھوڑ دوں ہوں۔ تمہارے والدین نے تمہیں ایکسپٹ نہیں کیا۔ مگر وہ تمہیں گھر سے بھی نہیں نکالیں گے۔ اگر میرا ساتھ میرا فیصلہ تمہیں قبول نہیں تو واپس چلی جاؤ۔ میں ہرگز برا نہیں مانوں گا۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ دیا کا سینہ ٹوٹا تو وہ قہر قہر کانٹا پھوٹ پھوٹ کر روتی چلی گئی اور یہ پہلا موقع تھا کہ خلیفہ مستقیم اس کے آنسوؤں سے بے چین ہو گیا۔ اسے چپ کرانے کو جتن کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وسعت و وسع ہر دیکھ کے پھر جاتا ہوں
تجھ سے آگے کا سفر دیکھ کے ڈر جاتا ہوں
روز ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح شام گھنے
میں بھی اک درد کے دریا میں اتر جاتا ہوں
وہ بھی چپ چاپ کہیں بندھ کے روتی ہو گی
میں بھی راتوں کو اب دیر سے گھر جاتا ہوں
میں نے بھی جرم بغاوت کے ستم جھیلے ہیں
میں بھی اب لوگ جدھر جائیں ادھر جاتا ہوں
چل پڑا ہوں میں اب دنیا کے اصولوں پر
میں بھی اب اپنی باتوں سے مکر جاتا ہوں

وہ ساکن لینا ہوا تھا۔ بالکل ساکن۔ اس کی آنکھوں پر اس کے دونوں بازو دھرے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا اس کے قمیض کی آستین کیوں غمناک ہیں۔ اس نے غیر محسوس انداز میں پھر بازوؤں کی جنبش سے آنکھوں کو گڑ گڑا کر پوچھا۔ بہت عرصے بعد آج پھر اس کا دل اپنی..... اپنی زندگی کی بربادی پہ ماتم کناں تھا۔ دیا کے سامنے جو اپنا بھرم کھویا تھا۔ تاثر خراب کیا تھا اس پر دکھ کا عالم بھی انوکھا ہی تھا۔ وہ بار گیا تھا۔ اس نے آج خود اس لڑکی کو دکھ دینے کی انتہا کر دی تھی۔ جس کی آنکھوں کی نمی اس سے کبھی نہیں جاتی تھی۔ لیکن وہ اس کی بات بھی تو نہیں مانتی تھی۔ کیوں تھی وہ اتنی ضدی اور اتنی پارسا۔

نیکی سچائی اور اصول پرستی کے سارے اسباق اگر پڑھ لیے تھے تو ان پر کاربند کیوں رہنا چاہتی تھی۔ تھا کوئی اس سے بڑھ کر احمق؟ اسے ہنسی آنے لگی۔ ہاں کبھی وہ بھی تھا نا ایسا ہی احمق۔ دنیا اور شکر لوگ اسے بھی اچھائی کے جواب میں برائی سے نواتے رہے تھے اور ہانک ہانک کر برائی کے راستے پہ ڈالتے رہے۔ وہ ضمیر کے آگے شرمسار شرمندہ ہوا پھرتا۔ مگر کب تک۔ آخر ضمیر سو گیا تھا۔ اسے بھی یقین تھا دیا کا ضمیر بھی سو جائے گا۔ پھر وہ پرسکون ہو جائے گی۔ ہاں اتنی سی تو بات ہے، بھلا کہاں جاسکتی تھی وہ اسے چھوڑ کر وہ مطمئن تھا۔

اس نے اسے اس قابل چھوڑا ہی کہاں تھا کہ وہ اسے چھوڑ دیتی۔ اس کے پیروں میں زنجیریں ہی اتنی ڈال دی تھیں، اپنی اولاد کی، اپنی محبت کی، بدنامی کی وہ اب اس کے علاوہ اور کہیں پناہ حاصل کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے مطمئن ہونا چاہیے تھا مگر وہ ابھی بھی ٹھیک سے بے حس نہیں ہو سکا تھا۔ ابھی

بھی جیسی مطمئن نہیں بے چین تھا۔

معا کوئی آہٹ ہوئی۔ مستقیم ساکن وسامت جیسے تھا ویسے پڑا رہا۔ آنکھوں پہ دھڑے بازوؤں کے درمیان موجود جھری اسے دکھائی تھی دیا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔ کچھ دیر متنبہ رہا وہیں چوکھٹ کے پاس کھڑی رہی۔ پھر چٹائی پہ اس کے پہلو میں آگئی۔ مناسب فاصلہ رکھ کر۔ یقیناً وہ اب بھی بہت خفا تھی اس سے۔

"باہر چل کر لیٹو۔ اپنی جگہ پر۔"

مستقیم نے کدو بدل کر رخ اس کی جانب پھیرتے خشک و سرد آواز میں اسے مخاطب کیا۔ دیا نے ٹھنک کر کچھ تحیر کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔ چاندنی رات تھی۔ کھلی کھڑکی سے آتی مدہم روشنی میں وہ کتنی دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھتی تھی۔

"باہر بارش ہو رہی ہے اور یہ میری ہی جگہ ہے۔"

اطلاع دینے کے ساتھ اس نے جیسے اب کے مستقیم کو کچھ یاد دلانا چاہا تھا۔ جواباً وہ زہر خند سے ہنسا وہ دانستہ کشور پن کی حد کر دینا چاہتا تھا تاکہ اسے فیصلہ کرنے میں آسانی اور سہولت رہے۔

"کب تک؟"

اور دیا رنج اور اذیت سے جیسے شل ہو کر رہ گئی۔

"اس کا فیصلہ بھی آپ کریں گے، ویسے ہی زبردستی، جیسے مجھے یہ جگہ دی تھی۔"

وہ بھی پھٹ پڑی تھی اور تقریباً ادبھی۔

"یہ زبردستی کا فیصلہ تھا۔ جیسی تو تم اسے قبول نہیں کر سکیں۔ کچھ فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ باقی تمہیں کرنا ہے۔ میرے ساتھ چلنا ہے تو میری مرضی کے مطابق بھی رہنا ہوگا۔ دوسری صورت میں۔"

"آپ اتنے ظالم کیوں ہیں خلیفہ! کیوں ہیں اتنے بے حس؟"

اس کی پوری بات سنے بغیر دیا نے اسے زور سے جھنجھوڑ دیا تھا اور پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

مستقیم نے رعوت زدہ تاثرات کے ساتھ اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"اس قسم کی باتوں کا فائدہ ہے اب نہ منجائش۔ فیصلہ کرو، وقت نہیں ہے میرے پاس۔"

اجنبی اکھڑے تھکے تیوروں سے اس نے بظاہر دھیسے لہجے میں کہا تھا۔ مگر نیکی..... اللہ اللہ دیا بے بس گھبرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی کہ واقعی اس کے کسی انداز میں ہرگز کوئی نہ منجائش باقی نہیں تھی۔

"میں آپ کی بات ماں لوں کی مستقیم! پلیز اک کوشش کر لینے دیں مجھے۔"

کوئی چارہ نہ پا کر وہ اس کی منت پہ اُتری۔ مستقیم نے استعجابی انداز میں ہنسوؤں کو جنبش دی۔

"کیسی کوشش"

"میں آزما چکی اپنے والدین کو اک کوشش آپ کی طرف بھی مجھے۔"

اس کی بات ادھوری رہ جانے کا باعث مستقیم کا اس کے چہرے پر اٹھا ہوا ہاتھ تھا، وہ پوری ہستی سیت مل تو گئی ہی تھی۔ سنانے میں گہری ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اسے غیر یقینی سے ہکتی رہ گئی۔

"لو دو بارہ یہ نام..... بد بخت لڑکی! تم میرے ماضی سے اس لیے آگاہ ہوئی تھی کہ مجھے

بات بے بات رگیدتی اور طعنہ دیتی رہو۔ نہیں ہیں وہ لوگ میرے کچھ بھی۔ کوئی تعلق بھی نہیں ہے میرا تو تمہارے وہ کچھ کدھر سے ہو گئے۔ آج کے بعد ان کا نام دو بارہ لیا تو گلا گھونٹ دوں گا تمہارا۔

مشتعل لہجے سے چھٹکا غضب جلال اور غراہٹیں دیا کے اعصاب کو منجمد کر کے رکھ گئیں۔ اس کی بے انتہا بدحواس متوحش نگاہیں سراسیمہ انداز میں اس پر اُٹھی ہوئی تھیں۔ رگ رگ میں جیسے کوئی محشر برپا ہو چکا تھا۔ جب کہ وہ اس کی سماعتوں میں اس پر ذرہ برابر رحم کھائے بغیر پکھلا ہوا سیسہ اٹھیل رہا تھا۔

"اب سمجھا ہوں میں تمہیں۔ تم مجھے یہاں رکھنا ہی اس لیے چاہتی ہو کہ کسی دن پولیس کے ہماپے کے نتیجے میں بے بسی کی موت مارا جاؤں۔ اب اگر تم واپس مجھے میرے جیڑش تک لے جا کر مزید ذلیل کرانے پر تکی ہو یا اپنی اس سبکی کا اس انداز میں مجھ سے بدلا لینا چاہتی ہو تو بات سنو..... کوئی خوش فہمی تمہیں لاحق تھی انہوں کے متعلق مجھے نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں ایسی حماقت کے نتیجے میں میرا باپ جو میری نفرت کی انتہا پہ پہنچ چکا ہوگا یقیناً..... وہ پہلی فرصت میں پکڑ کر مجھے پولیس کے حوالے کر گا۔ میں پھانسی چڑھوں گا اور تم اس نام نہاد مظلومیت کا لبادہ اوڑھے سب کی ہمدردیاں حاصل کرو گی۔ مگر....." وہ پھٹکارا پھر زہریلی ہنسی ہنسا اور اس کا سکتہ زدہ چہرہ دیکھا۔

"میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مگر ایسی موت نہیں مردوں کا جیسی تم چاہتی ہو۔ سن لیا تم نے؟"

وہ پھر غرایا۔ دیا چپ رہی۔ مستقیم اسے گھورتا ہوا پلٹ گیا۔ وہ کمرے سے باہر بارش میں جبکہ دیا کمرے کے اندر اپنے آنسوؤں میں بھیکتی رہی تھی۔ آگ دونوں جانب لگی تھی۔ جو بجھتی ہی نہ تھی۔ مستقیم کی آنکھیں جلتی تھیں اور ہونٹوں پر لفظ سلگنے لگے تھے۔

تجدیدِ راہ رسم کے قابل نہیں تھے ہم مگر
موسمِ دل کا عم تھا قہیل کر دیا

ہم سر گئے کہ مٹ گئے جاں سے گزر گئے
دور کسی طرح سے بھی تحلیل کر دیا
مہر و وفا . سرور و محبت . شمار عشق
گرد و غبار وقت نے تحلیل کر دیا
نازک مزاج تھے کبھی پھولوں کی طرح ہم
ان حادثات . وقت نے تبدیل کر دیا

اس کے جلتے جلتے چہرے کو بھگوتی بارش ہی تو اکیلی نہ تھی۔ آنسو بھی ساتھ مل گئے تھے۔ آج اس کا شمار بھی ان بد قسمت ترین لوگوں میں ہوا تھا جو محبت پا کر پھر سے کھونے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جو ہدایت ملنے کے بعد پھر سے اندھیروں میں گم ہو جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

ظالم تھا وہ اور ظلم کی عادت بھی بہت تھی
مجبور تھے ہم بھی اس سے محبت بھی بہت تھی
واقف ہی نہ تھا ہم محبت سے وہ دارنہ
دل کے لیے تھوڑی سی عنایت بھی بہت تھی
یوں ہی نہیں مشہور . زمانہ میرا قاتل
اس شخص کو اس فن میں مہارت بھی بہت تھی

اس کے پہلو میں وہ گم صم بیٹھی تھی۔ ایسے جواری کی طرح لٹی پٹی جس نے داؤ میں آخری پہچی
بھی گنوا دی ہو۔ یہ اسی رات کے آخری پہر کی بات تھی۔ مفرور ڈاکوؤں کی بھری ہونے پر پولیس نے
اس قصبے میں چھاپہ مارا تھا اور انہیں افراتفری کے عالم میں وہ جگہ وہ ٹھکانہ چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ امانت اذلی
و قادیاری بھاتے ہوئے یہاں بھی ساتھ بھاگ گیا تھا اور اکیلے فرار ہونے کی بجائے انہیں ساتھ لینے آ
پہنچا تھا۔

دیا کچی نیند سے جاگی تھی۔ اس افتاد پر سانس لینا بھی بھولنے لگی۔ اس پر خلیفہ مستقیم کی ہے
اعتنائی کا کوئی انت ہی نہ تھا۔ وہ کیسا بے حس اور نخوت زدہ انداز لیے سوالیہ نشان بنا کھڑا تھا اس کے
سامنے۔

”اپنے فیصلے سے آگاہ کرو مجھے، میرا ساتھ بھانا ہے یا واپس جانا ہے؟“

وہ اگر محبت سے بھی ایسی آفر کرتا تو وہ نہ مانتی، یہ تو پھر ہر انداز ستم گری کا تھا۔ مگر دوسرا راستہ بھی
تو کوئی نہیں تھا۔ دکھ کی عظیم دکھ کی بات بھی یہ کہ وہ اس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر استہمال کر رہا تھا۔
اس کے اک طرف کھائی تھی دوسری جانب کانٹوں سے اٹا راستہ۔ وہ کانٹوں سے اٹا راستہ بخوشی عبور
کر لیتی اگر وہ اس کا ساتھ بھاتا۔ وہ ہی راستہ بدل گیا تھا تو اکیلی کیا کرتی وہ..... ”وہ بھی ایسی
صورت میں جب کہیں اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ اگر وہ اس کا ساتھ نہ دیتی تو حرس وہوں سے بھری اسی دنیا
توگ اس کی عزت و ناموس کی بوئیاں لوج کھاتے۔ مستقیم کے ساتھ قدم بڑھاتی تو ہر راستہ گناہ کا
راستہ تھا۔ ہر ٹھکانا شیطان کی پناہ گاہ تھا۔ بے بسی بے مائیگی، اعصابی شکستگی..... وہ جیسے پوری طرح ہار
تیرسک پڑی تھی۔

”آپ ایک احسان کر دیں مجھ پر مستقیم! مجھے مار دیں۔ بس مار کر دبا دیں مجھے اور کوئی حل نہیں
ہے میرے پاس۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور ایک لمحے کو مستقیم کا وجہہ چہرہ متغیر ہو کر رہ گیا تھا۔
”مستقیم! کیا فضول بحث میں الجھ گئے ہو یا، پولیس ہمارے سروں پر پہنچ جائے گی تب ہلو
نے امانت کی آواز تھی یا صور اسرائیل۔ وہ کرنٹ کھانے کے انداز میں بڑبڑا کر ہوش میں آیا۔ مستقیم
نے ہونٹ بچھنے تھے اور کچھ کہے بغیر اس کا ہاتھ دبوچ کر اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ وہ مزاحمت نہیں کرتی
فی کر زار و قطار روٹی ضرور تھی اور پلٹ پلٹ کر بار بار پیچھے دیکھتی تھی، پیچھے..... جہاں سب کچھ اس کا
نہا تھا۔

اس کے خواب

امیدیں

حوصلے

ہمتیں

آس تک

نگلی اور ہدایت تک۔

وہ بالکل تھی داماں، تھی دست، تھی دامن وہاں سے نکلی تھی۔ تو زندگی میں کوئی رنگ کوئی احساس
نہیں بچا تھا۔ اک بار پہلے بھی واپسی کا سفر شروع ہوا تھا۔ جس نے اسے یہ سارے اہمول تھنے بٹھے
نہیں مگر شاید وہ قدر نہیں کر پائی تھی۔ جو کبھی واپس لے لئے گئے۔ یہ بھی واپسی کا ہی سفر تھا۔ مگر یہ

ہدایت سے گمراہی کی جانب۔ جس میں کوئی خوش امید کوئی آس نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

نے ہمیں بعد مدت کے بلا کے سرد ہیں لہجے
کہ چلنا بھی نہیں ممکن پھلنا بھی نہیں ممکن
امیدیں ٹوٹ جانے سے تعلق ٹوٹ جاتے ہیں
دلوں میں حسرتیں لے کر بہلنا بھی نہیں ممکن
بہت ناکامیاں لے کر ہوئے ہیں خاک کے قیدی
چلو اب آج سے گھر سے نکلتا بھی نہیں ممکن
اے اتنا نہ سوچا کر تیری عادت نہ بن جائے
پھر ایسی عادتیں حسن بدلتا بھی نہیں ممکن

وہ ایک بہت بڑا حویلی ٹاپ گھر تھا۔ جس کے اطراف میں سبزہ سبزہ تھا۔ غیر آباد غیر شامی علاقہ۔ جہاں وہ سب آ کے اتنے مطمئن تھے جیسے ہر خطرے کی حد سے نکل آئے ہوں۔ سب سے زیادہ شائل کی چکاریاں گونجتی تھیں۔ جیسے سچ میں سب کچھ فتح کر لیا ہو اللہ جانے دنیا بھر کی سیموں سے محرم یہ مشرت کدہ کہاں سے حاصل کر لیا تھا انہوں نے یا پھر سارا کچھ پہلے سے منصوبے کے تحت تیار کیا گیا تھا۔ ان کے ٹھاٹھ دیکھنے والے تھے۔ خود مستقیم بھی یکسر تبدیل ہو گیا۔ لباس سے لے کر چلنے تک۔ اس وقت وہ بلیو جینز پہ ڈائیٹ ہاف سلوو شرت پہنے ہوئے تھا۔ آرمی کٹ اسٹائل اور فریش شیو اس کی وجاہتوں اور خورد و نوش کوئی دو آتشہ نہیں کر گئی تھی۔ اسے مطمئن اور آسودہ بھی ظاہر کرتی تھی۔ ایسے میں ایک واحد دیا تھی جس کے اندر رہی کسی زندگی بھی دم توڑتی جا رہی تھی۔

انہیں یہاں آئے آج دوسرا دن تھا اور پانی کے گھونٹ کے علاوہ اس نے حلق سے کچھ اٹار کر نہیں دیا تھا۔ وہ خلیفہ سے خفا تھی بہت خفا، مگر اسے پرواہ کہاں تھی۔ مجال ہے جو ایک بار کھانے پر ہمدرد تو دور کی بات ہے اسے دیکھا بھی ہو اس نے، بلکہ شائل کے لہک کے کہنے پر کہ تمہاری ڈیزسٹ وائف نے صبح ناشتہ کیا نہ کھانا کھایا کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔

کے جواب میں اس نے بے نیازی سے کاندھے جھٹک دیئے تھے۔
"میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ دل کرے گا تو کھالے گی۔ نہیں تو دیکھتے ہیں کب تک بھوکا رہتی ہے۔"

اور دیا پتھر اگنی تھی، منجمد، ساکن، غیر یقین، وہ کیسے یقین کر لیتی یہ وہی مستقیم تھا۔ جو اس کی مندوں کے جواب میں منت سماجتوں سے اپنا آپ ہٹان کر لیا کرتا تھا۔
"کوئی اتنا بھی بدل سکتا ہے؟"

وہ آنسوؤں کی بارش میں خود سے سوال کیے جاتی اور جواب ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا۔ مستقیم بدل گیا تھا۔ وقت بھی بدل گیا تھا۔ بس وہی نہیں بدلتی تھی۔ اس کا دل نہیں بدلتا تھا۔ مستقیم ابھی تک نہیں آیا تھا۔ رات کے دو بجے بھی، وہ کمرے میں اکیلی تھی اور ڈر اس لیے رہی تھی کہ بارش کے ساتھ بادلوں کی گڑگڑاہٹ بھی شروع ہو چکی تھی۔ مستقیم جانتا تھا۔ وہ اس طوفانی موسم سے ہراساں ہوتی ہے۔ وہ پھر بھی کمرے میں نہیں آیا تھا۔ اس کے ضبط اور صبر کی انتہا ہوئی تو اتنا کا دامن چھوڑ کر خود اس کی تلاش میں اٹھی تھی۔ پورا گھر روشنیوں سے جگمگاتا تھا۔ وہ کار پڑ سیر حیاں اتری نیچے بال میں آئی جہاں اس وقت وہ تینوں موجود تھے مگر امانت نشے میں تقریباً دھت باتھ پر چھوڑے پڑا تھا۔ مستقیم البتہ شائل کے ساتھ شطرنج کی بازی لگائے بیٹھا تھا۔ شائل شطرنج سے زیادہ کہیں بڑھ کر مستقیم میں گم لگتی تھی۔

"آج تم ہمیشہ سے کہیں زیادہ اچھے لگ رہے ہو۔ حواسوں پہ طاری ہوتے ہوئے حواس چھین لیتے ہوئے۔ شائل نے بے باکانہ انداز میں اس کی تعریف کی تھی۔ دیا کے قدم وہیں تھم گئے۔ ناگواری سے زیادہ بے بسی کا احساس اس کا گھیراؤ کرنے لگا۔ اے لگا اس میں اس کی گنجائش باقی نہیں۔

"شرم کرو کچھ تمہارا شوہر محض چند فٹ کے فاصلے پر ہے موجود اور تم۔"

"وہ بھی جانتا ہے اور تم بھی۔ کہ میں اس سے نہیں ہمیشہ سے تم سے محبت کرتی ہوں۔ یہ تو شائل ایک ڈھکوسلہ ہے تم سے قریب رہنے کا۔"

اس کی بات کاٹ کر وہ ناز سے مسکرائی تھی۔ دیا کے اندر سے بڑھی کا ابال سا اٹھا وہ مستقیم کے جواب کا انتظار کیے بنا تھملائی ہوئی ان کے سروں سرچڑھی تھی۔

"خلیفہ۔۔۔ میں کب سے انتظار کر رہی ہوں آپ کا کمرے میں اور آپ یہاں اس فضول کام میں منہ ہیں۔"

اس کے لہجے میں غیر شعوری طور پر اس رشتے اور محبت کا استحقاق در آیا تھا جو ان کے درمیان قائم ہو چکا تھا۔ شائل پہ جو اس نے جھلسی نگاہ ڈالی تھی اس میں کچھ جھٹلایا گیا تھا۔ مستقیم نے چونک کر دیا دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا۔ مستقیم کے نقوش میں عجیب سا تباہ و اترا آیا۔

"میں نے تمہیں انتظار کو نہیں کہا۔ آ جاؤں گا جب میرا دل چاہا۔ تم جاؤ۔"

”وہ بے حد سرد آواز میں کہہ کر پھر اپنے فٹل میں مصروف ہوا تھا۔ دیا کو اس کے جواب سے زیادہ شائیل کی حرکت نے بھڑبھڑایا تھا۔ جو محض اس پر اپنی حیثیت واضح کرنے کو سرک کر مستقیم کے پہلو سے تقریباً چپک گئی تھی اور مستقیم نے جواب میں کسی قسم کی کوئی ناگواری ظاہر نہیں کی تھی۔ دیا کو لگا اس کے دماغ کی رگیں تن گئی ہیں اور کسی بھی لمحے پھٹ جائیں گی۔ اپنے بے وقتی اور سکی کا احساس آنکھوں میں آنسو بھرنے لگا۔

اتنی بے رحمی

اتنی تذلیل

اتنی دھتکار

اس کا دل چاہا مستقیم سمیت ہر شے کو ملیا میٹ کر کے ہر شے پر قہقہہ دے۔ اس کا دل یہ بھی چاہا وہ چیخے روئے اور مستقیم کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑے اور کہے۔

”محبت کے جھوٹے دعویدار محبت تم نے نہیں کی۔ میں نے کی ہے۔ محبت چھیننے کا نہیں محبت تو دینے کا نام ہے۔ تم نے صرف چھیننا، میں نے بس دیا مگر وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکی۔ اس میں تو شائیل کو بھی دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ جو اسے جلتا جلتا فاحشہ نظروں میں تسخیر بھر کے دیکھتی نہیں گھورتی تھی۔ ہاں وہ واقعی جیت گئی تھی۔ ورنہ وہی تھی جس کی جسارت پہ خلیفہ نے اسے طمانچہ رسید کیا تھا اور دیا کو ہزاروں دھماحتوں کے بعد کتنی منت سے منایا تھا۔ پرانی یادیں زخم ہی نہیں کر دیتی تھیں۔ آنکھوں میں لہجہ بھی بھرتی تھیں۔ کیسی بے بسی اور بے اختیار تھی۔ نہ آگے جانے کا کوئی راستہ تھا نہ پیچھے ہٹنے کا۔ اسے لگا وہ دیکھی پہلے نہیں تھی۔ اب ہوئی ہے۔ عمر بھر کی تھی اور محرومی کے ساتھ احساس زیاں اس کی جھولی میں آگرا تھا۔ روح میں کیسا تنگ احساس جاگا جھلکتی آنکھیں لیے وہ تیزی سے پلٹ کر واپس بھاگی اور جب سے اسے گھور کر دیکھتا ہوا مستقیم میز میوں کے موڑ پہ اسے غائب ہوتا پا کر شائیل کی جانب متوجہ ہوا تو بے حد متفرانہ انداز میں اسے جھٹک کر خود سے دور بنایا تھا۔

”کتنی بار سمجھاؤں۔ میرے ساتھ اک حد نہیں رہا کرو۔“

وہ غرایا تھا آنکھیں کسی خون آشام درندے کی مانند سنگ رہی تھیں۔ وہ خائف ہوئے غمزدہ مسکرائی گویا کہہ رہی ہو۔ تمہاری کمزوری کو پا چکی ہوں۔ اگر تمہیں دیا سے امداد ملے آئی ہوں تو اب خود سے اتنا قریب لانے میں بھی ضرور کامیاب ہو جاؤں گی۔ بس تم دیکھتے رہو۔ مستقیم اس کی نظروں کی حکایت پڑھ کر ہی برا فروخت ہوا تھا۔

”دفع ہو جاؤ۔“

جواباً وہ مسکرائی اور کاندھے جھٹک دیے۔ مستقیم واپس سیدھا سیدھا لٹ گیا اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

”اب میں زندگی کے کسی مقام پہ تمہارے سامنے نہیں جھکوں گا دیا! تمہیں جھکنا ہے۔ میں بے فکر ہوں کہ تمہارے سارے راستے واپسی کے بند ہو چکے۔ پھر میں تمہیں اپنی کمزوری کیوں بتاؤں کہ تم مجھے اپنے اشاروں پر نچا سکو۔ نہیں اب وہ ہوگا جو میں چاہوں گا اور تم وہ کرو گی۔ کیسے؟ یہ تم آہستہ آہستہ جان جاؤ گی۔“

☆ ☆ ☆

وہ واقعی بدل گیا تھا۔ بچی کبھی انسانیت بھی اندر سے کھرچ چھینکی تھی۔ اب وہ محض ایک لیبر تھا۔ لیبر جسے اپنے پرانے کی تیز نہیں رہتی۔ جس کے پیش نظر اپنا مفاد اہم پیدا کرتا ہے۔ اس رات ہواؤں کے طوفانی جھکڑ اس کے کمرے کی کمز کیوں سے نکراتے اور آواز بکارت کرتے گویا اسے بدنامی میں دیتے رہے۔ مگر اس کا دل نہیں کانپا۔ اسے معلوم تھا دیا کو اس کی ضرورت ہے مگر وہ اس کے پاس نہیں گیا۔ وہ اسے پوری طرح بے امید کر دینا چاہتا تھا۔ پوری طرح توڑ دینا چاہتا تھا تاکہ از سر نو اس کی تعمیر کر سکے۔ اپنی مرضی کی تعمیر۔

☆ ☆ ☆

بارش زور پکڑ چکی تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ آندھی اور طوفان کے جھکڑ یوں چل رہے تھے۔ گویا درختوں کو جڑ سے اکھاڑنے کا عزم کر چکے ہوں۔ ہوا کی شائیں شائیں چابک کی طرح پودوں، فوسوں اور مکانات کی دیواروں پر ضربیں لگا رہی تھی۔ بادلوں کی تھن گرج میں کہیں کہیں کسی جانور کی بھی ہوئی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ ایسا ہی طوفان اس کے اندر بھی اند آیا تھا۔ اس سے بھی کہیں ٹھہرے۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آتی تھی مستقیم کے رویے کی۔ اپنی من مانی کر کے بھی وہ آخر اس سے خفا کیا۔ تو روٹھا ہوا کیوں تھا۔ ان طرح ایک بار پھر اپنی ذات کے گنبد میں کیوں بند ہو چکا تھا کہ اول تو اس تک پہنچ نہیں پاری تھی۔ پہنچ بھی جاتی تو بند دروازے پر بس دستک ہی دیتی رہتی۔ جیسے ابھی اسے بچی تھی وہ دروازہ کھولنے پہ آمادہ نہیں تھا۔

اس لمحے بہت زوردار طریقے سے بجلی کڑکی۔ کڑک اتنی زوردار تھی کہ وہ کسی طرح بھی خود پر قابو نہ ہو سکی اور خود میں سُلٹی ہوئی بے اختیار چیخ مار کر بلند آواز سے روتی چلی گئی جانے کتنی دیر وہ یونہی

بکھرتی اور سنتی رہی تھی پھر خود کو سنبھال کر اٹھی اور وضو کر کے قبلہ رخ کھڑی ہو گئی۔ یہ وقت تہجد تھا۔ دعاؤں کی قبولیت کا وقت۔ وہ رب سے ہی مانگنے کی عادی رہی تھی ہمیشہ۔ اس وقت بھی اسی پاک ذات کے حضور ہاتھ پھیلا دیے۔ آنسو زار و قطار بہنے لگے جو اس کے شدید غم کے مظہر تھے۔

”اے خدا مجھے صبر اور استقامت عطا فرما!“

”اے خدا مجھے صبر اور استقامت عطا فرما! اگر یہ آزمائش ہے تو سرخرو ہونے کا موقع دے۔ اگر ظلم ہے تو ظالم کے ذہن میں ہدایت اور عدل کی روشنی اتار دے۔ اگر یہ میرے گناہوں کی سزا ہے تو مجھے کفار ادا کرنے کی توفیق سے نواز دے اور اگر تیری رضا ہے۔ میری تقدیر کا باب ہے تو پھر مجھے اپنی رضا پر راضی اور خوش ہونے کی توفیق عطا فرما دے۔ مالک اندھیروں سے روشنی اور روشنی سے ہر اندھیروں کا سفر مجھے تیری ناراضی اور اپنی کوتاہیوں کے سوا کچھ نہیں لگتا۔ مجھے معاف فرما اور ایسے نازک وقت میں اکیلا نہ چھوڑ۔ رہنمائی فرما، اور مدد فرما، کہ تیری مدد کے بغیر میں کچھ بھی اچھا نہیں کر پاؤں گی۔“

آنسو ابل رہے تھے اور قلب و جاں کی کشاف و حلی جاری رہی تھی۔ دعا کے بعد وہ وہیں کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی تو آنکھ دوبارہ اس وقت کھلی جب صبح کا اندھیرا اجالے میں بدل رہا تھا۔ دیا نے جلنے میں پھر وضو کیا اور نماز فجر ادا کی تھی۔ اس کے بعد کمرے سے نکل آئی۔ اس کا رخ کچن کی جانب تھا۔ حالات کے سامنے اگر اس نے شکست تسلیم نہیں بھی کی تھی تو اپنی اکثر بھی برقرار نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ پہلے بھی اس نے خلیفہ کو محبت اور خدمت سے ہی جیتا تھا۔ وہ اب بھی اسی طرح بازی چلنا چاہتی تھی۔ اس کا ارادہ ان سب کے لیے ناشتہ بنانے کا ہی تھا مگر پہلے ہی مرحلے پہ اس کا سامنا اسی دشمن جاں سے ہو گیا تھا۔ اہلی ہوئی چائے کو چھان کھگ میں ڈالتا ہوا وہ صبح کے اس نوخیز اجالے میں اپنی تمام تر دلکشی اور خوب روئی سمیت ہرگز بھی اتنا کھنور نہیں لگ رہا تھا جیسا آج کل ہو چکا تھا۔

”مجھے پتا تھا۔ تم شکست تسلیم کر لو گی۔ کھانا ایسی ہی اپنی بنیادی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر گزارہ نہیں ہے ڈیر وائف!“ رخ پھیرتے ہی اسے رو برو پا کے وہ اچھا خاصا چونکا تھا۔ پھر مسکراہٹ دباتے ہوئے گویا اک ساتھ اسے بہت کچھ بتلایا۔ دیا غم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”اچھا کیا نا۔ میں نے منت ساجت میں وقت ضائع نہیں کیا۔ ویسے بھی اب تم میرے بچے کو اپنی فضول ضد سے کیا نقصان پہنچا سکو گی۔ چند دن میں پھر وہ تمہارے قبضے سے نکل کر میری تحویل میں ہو گا اور میں اسے اپنے انداز میں پروان چڑھاؤں گا۔ ایک ڈاکو کے بچے کو اس سے بڑا ڈاکو بنانا چاہیے

ہے ناں؟“

اس کی آنکھوں میں جھانکتا اک اک لفظ چبا کر کہتا وہ کہیں سے بھی پہلے والا مستقیم نہیں تھا۔ دیا کی آنکھیں جھلک گئیں۔ بے بسی کے مظہر آنسو گال بھگونے لگے۔

”آپ اتنا کیسے بدل سکتے ہیں مستقیم؟“

وہ جیسے کراہی تھی۔ جو ابادہ بے رحم انداز میں ہنسا رہا۔

”میں درحقیقت یہی تھا۔ تم نے مجھے میں غلطی کی ہے بس۔ ساری دنیا مفاد پرست ہے۔ میں نے کیا انوکھا کیا۔ کون ہے جو اپنی غرض کا غلام نہیں ہے؟ امانت کو دیکھا تم نے؟ کیا کیا ہے اس نے؟ میں نے اگر یہ کر لیا تو کیا ستم ہو گیا۔“

اب کے وہیو انہیں پھنکا رہا تھا۔ دیا ساکن کھڑی رہی۔

”اپنے کمرے کی الماری کھول کر دیکھو۔ پیش قسمت ملبوسات سے بھری پڑی ہے۔ کوئی ڈھنگ کا لباس پہن لینا۔ ذرا شکل نکل آئے گی۔ ورنہ تمہاری شکایتوں میں اک اور کا اضافہ ہو جائے گا کہ میں تمہاری بجائے شامل کو کیوں دیکھنے لگا ہوں اب۔“

چانے کالگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگائے ہوئے بے رخی سے کہتا وہ مڑ کر کچن سے نکل گیا۔ دیا کا سکتہ یہ گہرا ہو گیا تھا۔ بے شری اگر ڈھنائی اختیار کر لے تو پھر اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا مشکل نہیں ہی نہیں ناممکن بھی ہو جایا کرتا ہے۔ دیا کو لگا اس کی امیدیں ڈمکاتے لگی ہوں۔ وہ ہار سے اور قریب ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

داوی کی طبیعت ایک دم سے خراب ہو گئی تھی۔ اتنی کہ ان کے ہاتھ پیر ہی پھول کر رہ گئے۔ کچھ نہ بچا تو محلے کے لڑکے کو دوڑا کر ٹیکسی منگوائی اور ہسپتال لے کر بھاگیں۔ وہاں جا کے خیال آیا۔ ذی شان داس کے بابا کو بھی تو خبر کرنی چاہیے۔ تب معلوم ہوا افراتفری میں میں فون بھی گھری بھول آئی ہیں۔

سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ اب انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایسی ضرورت ان کی رہنمائی پہ کی پوری ہو سکتی ہے۔ دواؤں کا پرچا ہاتھ میں پکڑے پریشان حال سی وہ گیٹ پہ موجود چوکیدار سے کسی قسمی فون بوتھ کا پوچھ رہی تھیں۔ جب پاس سے گزرتے عبدل ماجد کی نگاہ ان پر پڑی تھی اور وہ خود ان کی جانب بڑھنے اور اپنی خدمات پیش کرنے سے کسی طرح باز نہیں رکھ سکے تھے۔ چمڑ کر پھر ہنسنے والے نے انہیں اتنا ہی تہدیل کر دیا تھا کہ وہ سر راہ بھی یونہی خدمت خلق کے لیے خود کو وقف کر چکے تھے اور بدلے میں بس ایسی کی واپسی، اسی کے ملنے کی دعا کی انتہاس کیا کرتے۔ اس کی ماں نے تو

عرسہ ہوا مستقل بستر سنبھال کر ان کی پشیمانی اور احساس جرم کو وہ کوڑا بنا دیا تھا جو برستا تھا تو اپنی سفاکی و بے رحمی پر وحیان نہیں لگاتا تھا۔

ہر لمحہ موت کے قریب ہوتی اور زندگی سے مایوس ہوتی وہ عورت اب ان سے جھگڑنا اور شکوہ کرنا بھی چھوڑ چکی تھی۔

”آپ کا بہت شکریہ بھائی صاحب! دراصل پریشانی میں گھر سے نکلتے اس بنیادی ضرورت کا خیال نہ رکھ سکی۔“ ذیشان اور اس کے بابا دونوں کو ہی کال کر کے صورت حال بتانے کے بعد ان کا ٹیل فون انہیں واپس کرتیں وہ ممنون و مشکور سی کہہ رہی تھیں۔ عبدل ماجد رواداری سے مسکرا دیے۔

”آپ کی والدہ ہیں ہاسٹل پر؟“

ٹیل فون کوٹ کی جیب میں رکھتے وہ سوال کر رہے تھے۔

”نہیں میری ساس ہیں۔ ابھی کچھ دیر میں میرا بیٹا اور شوہر پہنچ جائیں گے۔ آپ کا بہت شکریہ“ وہ پھر سے مشکور ہوئیں۔

”مجھے شرمندہ کیوں کر رہی ہیں بہن! آپ۔ اتنا بڑا احساس تو نہیں کیا ہے۔ اگر آپ پرانے مانیں تو میں عیادت کر لوں آپ کی ساس صاحبہ کی؟ دراصل میری زوجہ بیٹیں زیرِ علاج ہیں۔ میں انہی کے ساتھ ہوں ادھر۔“

وہ نرمی سے بتا رہے تھے۔ امی خفیف سی ہو گئیں۔

”کیوں نہیں بھائی صاحب! ضرور میں بھی بھابھی کی طبیعت پوچھ لوں گی۔ بس ذرا ذیشان کے بابا آجائیں۔ ویسے بھابھی صاحبہ کو ہوا کیا ہے؟“

”بظاہر تو کوئی بھی مرض نہیں ہے۔ سوائے مایوسی کے اور اس سے بڑھ کر کوئی علاج لاوا بھی نہیں۔“

وہ دل گرفتہ اور مضطرب نظر آنے لگی۔ انہوں نے حیرانی سے اس مالدار سوہرے پر مگر بے حد عاجز نظر آنے والے شاندار آدمی کو دیکھا تھا۔

”معذرت خواہ ہوں۔ میں سمجھی نہیں آپ کی بات کا مطلب۔“

وہ دوائیں لانا بھی بھول گئی تھیں۔

”بہت سال ہوئے ہمارا اکلوتا بیٹا حادثاتی طور پر چھڑ گیا تھا ہم سے۔ تمام امیدوں کا مرکز و محور نونا تو زندگی جینے کی کوئی آس نہیں رہی۔ وہ اس مایوسی کا شکار ہیں۔“

ان کا مدہم لہجہ اس بل بہت شگفتہ ہو رہا تھا۔ وہ جیسے کہیں پاتال میں گرتی چلی گئیں۔ مٹی تو ان کی ہی حادثاتی طور پر ہی چھڑی تھی ان سے۔ مگر پھر خدا کا کرم ہوا تھا۔ ان کی خواہش اور دعا کے بغیر معجزہ ہوا اور وہ واپس بھی مل گئی۔ جسے خود انہوں نے ٹھکرا دیا۔ بھلا دیا۔ کوئی ایسا بھی کرتا ہے؟ وہ بھی اک۔ اس سوال کا جواب ہی نہ ملتا تھا۔ مائیں ایسا تو نہیں کرتیں جو انہوں نے کیا تھا۔ مائیں تو بے بس ہوتیں ہیں۔ جیسے ابھی اس ماں کی داستان الم سنی تھی انہوں نے۔ مائیں تو وادی جیسی نہیں ہیں۔ جوان سے ان کا مجرمانہ قلم سن کر چپ چاپ کھلتی جا رہی تھیں۔ اس زیادتی کا ازالہ نہ ہو سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

جو میری آنکھوں پہ مرتا تھا
میری باتوں پر ہنستا تھا
نہ جانے فحش تھا کیا
مجھے کھونے سے ڈرتا تھا
وہ جب بھی بات کرتا تھا
یہی ہر بار کہتا تھا
تم مجھ سے پیار کرتے ہو
میں جب بھی رونٹہ جاتی تو
وہ ایسے تڑپا جاتا تھا
مجھے یہی وہ کہتا تھا
اگر میں بھول جاؤں تو
اگر میں رونٹہ جاؤں تو
کبھی واپس نہ آؤں تو
بھلا پاؤ گے سب کچھ کیا؟
یونہی ہنستے رہو گے کیا؟
یونہی جتے رہو گے کیا؟
یہی باتیں تھیں بس اس کی

یہی یادیں تھیں بس اس کی
مجھے معلوم ہے بس اتنا
مجھے وہ پیار کرتا تھا
مجھے کھونے سے ڈرتا تھا

وہ سارے حوصلے اور ہمتیں مستقیم کے رویے کی بے اعتنائی کی ایک شوکر سے ریزہ ریزہ ہو کر
بکھری تھیں۔ کچھ اس طرح کہ وہ خود کو سنبھال نہیں سکی تھی اور بستر سے نہیں اٹھ سکی۔ کچھ اتنے دنوں کی
بھوکے رہنے کی ثقاہت۔ باقی اس کی بے اعتنائی ہی کافی تھی اسے مار ڈالنے کے لیے۔ اس کی
آنکھیں اس وقت بھی خاموشی سے بہہ رہی تھیں جب خلیفہ مستقیم کسی کام سے اندر آیا تھا۔ اس پر کچھ
انہی تو چند ثانیوں کو جیسے اپنی جگہ سے ہٹنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔
"کیا ہوا ہے تمہیں؟"

وہ خود کو اس کے پاس آنے سے روک نہیں سکا۔ آواز اور چہرے پر عجیب سی بے چارگی کا
احساس تھا۔ کچھ کہے بغیر دیا کی سسکیاں ہچکیوں میں بدلنے لگیں۔ مستقیم بھیچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ
اس کے پاس آ کر بیڈ کی پٹی سے ٹک گیا۔

"ٹپ کر رکھا ہے ناں کہ مجھ سے مخالف چلتا ہے۔ اتنی ضدی کیوں ہو تم؟" وہ اب بھی نہیں کچھ
بولی۔ اس کے بہتے ہوئے آنسو گویا جتنی بھری کہانی یاد کراتے تھے۔

جو پکارتا تھا ہر گھڑی
جو جوتا تھا لڑی لڑی
کوئی ایسا شخص اگر کبھی
مجھے بھول جائے تو کیا کروں

وہ اس کی جانب سے رخ پھیر کر گھٹ گھٹ کے رونے لگی۔ مستقیم ہونٹ بھیچے جیسے بیٹھا تھا۔
ویسے ہی اٹھ کر چلا گیا۔ دیا کے بہتے آنسو منجمد ہونے لگے۔ اس نے جانا تھا۔ شاید اب مستقیم کو اس کی
بالکل بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یہ احساس بہت روہانسا کر دینے والا تھا۔ بہت گہرائی تک خالی کر
دینے والا۔ مار ڈالنے کو کافی۔

☆ ☆ ☆

میرا محسن وفا کا یوں صلہ مانگتا ہے

جیسے سورج کی جگنو سے ضیا مانگتا ہے
میرے بے نور خیالوں کو اجالا دے کر
وہ میرے کچے گہرندوں کا دیا مانگتا ہے
مانند دل جسے سینے میں دھڑکتا پاؤں
جانے کیوں مجھ سے چھڑنے کی دُعا مانگتا ہے
ازل سے جس کو محبت کا پیہر جانا
وہ میری بے لوث محبت سے پناہ مانگتا ہے
وہ جانا تھا محبت کے سبھی اوقاف رموز
پھر بھی اس کھیل میں مجھ سے نفع مانگتا ہے

اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ مگر وہ خلیفہ سے کچھ کہنے میں متامل تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی
ب کیا ہو گا۔ کیا وہ اسے ہاسپٹل لے جاسکتا تھا یا پھر یہیں کسی لیزی ڈاکٹر کا انتظام کرتا۔ اس کے اندر
ذات سرائی تھی۔ ایسی بغاوت جو اس کے ساتھ ساتھ مستقیم کو بھی برباد کر دے۔ ایسا پچھتاوا جو عمر
بھر ساتھ رہے۔ وہ اس کے بیٹے کو اپنے جیسا بنانا چاہتا تھا۔ یعنی ڈاکٹر، لیسر، غاصب، چور۔

یہی نہیں چاہتی تھی وہ اپنے ساتھ وہ اس بچے کو بھی مار ڈالے گی۔ مستقیم کی بد عہدی بے وفائی کی
اسے اس سے بڑھ کر کیا سزا مل سکتی تھی۔ دکھ اور مایوسی نے اسے جنونی بنا ڈالا تھا۔ اس کے پہلو میں درد
کی ہریں اٹھ رہی تھیں جنہیں خود پہ ضبط کرتی وہ برداشت کر رہی تھی مگر اس کی یہ بیجانی کیفیت زیادہ
بے قرار نہیں رہ سکی۔ اس نے اپنے آس پاس مخصوص بالکل اور افراتفری ہی محسوس کی۔ اسے سمجھنے میں
ہونے میں قطعی دشواری نہیں ہوئی۔ ٹھکانا بدل لینے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ لوگ اس ارادے
سے اٹھنے والے تھے۔ خود خلیفہ بھی۔ یعنی ایسی کیفیت میں جبکہ اسے دیا کی طبیعت خرابی کا بھی علم نہیں تھا
اس کا یہاں سے کئی گھنٹوں کے لیے غائب ہو جانے کا خیال بہت ہی سنسنی خیز خوف میں مبتلا کر دینے
والا تھا۔ دیا کو اپنی کچھ لمحوں قبل کی شدید سوچ یکسر بھول گئی۔

"خلیفہ.....!!!"

وہ بہت غلٹ میں اندر آیا تھا اپنے ہی کسی کام سے جب دیا نے بے ساختہ اسے پکارا۔ وہ رکا تھا
مگر پت کر اسے نہیں دیکھا اور آگے بڑھ کر الماری کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

مستقیم نہیں سمجھ سکتا تھا۔

”تم اسے ہینڈل کر سکتی ہو شامل یا۔۔۔؟“

”کیسی باتیں کرتے ہوئے خلیفہ مستقیم ابے فکر ہو کر جاؤ۔ واپسی پر خوشخبری تمہاری منتظر ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں اک عجیب سی چمک اتر آئی۔ ایسی جیسے اپنا شکار جال میں پھنسا دیکھ کر کسی درندے کی آنکھوں میں اتر آیا کرتی ہے۔ دیا کی یونٹی بے قراری نگاہ اس پر جا پڑی تھی جو وحشت بھرا خوف سیٹ لائی۔ اس نے بے اختیار خلیفہ کا ہاتھ اپنے کانپتے ہاتھ میں دبوچا تھا۔

”مم۔۔۔۔۔ مجھے ہاسپٹل لے جائیں مستقیم!“

”دماغ ٹھیک ہے؟ جو حالت ہے تمہاری اور جتنا دور ہے ہاسپٹل راستے میں ہی جان ہار دوگی۔“ شامل نے بلا دروغی اسے جھاڑ پلائی تھی۔ دیا کی سانسیں ڈوبنے سی لگیں۔ اس نے بے چارگی کے عالم میں خلیفہ مستقیم کو دیکھا تھا۔ جو امانت کے اشارہ کرنے پر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”پلیز خلیفہ! مجھے چھوڑ کر مت جائیں پلیز!“

وہ کچھ اس شدت سے ایسی بے قراری سے روئی کہ مستقیم بے چین ہونے لگا تھا۔

”تم جاؤ خلیفہ! اسے میں سنبھال لوں گی۔“

شامل نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے خلیفہ کا ہاتھ چھڑوایا۔ جسے وہ چھوڑنے پہ آمادہ نظر نہیں آتی تھی۔

”میں مرجاؤں گی خلیفہ! مجھے ڈر لگ رہا ہے پلیز مجھے اکیلا نہ چھوڑیں۔“

آنسو آجیں، سسکیاں، خلیفہ کا مضبوط دل سینے کے اندر ڈولنے لگا۔

”یہ ہمارا سپلاشمن ہے خلیفہ! اور اسی قدر اہم بھی اور میں ہرگز بھی اسے کسی جذبات کی نذر نہ دے نہیں دیکھ سکتا۔“

امانت کا موڈ آف ہونے لگا تھا اسے متاثر و متذبذب دیکھ کے، خلیفہ کا چہرہ اچھا خاصا پیکا ہوا۔ اب وہ نہیں تھا برادر، امانت تھا اور خلیفہ اس کے حکم کا پابند بھی

”تم چلو۔ آتا ہوں میں پانچ منٹ میں۔“

وہ امانت سے نظریں چار کیے بنا بولا تھا۔ دیا کی سانسیں اٹھ پھل ہو رہی تھیں۔ وہ بڑی مشکل سے حلق سے اندنی جھینیں دہاتی تھی۔

”دیا!!!! تھوڑی دیر کی بات ہے میری جان! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حوصلہ کرو۔“

اس کی آواز خدشات، خوف اور تکلیف کی شدت سے کانپتی تھی۔

”جب ایک بات کا پتا ہے تو پھر بے کار سوالوں کا مقصد؟“

خلیفہ پہلے ہی ہڑا بیٹھا تھا۔ اسی لحاظ سے اوندھا جواب دیا۔ دیا نے برا نہیں منایا۔ آگے بڑھ کر اس کے قریب آگئی۔

”جہاں بھی جا رہے ہیں مستقیم! مت جائیے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

اس کی آواز ہی نہیں کانپتی تھی۔ وہ خود بھی لرز رہی تھی۔ اس کا زرد ہوا چہرہ ہر لمحہ پسینوں میں ڈوب رہا تھا۔ مستقیم اسے دیکھتے ہوئے چونک کر رہ گیا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے؟“

اس کے لہجے میں انداز میں جھنجھلاہٹ اتر آئی۔ دیا نے جواب نہیں دیا۔ ہونٹ کانپتی رہی وہ سچی رہی۔

”رکھو ذرا۔۔۔۔۔ آتا ہوں میں۔“

وہ تیزی سے پلٹا تھا جب دیا گھبراہٹ زدہ انداز میں اس کے بازو سے پٹ گئی تھی۔

”مجھے چھوڑ کے مت جائیں مستقیم! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

وہ جیسے بجلی تھی۔ مستقیم اسی لحاظ سے جھلا گیا۔

”پاگل ہو دیا! چھوڑو مجھے۔“

وہ اس پر برسر تھا۔ پھر پوری قوت سے وہیں کھڑا کھڑا دھاڑا۔

”شامل۔۔۔۔۔ شامل!!!!“

دیا کھڑے سے لڑکھڑا کر نیچے بیٹھ گئی۔ مستقیم فطری طور پر اضطراب کا شکار ہوا تھا۔

”دیا! سنبھالو خود کو، شامل ہے نا، وہ لینڈی ہیلتھ ورکر رہ چکی ہے۔ یہ اس کے لیے مشکل کام نہیں ہوگا۔“

وہ لمبے لمبے سانس بھر رہی تھی جب مستقیم نے اس کا پسینوں میں بھیکتا چہرہ تھپتھا کر قسلی سے نوازا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا۔ جب امانت کے ساتھ شامل نے بھی اندر قدم رکھا تھا اور دیا کے اوپر محض ایک

نگاہ ڈال کر ہی وہ صورت حال کو سمجھ کر جیسے سترانے لگی تھی۔

”اس کا مطلب تمہارا بچہ بالآخر آ رہا ہے دنیا میں۔“

اس کے لہجے میں عجیب سی کٹ گئی اور جھین کے ساتھ رقابت کا بھی احساس تھا۔ جسے ظاہر ہے

وہ اس کا گال بہت نرمی اور رسان سے تھپک رہا تھا۔ اور امید اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔
نے ڈوبتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور نقاب بہت بھرے انداز میں سر ایک جانب ڈال دیا۔

”میں مر رہی ہوں مستقیم! اگر میں مر گئی تو.....“

خلیفہ!!! تم آتے کیوں نہیں ہو؟“

باہر سے امانت کی وحازہ ابھری تھی جس نے دیا کی آواز کو دہلایا تھا۔

”اللہ سب بہتر کرے گا۔ بس ہمت سے کام لینا۔ پھر ملیں گے۔ فی امان اللہ! وہ اس کا ہاتھ دھا کر پھر اسے چومتا ہوا پلٹ کر تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ دیا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یوں جیسے یقین نہ آتا ہو وہ ایسی بے بسی کی کیفیت میں چھوڑ کے جاسکتا ہے۔ اس کے چہرے پر پہچان سادہ آیا۔ درندوں کی ہستی میں اپنے تنہا رہ جانے کے وحشت انگیز خیال کے باعث۔ شامل اسے اپنی جانب آتی نظر آئی تو اس پہ موت کی فحشی طاری ہونے لگی۔ اسے وہ مسیحا نہیں موت کا فرشتہ لگی تھی۔ جو جان لے کر ہی ملتا ہے۔ وہ اس کی نفرت، اس کی کدورت اور رقابت محسوس کر چکی تھی۔ اسے لگا تھا اس بے رحم سفاک عورت کو کھل کر کھیلنے کا موقع میسر آ گیا ہو۔

☆.....☆.....☆

ہو انہیں مجھ سے تو کہہ گئی ہیں تیری اداسی کا حال سارا
عذاب بن کے ہے تم پہ گزرا میری طرح سے یہ سال سارا
یہ آئینے کی دکان سجا کر تم اس مگر میں تو آگئے ہو
یہ پتھروں سے بنے ہیں چہرے بکھیر ڈالیں نہ مال سارا
مقدروں کا یہ کھیل دیکھو برس رہی ہے وہ سنگ بن کر
ہم نے بخشا تھا جس زباں کو یہ گفتگو کا کمال سارا
بتاؤ ساگر یہ کیا ہوا ہے۔ یہ کس نے چھینا ہے روپ تیرا
تھا آئینوں کو بھی رشک جس پر کہاں گیا وہ جمال تیرا

وہ اضطراب میں بار بار پہلو بدلتا تھا اور ہر لمحہ گاڑی کی اسپینڈ بڑھاتے ہوئے اک نظر پلٹ کر دیا کو بھی دیکھ لیتا۔ جو بالکل ساکن تھی۔ لانی پلکیں ایسے گالوں پر مگر پڑی تھیں جیسے کبھی نہ پھراٹنے کا پتہ عزم کر بیٹھی ہوں۔ مستقیم کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ وہ اس سے خفا ہوا تھا تو وہ جان دینے کا حل مل گئی تھی۔ واقعی بہت عجیب تھی وہ۔

”یا اللہ! دیا کو کچھ نہ ہونے دینا۔ ورنہ میں کبھی خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔“

اس کا دل بھی جیسے رو پڑا تھا۔ وہاں سے وہ جس کیفیت میں نکلا تھا۔ اپنی گن و ہیں بھول گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد امانت کو رکھنے کا اشارہ کرتا ہوا اس کی خفگی اور بڑبڑاہٹ کی پرواہ کیے بغیر واپس اندر دوڑا تھا۔ عجیب سی بے قراری نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ یہ حقیقت تھی اگر اس کے بس میں ہوتا تو دیا کے پاس رکتا۔ ہر گز بھی نہ جاتا۔ لیکن اب بہت کچھ اس کے بس میں ہی تو نہیں رہا تھا۔ غم و غصے، مایوسی میں اٹھا ہوا ایک جذباتی قدم اسے ہی نہیں شاید اس کی نسلوں کو بھی رہن رکھوا چکا تھا۔ اسے ایک دم سے بہت سارے پچھتاوے نے آن لیا۔ اس کا دل چاہا ہر شے پر لعنت بھیجے اور دیا کو لے کر وہاں سے بھاگ جائے۔

”اللہ کے لیے..... رحم کرو مجھ پہ، میں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا، میری تم سے کوئی دشمنی بھی نہیں۔ پھر کس بات کا بدلہ لے رہی ہو مجھ سے۔“

ابھی وہ دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا جب اس نے دیا کی درد میں ڈوبی آنسوؤں سے بھگی نقاب زدہ سکتی آواز سنی تھی۔ اسے کیا سمجھ آئی وہ اس طرح سے گزرا کر کس کی منت کر سکتی ہے۔

کس بات کا بدلہ لے رہی ہوں تم سے؟ بد بخت عورت! تم سے بڑھ کر بھی کوئی غاصب ہوگا؟
خلیفہ چھینا ہے تم نے مجھ سے۔ میری محبت تھا وہ۔ تمہاری آمد سے قبل تک اگر وہ میرا نہیں تھا تو کسی اور کا بھی تو نہ تھا۔ یہ اطمینان کافی تھا میرے لیے۔ مگر تم..... تم نے قبضہ کر لیا اس پر۔ دن رات کانتوں پر سوئی ہوں اس خیال کے ساتھ کہ وہ تم سے قریب ہوگا۔ لمحہ لمحہ زہر پیا ہے اور اس دن کا انتظار کیا ہے۔ اب رحم کروں تم پر؟“

وہ ہذیانی قہقہے لگا رہی تھی اور دروازے کے باہر خلیفہ مستقیم پتھر پڑتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے دیا کی جلتی ہوئی کرب آلود سسکیاں بھی ہوش میں نہیں لائیں تھیں۔

”میں ہاتھ بھی نہیں لاؤں گی تمہیں تو قتل کیسے میرے سر ہوگا تمہارا۔ تم مر جاؤ گی تو خلیفہ مستقیم کو برا ہونے سے کون روک سکے گا۔؟ اندازہ کرو اگر میں اپنی حکمت عملی سے امانت سے الگ ہو جانے لے خلیفہ کو پھر سے واپس لاسکتی ہوں تو میں اگلا قدم کیسے نہیں اٹھا سکتی۔“

☆.....☆.....☆

آخری حصہ

وہ شیطان کی ہر کاروبانی سماعتوں میں آگ اتار رہی تھی۔ وہ بہت ہڑبڑا کر ہوش میں آیا۔ جب اس نے دیا کی گھٹی گھٹی چیخ سنی تھی اور اس کے بعد شامل کے وحشیانہ قہقہے، پھر خلیفہ کو یاد نہیں رہا تھا۔ اس نے شامل کی کیا درگت بنائی یا نیم بے ہوش دیا کو وہاں سے اٹھا کر کیسے واپس گیٹ تک پہنچا تھا۔

”باہر نکل جاؤ گاڑی سے امانت اور نہ میں کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔“

دیا کو پھیلی سیٹ پر لٹانے کے بعد اس نے امانت کے ایک ساتھی سے جھپٹ کر رائفل چھین لی تھی اور انہیں نشانے کی زد پر لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا اور لہجہ و انداز مرنے مارنے پر آمادہ، امانت اگر معاملے کو نہیں بھی سمجھا تب بھی اس نے مصلحت کوئی سے اس کے حکم کی تعمیل کی تھی اور ساتھیوں سمیت اتر کر سائینڈ پر کھڑا ہو گیا۔ مستقیم نے رائفل چھین لی اور گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اگلے لمحے گاڑی فرار سے بھر رہی تھی۔ سفر طویل تھا اور جان لیوا انتظار دیا کی جگہ وہ خود کو مرنے ہوا محسوس کر رہا تھا۔ رات کی تاریکی اپنے سیاہ پر سمیٹ کر صبح کے اجالے کا استقبال کر رہی تھی اور سورج دھیرے دھیرے افق سے ابھر رہا تھا جب اس کی گاڑی ہسپتال کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی، اس کے بعد کی کارروائی عجلت بھری اور معمول کے مطابق تھی۔ اسے کچھ فارمفل کرنے کو دیے گئے اور فوری پے منٹ کا تھنا بھی کیا گیا۔

”جلدی کریں مسٹر! آپ کی مسز کی حالت شدید خطرے میں ہے۔ بہت زیادہ تاخیر ہو جانے کے باعث ان کی جان کو خطرہ ہے۔ فوری آپریشن نہ کیا گیا تو خدا نخواستہ پے منٹ کے نام پہ اس کے چہرے پر اضطراب پھیلنا دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ ہیر کچھ اور پھیلا دیے۔“

”مم مگر میرے پاس فی الحال کیش نہیں ہے مگر میں پے منٹ کروں گا۔ اکیچولی۔“

”مستقیم! خون کی بھی اشد ضرورت ہے۔ آپ بلڈ کارڈنگ کریں۔“

مستقیم ہونٹوں کی طرح سے سر اٹھائے کھڑا رہ گیا، معاً کچھ خیال آتے پر وہ باہر بھاگا تھا۔ لیب سے ہٹا کر دوانے کے باوجود خون کا انتظام نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر نے خون نہ ملنے کی صورت میں دیا کی نب سے مایوسی کا اظہار کیا تھا اور وہ رونے والا ہونے لگا تھا۔ اس کی اسی پریشانی کو دیکھتے ہوئے

شوشن پر موجود اسمارٹ سی نرس نے اسے اک اور ہسپتال کا پتا بتایا تھا تاکہ وہ وہاں سے آرڈر کر سکے۔ مستقیم وہاں سے نکلا تو اسے لگتا تھا نہ سر کے اوپر آسمان ہے نہ پیروں تلے زمین۔ اگر دیا کو کچھ ہو جاتا تو اس کے لیے کل کائنات ختم ہو جاتی گویا!

بدحواسی سر اسٹیمکی وٹمبر اہٹ کا یہ عالم تھا کہ وہ راہ چلتے لوگوں سے ٹکراتا پھر رہا تھا اور جب وہ بدتمی بار کسی سے ٹکرایا تو جواب میں اسے اپنا نام سننے کو ملا تھا بجائے کو سننے یا معذرت کے وہ چونکا۔ ننگے در بے ساختہ پلٹا۔

سامنے موجود بارش چہرہ اس کی آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں میں غیر واضح رہا تھا۔ وہ اس لرزتی آواز کی غیر یقینی، استعجاب، اور تحیر کو بھی محسوس کرنے سے قاصر رہا تھا اور سر خوشی و شادی کو بھی۔

”تم مستقیم ہی ہونا۔“ میرے خلیفہ مستقیم امیر سے بیٹے امیر سے لخت جگرہ اس جانب پہچان رہا تھا۔ مستقیم کا دماغ صحیح کام نہیں کر رہا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف تھا۔ اسے اس پل دیا کے مادہ سے کچھ بھولا ہوا تھا۔ آسمان الفاظ کے معنی تک۔ وہ آگے بڑھے تھے اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ جو لرز رہے تھے۔ آنکھیں بہہ پڑی تھیں۔ غیر یقینی نے یقین کی منزل کو پایا۔ گواہی دل کی تھی۔ اگلے لمحے وہ اسے گلے لگا کر رو پڑے تھے۔

”مجھے معاف کرو میرے بیٹے! تمہارا باپ بہت شرمندہ ہے۔“

”مجھے فوری بلڈ کی ضرورت ہے۔ ورنہ دیا مر جائے گی۔ میری دیا کو کچھ ہوا تو میں بھی مر جاؤں گا۔“

وہ انہیں شدت سے جھٹک کر زور سے چلایا تھا اور پھر ایک جانب کو بھاگا۔ عیدل ماجد اس کے پیچھے نکلتے تھے۔

”مستقیم! میرے چاند۔ مجھے بتاؤ۔ کون دیا! کیا ہوا اسے؟ میں کروں گا خون کا انتظام۔“

انہوں نے اسے پیچھے سے زبردستی اپنے بازوؤں میں بھر کے روکا۔ وہ ان کی آخری بات کو سن کر کچھ کر رہی تھا تھا۔

”دیا۔! میری بیوی ہے۔ میری زندگی۔ وہ ہسپتال میں ہے۔ اسے۔ او، گلیو خون کی ضرورت ہے، نہ ملا تو۔۔۔۔۔“

مل جائے گا میرے بچے! انشاء اللہ مل جائے گا

انہوں نے مسرت سے کانپتی آواز میں کہا تھا اور اسے لے کر ایک جانب کو لپکے۔ ان کے

قدموں میں جتنی ترمیم جیسی سرخوشی کا احساس تھا۔ مستقیم اسی قدر بدحواس، وحشت زدہ اور مضطرب رہا ان کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ ابھی تک اپنے محسن کو پہچاننے سے قاصر رہا تھا کہ اس کے حواس ابھی تک قفل تھے۔ ورنہ اگر وہ انہیں پہچانتا تو کبھی اس طرح ان کے قدم سے قدم ملا کر نہ چل رہا ہوتا۔

☆ ☆ ☆

”مجھے نہیں کھانا ہے یہ کھانا۔ میں نے کہا ہے نا مجھے یہاں سے باہر نکالو۔ ورنہ ایک ایک کو شوت کر دوں گا میں۔ تم جانتے نہیں ہو مجھے۔“

اس نے پھرے ہوئے انداز میں نرے اٹھا کر دیوار سے ماری تھی اور مطلق کے بل چلانے لگا تھا۔ عبدل ماجد اسے ہاسٹل لے کر جانے کی بجائے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ جہاں اک طرح سے وہ قید ہی کر دیا گیا تھا۔ یہ ان کا فارم ہاؤس تھا۔ وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا سرسبز و شاداب خوب صورت فارم ہاؤس، جس کے ایک کمرے میں وہ اس وقت موجود ہذیانی کیفیت کے زیر اثر تھا۔ عبدل ماجد کو پہچان لینے کے بعد وہ ایسی ہی وحشت اور بد الحالی کا شکار ہوا ہوا تھا۔ بیجان اور سرسبز مٹی جل کر اس کے اعصاب کو شکست کر رہے تھے۔ اس کا رشتوں سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنی سگی ساتھی امانت کو بدلتے دیکھا تھا اس نے ٹائل سے دھوکہ کھایا تھا۔ اس نے دیا کی ماں کا بھی روپ دیکھا تھا۔ پھر اپنے باپ پر اعتبار کیسے کر لیتا۔ جس نے ہمیشہ اسے ناقابل ستانی نقصان ہی پہنچایا تھا۔

”تم جاؤ اور سلطان یہاں سے اپنے بیٹے سے میں خود بات کر لوں گا۔“

تب ہی دروازہ کھلا اور وہ اندر آ گئے۔ خلیفہ مستقیم نے اسی پھرے ہوئے انداز میں آگے بڑھ کر ان کا گریبان پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔

”تم مجھے پھر دھوکہ نہیں دے سکتے۔ میری دیا مرگئی ہوگی۔ اسے تو۔۔۔“

معا کچھ خیال آنے پہ وہ جیسے ہلک پڑا تھا۔ عبدل ماجد نے اسے بے اختیار بازوؤں میں بھر کے چھوٹے بچے کی طرح سینے سے لگا لیا تھا۔

”دیا بیٹی اب بالکل ٹھیک ہے۔ تمہاری امی ہیں اس کے پاس۔ ہم دادا دادی جب کہ تم باپ باپ بن گئے ہو ایک پیارے سے بچے کے۔“

انہوں نے اس کی آنکھیں باری باری چوم کر خوشی سے لرزیدہ آواز میں بتایا تھا۔ اس کی کسی بھی بدتمیزی کا مجال سے جو بڑا مانا ہو ذرا بھی۔ مستقیم یکدم ساکن ہو کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے مسرت ابھری تھی۔ پھر شک اور آخر میں غیر یقینی۔

”تم چھوٹے بولتے ہو۔ محض مجھے بہلانے کو۔“

وہ حقارت بھرے انداز میں پھٹکارا اور انہیں دھکیل کر خود قافلے پر ہوا۔ عبدل ماجد نرمی و عداوت بھرے انداز میں مسکرائے تھے۔

”نہیں میرے بیٹے! تم بات کر لو دیا سے فون پر۔ پھر تو یقین کرو گے؟“

انہوں نے اپنے کوٹ کی جیب ہاتھ ڈال کر اپنا سیل فون نکالا اور کچھ نمبر پیش کرنے لگے۔ مستقیم تند اور متعثر نظروں سے انہیں گھورتا رہا۔ انہوں نے فون کال سے لگایا۔ پھر کچھ توقف سے رابطہ بحال ہونے پر گلا کھٹکار کر بولے تھے۔

”ہاں سب ٹھیک ہے۔ آپ دیا سے بات کرائیں ذرا پلیز صالو۔“

وہ اس کی ماں سے مخاطب تھے۔ وہ ہونٹ بھیچنے کھڑا رہا۔ اس کی آنکھیں سگ رہی تھیں۔

”آپ بعد میں بات کر لینا صالو! ابھی بالکل مناسب نہیں۔ پلیز آپ دیا بیٹی کو دوفون۔“

وہ نرمی و لجاجت سے سمجھاتے ہوئے بولے۔ مستقیم نے جبر سے بھیچے۔ وہ اس کی ماں سے بھلا ایسے بات کب کرتے تھے۔ سارا ڈرامہ۔ اونہ۔ اس کا زہر آلود ذہن مزید زہر سمٹ کر لانے لگا۔

”دیا بیٹے آپ ٹھیک ہو اب؟ یہ۔۔۔“

مستقیم نے آگے بڑھ کر سیل فون جھپٹ لیا اور بچہ اُٹھ کر لاؤڈ اسپیکر آن کیا۔

”جی ابو میں ٹھیک ہوں۔ مستقیم کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

وہ دیا کی آواز تھی، مدہم اور نقابست زدہ مگر وہ اس کی آواز کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

”دیا!!“

اس کے حلق سے سرسراہٹ زدہ آواز نکلی۔ جو دوسری جانب دیا کی بے چینی کو قرار بخش گیا۔

”آپ ٹھیک ہیں نا مستقیم!“

وہ کتنی بے چین تھی۔ مستقیم نے ملا متی نظروں سے عبدل ماجد کو دیکھا جو زیر لب مسکرا رہے تھے۔

”ایک لفظ نے رمان سے کہا اور اگلے لمحے سلسلہ منقطع کر دیا۔“

”تمہاری جگہ اگر یہ احسان کسی اجنبی نے کیا ہوتا تو میں اخلافا اس کا تھنکس کہتا مگر۔“

”اٹس اوکے مائی سن! انہوں میں تھنکس نہیں چلتا۔“

وہ جو اب اعلیٰ طرفی سے بولے تھے۔ مستقیم نے طیش کے عالم میں ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل فون دور پھینک دیا۔

”مجھے تمہاری اس چالوسی کی ضرورت نہیں ہے سمجھے تم؟“

”وہ چیخا تھا۔ عبدل ماجد خاموش رہے۔ وہ اسی پھرے ہوئے انداز میں آگے بڑھا اور دروازہ

کھولنے کی کوشش میں ناکام ہو کر زوردار ٹھوکر بند دروازے کو رسید کی تھی۔

”اسے کھولو۔ ورنہ میں تو زکر پھینک دوں گا۔“

اس کے ہر انداز سے بے پناہ درشتی چمک رہی تھی۔ جبکہ دوسری جانب اسی قدر رسان جھل رواداری اور مدافعت انداز تھا۔

”ہم آج شام تک دیا جی کو ڈسچارج کروا کے انشاء اللہ یہیں لے آئیں گے بیٹے۔“

وہ محبت سے لہریز لہجے میں بولے تو جوانو آپ سے باہر ہونے لگا تھا۔

”مت کہو مجھے بیٹا! میں نہیں ہوں تمہارا کچھ بھی۔“

وہ پھر چیخا تھا۔ عبدال ماجد کی بے چارگی اور اذیت کا عالم دیکھنے والا تھا۔

اپنے بوڑھے باپ کو معاف کر دو بیٹا!

ان کا لہجہ وحیما شرمسار اور ہیگا ہوا تھا۔ جواب میں اس کی چھیدی نظریں گویا انہیں اندر تک ادھیر کر رہ گئیں۔

”مجھے یہاں کیوں بند کیا ہے؟“

”بند نہیں کیا بیٹے! آپ اپنے گھر پر ہو۔ یہ سب کچھ تمہارا ہی ہے اور تمہیں ہی سنبھالنا ہے۔“

”میں تو.....“

”مجھے یہ جذباتی تقریر نہیں سننی۔ میرے سوال کا جواب دو۔“

خلیفہ مستقیم ان کی بات کاٹ کر بدلتی نظریں سے گھر و مونت بھرے انداز میں بول پڑا تھا۔ عبدال ماجد شکست خوردہ، مایوس اور دل گرفتہ نظر آنے لگا۔

”کیونکہ میں نہیں چاہتا تم پولیس کے ہتھے چڑھو۔ میں.....“

اور جواب میں خلیفہ مستقیم کے چہرے پر آگ سی دھک اٹھی تھی۔

”بہت خوب۔ مگر کب تک؟ میرا تو نصیب ہی اس ملک کے کسی محافظ کی گن سے نکلی ہوئی اندھی گولی یا پھر پھانسی کا تختہ ہے اور میرا نصیب ایسا بنانے میں سب سے زیادہ تمہارا ہی تو ہاتھ ہے انسان نما بھیڑیے! پھر یہ اب ہمدردی کیوں؟“

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شہوہ کر گیا تھا۔ ایسا شہوہ جو انہیں بکھیر کے رکھ گیا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوا۔ اگلے لمحے وہ بے بسی سے سسک رہے تھے۔

”ہاں میں قصور وار ہوں۔ خطا کار بھی ہوں۔ تم مجھے بھلے معاف نہ کر مگر یہاں سے مت جاؤ میرے بچے! میری سزا میں کچھ تو حلیہ فکر دو اور کچھ نہیں۔ میں سکون سے مر تو سکوں گا۔ اس خیال کے

ساتھ کہ میرے بیٹے نے اگر مجھے معاف نہیں کیا تو اپنا حق تو قبول کر لیا۔“

وہ واقعی رو رہے تھے۔ مستقیم ہونٹ پیچھے بے مہر آنکروں سے انہیں دیکھتا رہا تھا۔ ایک لفظ تسلی کا نہ بگیرا۔ یہاں تک کہ وہ جب تھک گئے تو اٹھ کر چلے گئے۔ اس نے ان کے لڑکھڑاتے قدموں میں ایسی ہی مایوسی پائی تھی۔ جو اس وقت اس کے دل میں اترتی تھی جب وہ ہمیشہ کے لیے ان کا گھر چھوڑ کر چلا تھا۔

بیٹے..... بیٹے..... بیٹے.....

وہ کھڑکی میں کھڑا فارم ہاؤس کے سامنے کچھ فاصلے پر بنی سنگ مرمر کی چھوٹی سی بارہوری کو دیکھتا تھا جس میں موجود سفید سنگی تخت پر گرد کی ہلکی تہ یہاں سے بھی نظر آتی تھی۔

دیا کل ہاسپٹل سے یہاں پہنچ گئی تھی۔ ساتھ میں امی بھی تھیں اور ننھا نو مولود بھی۔ وہ بے حس بنا کر اپنے استاد رہا تھا۔ اپنے والدین کے ساتھ وہ دیا سے بھی گویا خنا ہو چکا تھا جو ان لوگوں سے اس طرح عمل مل گئی تھی۔ امی جس بے تابی، بے قراری سے اس کی جانب ہلکی تھیں خلیفہ کے اندر وہ جوش و خروش مفقود رہا تھا۔

”سالوں سے بیمار تھی میں۔ مگر تمہارے ملنے کی خبر ساری بیماری لے آئی۔ یہ بیماری ہی خوش نصیب تھی جس کی بدولت میرا بیٹا مجھے مل گیا۔ اگر تمہارے ابو ہاسپٹل میں نہ آ رہے ہوتے تو بھلا کیسے نہ تم ہمیں۔“

وہ بار بار اسے چومتی اور گلے لگاتی تھیں۔ وہ کتنی بوڑھی لگنے لگی تھیں۔ حالانکہ ان کی عمر ہرگز اتنی فنی بہتنی وہ ضعیف ہو چکی تھیں۔

”اب کہیں جاؤ گے تو نہیں نا خلیفہ؟“

وہ کسی خیال کے تحت خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ اور خلیفہ مستقیم نے ہونٹ بھیجنے لیے۔ اس کے اندر بے چینی، غمی اور بے اعتنائی ماں کا چہرہ دیکھتے بکھرے لگی تھی۔ نفرت کی کات کیسے غیر محسوس میں ہونے لگی۔ اسے اگاموں کی آنکھوں کی امید اس کے قدموں کی زنجیر بن رہی ہے۔

”آئیے صاف! کچھ دیر آرام کریں۔“

عبدال ماجد بیٹے اور بہو کو تنہائی فراہم کرنا چاہتے تھے اتنی طویل جدائی کے بعد۔

”نہیں..... نہیں..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی اپنے بیٹے کے ساتھ رہوں گی۔ ابھی تو جی بھر اسے دیکھا بھی نہیں میں نے۔“

انہوں نے مستقیم کے لمبے چوڑے وجود کو اپنے کمزور ناتواں بازوؤں میں بھرنے کی ناکام

وہ زور سے پھنکارا۔ بہت ہی انسٹانگ رویہ تھا اس کا ان کے لیے۔ جہاں عبدالماجد کا چہرہ پیکا دیا بالکل فق ہو کر رہ گئی۔ اس نے بے اختیار تادیبی انداز میں مستقیم کا ہاتھ دبایا تھا۔ انداز بھی برعکس تھا۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ بزرگوں سے ایسے بات کرتے ہیں خلیفہ مستقیم!“

وہ جیسے منمنائی تھی۔ عبدالماجد نے نرمی سے دیا کوٹوک دیا۔

”اس اوکے بیٹے! مستقیم کچھ غلط نہیں کہہ رہے۔“

مستقیم کے چہرے کا تحفہ بڑھا جبکہ آنکھوں کی جلن میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ کہے بغیر ایک لمحے سے وہ اٹھا تھا اور دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ امی مضطرب سی اسے جاتے دیکھتیں رہی تھیں۔

”آئی ایم ساری ابو جی۔“

دیا کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ عبدالماجد نے اٹھ کر اس کے سر پر اپنا ہاتھ ڈھارس کے انداز میں رکھا۔

”ابھی وہ بہت شاکی اور بدگمان ہے ہم سے اور میں مطمئن ہوں اس کا رویہ نارمل ہے۔ ان شاء اللہ نیک ہو جائے گا۔“

ان کی اعلیٰ طرفی کی دیا دل سے قائل ہوئی۔ بھلے یہ عمل کا رد عمل تھا۔ مگر مستقیم کے انداز میں اتنے تھے۔

”میں انہیں سمجھاؤں گی امی! آپ پریشان نہ ہوں۔“

اس نے امی کا ہاتھ نرمی سے دبایا تھا۔

”نہیں بیٹے! آپ اس سے کچھ مت کہنا۔ اس کا فصر ختم ہونے کا انتظار کریں۔“

عبدالماجد نے جاتے جاتے سمجھایا تھا۔ پھر بچے کو پیار کرتے امی کے ہمراہ کمرے سے نکلے۔ مستقیم اس سے بھی بعد بہت بعد میں کمرے میں آیا تھا۔ دیا نے خطی چھلکاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”لائٹ بند نہیں کریں۔“

وہ جیسے ہی اٹھ کر سوئچ بورڈ کے پاس گیا۔ دیا نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے فی الفور نوکا۔

”کیوں؟ پتا ہے نا تمہیں مجھے اندھیرے کے بغیر نیند نہیں آتی۔“

وہ سمجھایا تھا۔ دیا نے گہرا سانس کھینچا۔

”پتا ہے۔ مگر آپ کے اس سہوت کو پتا نہیں ہو گا والد محترم کی شاہانہ عادات کا۔ لائٹ بند

کوشش کرتے بچوں کی ہی ضد دکھائی۔ جہاں عبدالماجد، مستقیم کی متوقع ناراضگی سے خائف ہوئے۔ دیا بے حد شانت ہوتی ہوئی مسکرائے گئی تھی۔ اس کی فخریہ اور کسی حد تک جلتاتی مسکراہٹ خلیفہ مستقیم کو کچھ باور کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ہونٹ بچھنے کے نگاہ کا زاویہ بدل گیا تھا اور انہیں اپنے بازوؤں کے حصار میں لیا۔ امی نے اس کے سینے میں سر چھپایا تھا۔

”ابو آپ رہنے دیں امی کو یہاں۔ آپ بھی بیٹھ جائیے ناں۔ اور یہ بتائیں مجھے کہ آپ نے اپنے پوتے کا کیا نام سوچا ہے؟ آپ کو پتا ہے ابوتی ہمارے خاندان میں پوتا ہو یا پوتی پہلے بچے کا نام دادا، دادی کی پسند پر ہی رکھا جاتا ہے۔“

اس کا مان بھرا۔ اپنائیت آمیز انداز کسی فرمانبردار بیٹی کی جھلک دکھاتا تھا۔ گوکہ دونوں یہ باہم مل میں بھی محسوس کر چکے تھے۔ مگر بدگمان بیٹے کے سامنے وہ جس طرح ان کی ڈھال بن رہی تھی یہ تو اور بھی دل موہنے والا انداز تھا۔ ان کے ہونٹوں پر اترنے والی مسکان بہت عاجزانہ اور تشکراتھی۔

”ہمارے بیٹے اور بیٹی کی پسند ہی ہمارا پند ہے بیٹے! نام مستقیم رکھے گا۔“

ان کے لہجے میں مٹھاس تھی۔ چاہت تھی اور ایک عجیب سی تشنگی کا احساس بھی تھا۔ مستقیم کی تشنگی کی تشنگی کا احساس۔ جسے دیا نے بہت شدت سے محسوس کیا۔

”انہیں تو ایزد نام پسند ہے۔ ایزد مستقیم! دیکھیں کتنا پیارا ہو گیا نام۔ ہے نا امی؟“

دیا چپکلی تھی۔ امی کا چہرہ چمکنے لگا۔ انہوں نے بے ساختہ اسے اپنا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا تھا اور بھیگی آنکھوں سے مسکرانے لگیں۔ ہوش میں آنے کے بعد جب انہوں نے اپنا تعارف مستقیم کی امی کے حوالے سے کرایا تھا۔ تو بس یہ حوالہ ہی کافی ثابت ہوا تھا دیا کے لیے ان سے محبت اور اپنائیت کے اظہار کے لیے۔ وہ سمجھ اور جان گئی تھیں کہ ان کے بیٹے کا انتخاب کتنا اعلیٰ تھا۔

”جیتی رہو بیٹی! سدا سہاگن رہو۔ اللہ ہر خوشی نصیب کرے۔ آمین۔“

وہ نہال ہوتیں دعاؤں سے نواز رہی تھیں۔ پھر چاکر مستقیم کی جانب متوجہ ہوئی تھیں اور اس محبت سے اس کے بال سہلائے۔

”تم بھی تو کچھ بولو بیٹے! اپنے بچے کو بھی گود نہیں لیا۔ دیکھو کتنا پیارا ہے۔ ہو ہو تمہارے بچہ کی تصویر، ہے نا مستقیم کے ابا؟“

ان کی خوشی ان کے ہر انداز سے چھلک رہی تھی۔ مستقیم کے تحفہ زدہ چہرے پر نہ ہر خند پھیل گیا۔ ”ان سے کیا پوچھتی ہیں۔ انہیں کیا پتا میں کیسا تھا بچپن میں۔ نہ انہوں نے کبھی اپنے پاس رکھا

نہ جھٹک سے کبھی شکل دیکھی تھی میری۔“

اس کے رنگ اڑے چہرے پر قہر بھری نگاہ ڈالتا ہوا وہ ایک بار پھر وہاں سے اٹھ گیا۔ ضبط میں رہ کر پڑی رگت اور وحشت بھری آنکھیں اس کے اندرونی اکھاڑ بچھاڑ کی گواہ بنی ہوئی تھیں۔ وہ انہوں میں اتری نمی کو پلکیں جھپک کر اندر اتار رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

کچھ درد مجھے تو پہنچے دے
اندر سے زندہ رہنے دے
آنکھیں بھر ہو جائیں گی
کچھ اشک میرے تو پہنچے دے

کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ ڈیروں کشتوں میں منہ دیئے اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ سگر کی آواز کا ہلکا ہلکا گونجنا اس کی اپنی لپٹ میں لے کر کچھ مزید جو جھل اور سوگوار بنا رہا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی ہونٹ پر ہنسے۔ اور جیسے سر بھی جھٹکا۔ مگر اس احساس کو نہیں جھٹک سکا جو احساسات سے لپٹ گیا تھا۔ عبدالماجد سے غافل جان کر اس پر جھکنا اور والہانہ انداز میں اس کے نقوش کو چومنا۔ کیا جھوٹ تھا؟ کیا

ان کے اشک عداوت..... جو بے قراری سے مچلتے تھے۔

ان کے چہرے و انداز سے عیاں وہ اضطراب جو کہیں قرار نہ پاتا تھا۔

وہ صرف اسے پا کر خوش نہیں تھے۔ وہ اسے مطمئن اور آسودہ دیکھ کر ہی پرسکون ہو سکے تھے۔ مستقیم کا دل کھٹور تھا۔ وہ کھٹوری رہتا چاہتا تھا۔ مگر عبدالماجد جیسے ٹھان چکے تھے۔ اس پتھر میں نقب لگائی ہے۔ محبت کا چشمہ کھودنا ہے۔ عجیب دیوانی کوشش تھی۔ دیوانہ وار ہی جاری تھی۔ ہر روز ان کے فحش و فحاشی پر انواع و اقسام کے کھانے سبجے ہوتے۔ اور وہ اس کی بے اعتنائی۔ لائقیت یہاں تک کہ دل لہرائی کی پرواہ کیے بغیر برامانے بغیر اک اک چیز اسے پیش کرتے اور جواب میں اس کی نظر اندازی کیے تھے۔ ترش انداز پر دل برا کیے بغیر کسی اگلی جدوجہد میں مصروف ہو جاتے۔

اب مستقیم خود خائف ہونے لگا تھا۔ یہ سچ تھا اس نے زندگی میں اگر کسی سے محبت نہیں کی تھی تو اب محبت نہیں کی تھی۔ نفرت کا پرچار کرنا الگ اور اس کو عملی طور پر ثابت کرنا بالکل الگ نوعیت کے کام تھا۔ وہ نہیں کر پا رہا تھا۔ یا پھر عبدالماجد کا رویہ اس کے ہر ہتھیار کو کند کرنا جا رہا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں غائب ہو گیا تھا۔ عبدالماجد سے بھی اور ان سے زیادہ اپنے دل میں ابھرتے ان کے لیے نرمی کے

ہوتے ہی چپے گا۔ دیکھ لیجیے۔

اس کی والہانہ نظروں کا مرکز کات میں سویا ہوا بچہ تھا۔ مستقیم نے ہونٹ بھیج لیے۔

”آپ کو اپنے بیٹے کی خوشی نہیں ہے مستقیم!“

وہ جس ہل بستر پر آیا دیا نے کسی قدر رنجیدگی سے سوال کر لیا تھا۔

”تمہیں کس نے کہا؟“

وہ تیوری چن چا کر اسے گھورنے لگا۔ آج کل وہ اتنا ہی بد مزاج، سزیل اور بے لحاظ ہو رہا تھا۔

”مجھے لگا ہے۔ خوش نظر نہیں آتے۔ مجھے آپ۔“

وہ سرد آہ بھر کے بولی تھی۔ مستقیم بیدردی سے ہونٹوں کو کچلنے لگا۔

”جس طرح آپ مجھے وہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔ وہ بارہ

آپ کو دیکھ سکوں گی۔“

وہ اس کے بازو سے لگ کر نناک آواز میں کہنے لگی۔

”تمہیں وہاں سے نکال کر بھی میں ہی لایا تھا۔“

مستقیم نے جتنا نام ضروری خیال کیا۔

”ہوں..... ہوں۔ ابوتی نے بتایا تھا۔ یہ بھی کہ آپ اپنی سدا بد گوائے ہوئے تھے میری

پریشانی میں۔“ وہ حجاب آمیز مسکان سے بولی تو چہرے پر جانے کس کس احساس کے تحت رنگوں کی

برسات اتر آئی تھی۔ مستقیم کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لرزا۔

”آپ کے امی، ابوتی آپ سے بہت محبت کرتے ہیں مستقیم!“

اس کے لہجے میں عجیب سی حسرت تھی۔ مستقیم ہونٹ پیچھے دوسری جانب دیکھتا رہا۔

”خلیفہ.....“

دیا نے بہت مان بھرے انداز میں اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ خلیفہ نے محض ایک نظر اسے دیکھا

تھا۔

”ابو کو بھی معاف کر دیں پلیز۔“

”مث آپ دیا!“

وہ یکدم چیخا۔ یوں جیسے ضبط چھٹک گیا ہو۔ اس کا ہاتھ اس نے بہت فہم سے اور زور سے جھٹکا

تھا۔

”مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے معلوم ہے اوکے؟ راستے مت دکھاؤ مجھے۔“

ہونٹوں پر ہنسی آنکھوں میں نمی
بھٹکی سی ہے میرے دل کی زمیں
سب کچھ ہے حاصل آج مجھے
مٹی ہی نہیں کیوں تیری کی
نیندوں میں سکی، خوابوں میں سکی
ہانہوں میں اپنی سو لینے دے
کچھ درد مجھے تو سہنے دے
اندر سے زندہ رہنے دے

اس کی آنکھوں کی جلن یکھت بڑھ گئی۔ سٹج پر پھلتی نمی گویا تیزاب تھی۔ جو اسے جلا کر خاکستر
رہی تھی اور تکلیف کی شدت..... ناقابل بیان۔ ناقابل برداشت۔

"خلیفہ..... خلیفہ!"

دیا اسے پکارتی ہوئی اندر آئی تھی۔ مستقیم نے سرعت سے اپنی بھٹی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"انہیں..... میرے ساتھ آئیں۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر مستقیم کو اٹھانا چاہا۔

"کہاں چلوں؟"

وہ رکھائی سے بولا اور گویا اسے گھورنے کا آغاز کیا۔

"آئیے تو۔ بہت بڑا سر پرانز ہے آپ کے لیے۔"

اس کے لہجے میں جوش و خروش تھا۔ مسرت تھی۔ مستقیم نہ چاہے ہوئے بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کون سا خزانہ دریافت کر لیا ہے محترمہ!"

اس کا چڑچڑاہن ہرگز رتے دن کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ جس کی دیا نے خاص پروا نہ کی

رکھی تھی۔ اس کا زیادہ وقت امی کے ساتھ گزرتا تھا۔ یا پھر ایڈ کے آگے پیچھے بھرا کرتی۔ وہ بہت

سے رو بہ صحت ہو رہی تھی تو اس میں امی کی محبت توجہ اور وہ خیال تھا جو خوراک سے لے کر کچھ

تک اس کی کرتی تھیں۔ بچے کو بھی زیادہ وہی سنبھالتی تھیں۔ دیا بھی کچھ کم مٹن نہیں تھی مگر بچے

ابو میں ایسے میں وہ اور چڑا کرتا۔ امی کی توجہ ابو کی اپنائیت و جانثاری اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا

صرف شاکی نہیں تھا۔ دکھا ہوا اور زخم خور وہ بھی تھا۔ اسے اپنا آپ ایسے بچے کی مانند لگتا جس کا

کھلونوٹ جائے۔ اس کا بھی وہ وقت کھو گیا تھا جس میں اس کی زندگی کا سارا سنبھرا ہوا تھا

آج وہ ٹوٹا ہوا انسان تھا۔ گمراہ اور بہکا ہوا۔ اور ایسا صرف ایک شخص کی بدولت تھا۔ وہ اسے معاف
کرنے پر خود کو آمادہ ہی نہ پاتا تھا۔

اب وہ جتنی بھی دلداریاں کر لیں۔ مسیحا بن کر لیں یا رفوگری کر لیں۔ دکھ کم ہوتا تھا۔ نہ زخم سلتے
تھے۔ اس کے خیال میں ازالہ ممکن ہی نہ تھا۔ وہ اپنے گمراہ اپنے ملک میں مجرم تھا۔ قیدی تھا اور اپنی
نظروں سے گر چکا تھا۔ ایسے میں اللہ کے دربار میں کیا مقام تھا اس کا؟ وہ سوچتا تو اندر سے توڑنے
نوٹنے اور بکھرنے کے مرحلے سے گزرنے لگتا۔

"یہاں کیسے بتا دوں؟ آپ چلیے نامیرے ساتھ۔"

دیا نے اس کا ہاتھ ہنوز پکڑ رکھا تھا۔ اس کے انداز میں بچوں کی سی ضد اور اشتیاق تھا۔

"محترمہ مت بھولیں۔ آپ کے سر محترم کا قیدی ہوں یہاں۔ باہر نکلتا نہتی سے منع ہے۔" اس
کے ساتھ گھسینا ہوا وہ طنز یہ لہجے میں جتلا رہا تھا۔ دیا نے سن کر بھی ان سنی کر دی۔ اور یونہی اسے ساتھ
کھینچتی ہوئی جس کمرے میں لائی اس کی تمام لائنس آف تھیں۔ البتہ کمرائیز فرشرز اور گلاب کی بھینی
بھینی دلفریب مہک سے بو مچھل تھا۔

"پپی برتھ ڈے نو یو۔ پپی برتھ ڈے ڈیزر مستقیم! پپی برتھ ڈے مائی سن!"

اس سے قبل کہ مستقیم کچھ بولتا عبد الماجد کی مدد ہم آواز گونجتی تھی اور ساتھ ہی تمام لائنس جل اٹھیں۔

مستقیم کے چہرے پر ناگواری اور حیرانی تھی۔ فنیس گلو بڑ اور قانون کی چکا چوند نے اس کی آنکھیں یکدم

پندھیا کر رکھی دی تھیں۔ جیسی وہ بے اختیار دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر دو قدم پیچھے ہوا۔

"مٹی مٹی پپی ریزن آف دا ڈے مائی سن!"

عبد الماجد آگے بڑھے تھے اور اسے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ دوسری جانب امی تھیں۔ ان کے

چہرے پر خوشی تھی مگر آنکھوں میں نمی کے ساتھ خوف کا احساس بھی گھات لگائے بیٹھا تھا۔ یعنی وہ

ناف تھیں۔ اس کی ناگواری۔ برہمی سے۔ مستقیم کی نگاہ انہی پر پڑی تھی۔ اور سارا اشتعال جیسے

دونوں پر آنے سے قبل ہی بے بسی کا شکار ہوتا چلا گیا۔

"کیک کاٹو مستقیم بیٹے! آ جاؤ شاہاں۔"

عبد الماجد نے مسکرا کر اس کا شانہ تھپکا تھا۔ وہ اتنا ہی جڑ بڑ ہوا۔ پتا نہیں کس مٹی سے بنے تھے وہ

اس کی ہر بدسلوکی کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے اور اعزاز سمجھ کر سینے پر ایسے سجاتے کہ وہ خود اپنی جگہ

بافت و فجالت سے بھر جایا کرتا۔ جو جھجھلاہٹ محسوس ہوتی وہ الگ۔

"اس زحمت کی کیا ضرورت تھی۔ سراسر فضولیات۔ میں نے تو کبھی اپنے بچپن میں بھی..."

اب کے وہ کسی طرح بھی خاموش نہیں رہا اور کئی سے کہہ گیا تھا۔ دیا نے گہرا سانس بھر کے امی اور ابو کے پیچھے پڑے چہرے دیکھے تھے اور خود میدان میں اتری۔

"ماضی اگر تکلیف یا اذیت کا باعث ہو تو اسے بھول جانا، فراموش کر دینا ہی ٹھکانہ ہے۔ معاف کرنا اعلیٰ ظرفی کے تقاضوں کو صحیح معنوں میں پورا کرتا ہے۔ وہ بھی اس صورتِ غلیظہ مستقیم اگر غلطی کرنے والا شرمندہ ہو۔ ایسے میں اپنے رویے سے جتنا نا کینہ پروری اور کم ظرفی کی علامت ہوتا ہے۔ آپ تو۔۔۔"

"تم خاموش رہو۔ میں تم سے بات نہیں کر رہا ہوں۔ کبھی ہوتی؟"

وہ غرایا اور آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔ دیا فحالت اور سکی سے سرخ پڑ گئی۔ کمرے کی فضا میں جان لیوا سناٹا اتر آیا تھا۔ مستقیم اسے کہنی سے پکڑ کر سائینڈ پر دھکیلتا ہوا قدم بڑھا کر عبدالماجد کے روبرو آ کھڑا ہوا۔ اس کی بے دید بے لحاظ گستاخ آنکھیں خشکیں انداز میں ان پر آن جی تھیں۔ عبدالماجد پر سکون جبکہ امی اسی قدر سبھی ہوئی نظر آنے لگیں۔

"کیا چاہتے ہیں آپ؟"

اس کی آواز میں سرد غراہٹ در آئی تھی۔ عبدالماجد خاموش رہے۔ مستقیم کی ناراضگی میں حیرت

اضافہ ہوا۔

"کیا مجھے آپ کو بتانا چاہیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں بچہ نہیں ہوں جو ایسی باتوں سے

بیل جاؤں گا اور یہ۔۔۔"

اس نے اپنی سلکتی آنکھوں کا زاویہ ان کے چہرے سے ہٹا کر نہایت خوبصورتی سے گلاب اور موچے سے سج کرے کی ڈیکوریشن پر ڈالی اور طنزیہ ہنکارا بھرا۔

"اس سب کا کیا مطلب ہے؟"

"کوئی مطلب نہیں ہے بیٹے! ہمیں اللہ نے اتنی بڑی خوشی سے نوازا ہے۔ تم واپس ملے ہو

ہمیں۔ تو تھوڑی۔ خوشی کا اظہار کیا تھا بس۔"

امی سک پڑی تھیں۔ عبدالماجد سر جھکائے کھڑے تھے۔ جیسے واقعی اس کے مجرم ہوں۔

"مت منائیں خوشیاں۔ اس لیے مجھ کو اب ان کا فائدہ نہیں ہے۔ گزر چکا ہے ہر اندازے کا

وقت۔"

بچنے ہوئے لہجے میں وہ پھر چلا یا تھا۔ اور ایک جھٹکے سے پلٹ کر چلا گیا۔ عبدالماجد بے جان

سے ہوتے وہیں بیٹھ گئے۔ امی ہاتھوں میں چہرا چھپائے سک پڑیں۔ دیا کی جان پر بنے تھی۔

"بہت ناراض ہے وہ بہت زیادہ۔ کاش بس میں ہوتا میرے۔ جان دے کر بھی منالیتی اسے۔" امی کی آہ و بکا دیا کا دل گویا بھینچنے لگی۔ کچھ کہے بغیر اس نے ان کا لرزنا کا پتا ہوا وجود اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسے یہ کون سمجھائے

وہ دشتِ خامشی کے سوکھے سمندر کی

ادھوری پیاس کی باتیں

بہت چپ چاپ سنتا ہے

بہت خاموش رہتا ہے

اسے یہ کون سمجھائے

خوشی کے ایک آنسو سے

سمندر بھر بھی جاتا ہے

بہت خاموش رہنے سے

تعلق مر بھی جاتا ہے

اسے دیکھتی دیا کی نظروں میں موجود یا سیت کا احساس گہرا ہونے لگا۔ سرد آہ بھر کے وہ قدم بڑھاتی اس کے نزدیک آ گئی۔

"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟"

وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا آنکھوں پر دھرا ہازو بنایا۔ بڑھی ہوئی شیوہ رتجکوں کی مظہر بے خواب دہکتی ہوئی آنکھیں۔ سنا ہوا چہرا۔ وہ اسے خاصا قابلِ رحم لگا تھا۔

"تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ تم جا کے اپنے سانس سر کا خیال رکھو۔ ان کی خدمتیں کرو۔ مجھ سے تو تمہارا تعلق واسطہ ہی نہیں ہے اب کوئی۔"

اس کا انداز نروٹھا تھا۔ دیا کو اس بیگانہ انداز پر بے اختیار ہنسی آئی۔

"امی کو آپ کا خیال ہے۔ کہہ رہی تھیں۔ آپ کے پاس جاؤں۔"

وہ مسکراہٹ دبا کر گویا ہوئی۔ مستقیم نے اسے نیچے نظروں سے گھورا۔ نچالاب دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش میں بلکان وہ گلابی سے سرخ پڑ رہی تھی۔ یہاں آنے کے بعد کھلی آب

ہوا۔ بہترین خوراک اور ماحول کی بدولت وہ اتنی تیزی سے دوبارہ پہلے والی دیباہی تھی کہ خود مستقیم بھی

حیران رہ گیا تھا۔ بلکہ اگر کہا جاتا کہ وہ پہلے سے بھی کئی گنا زیادہ حسین ہو گئی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ ماں بچے کے بعد اس پر حسن و نکھار جیسے نوٹ کر برسا تھا۔ گلابی مائل بالکل اجلی شفاف رنگت جس سے روشنیاں سی پھوٹی محسوس ہوتی تھیں۔ اتنی بے داغ اور چمکدار تھی کہ ہاتھ لگنے پہیلی ہونے کا خدشہ محسوس ہو۔ تھنوں تک لگتی موٹی سی چوٹی ورازا قامت، سر تا پا حسن و دلکشی کا نازک پیکر۔ حسن و جاذبیت کے جیسے جبر نے پھونسنے تھے۔

”میرا خیال ہے کہ اب تم ٹھیک ہو۔ ہے ناں؟“

وہ اس کا سر تاپا جائزہ لے چکنے کے بعد گویا ہوا تھا۔ جبکہ اس کی اس درجہ توجہ نے دیا کے رخسار شفق رنگ کر ڈالے تھے۔ جھیل جیسی آنکھوں میں حیاتیرنے لگی۔ لانی ریشمی پلکیں عارضوں پر بچہ گئیں۔

”ہاں ٹھیک ہوں، مطمئن بھی۔ خوش تب ہوں گی مستقیم! جب آپ کے تعلقات امی، ابو سے۔۔۔“

”ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دو بہتر ہوگا۔“

وہ اس کی بات کاٹ کر برہمی سے بولا تھا۔ دیال بھینچے اسے خفگی سے بچنے لگی۔

”مستقیم آپ۔۔۔“

”مجھے کچھ نہیں سننا۔ اپنی تیاری کر رکھو۔ میں بہت جلد یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔“

سگریٹ سٹاک کر گہرے گہرے کش لیتا دھواں اڑاتا وہ ٹھیل رہا تھا۔ دیا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس نے دھک سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی خوشنما آنکھوں سے آن کی آن میں خوف و خدشہ چھلکنے لگے۔

”ک۔۔۔ کہاں؟“

لفظ جیسے اس کے حلق میں پھنسنے لگے تھے۔ رنگت الگ پہلی پڑنے لگی۔

مستقیم نے ایک جھپٹی ہوئی نگاہ سے اسے نوازا تھا۔ اور ہنکارا بھرتے ہوئے اس کے پاس آن ٹھہرا۔

”جہاں بھی۔ یہ میرا مکان نہ تھا نہ ہی ہوگا۔ کبھی ہو تم؟“

وہ بے حد خفا سا اسے جھڑک رہا تھا۔ دیا کی فکر مندی اور اضطراب میں مزید اضافہ ہوا۔

”آپ اگر امانت اور شائستگی کے پاس جانا چاہتے ہیں تو۔۔۔“

وہ تیزی سے کچھ کہنے جاری تھی کہ مستقیم نے اس کی بات کو درشتی سے کاٹ ڈالا۔

”تو کیا۔۔۔ تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گی؟“

اس کے چہرے پر خطرناک قسم کے تاثرات ابھر آئے۔ جو دیا کو خوفزدہ کرنے کو کافی ثابت ہو سکتے تھے۔

”آپ ان کو نہیں جانتے۔ شائل مجھے مارنا چاہتی تھی اور آپ۔۔۔“

وہ روہا سی ہوتے کہہ رہی تھی کہ مستقیم نے بے حد قلعیت سے ہاتھ اٹھا کر اسے پھر درمیان ہی ٹوک دیا۔

”مجھے پتا ہے سب، بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

بے حد رکھائی کا بڑا شاندار مظاہرہ ہوا تھا۔ دیا کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔

”پھر بھی آپ۔۔۔“

اس کی آواز بھی بھرا مٹی۔ اس سے اب خود بات مکمل نہیں ہوئی۔ اسے بے حد دھچکا لگا تھا۔ جیسے مستقیم جانتے ہو جیسے بھی اسے پھر ان سفاک لوگوں کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔

”ضروری نہیں ہے میں وہیں جاؤں۔ لیکن یہ بھی طے ہے کہ یہاں نہیں رہوں گا۔“

اس کا لہجہ پھر قطعی اور دو ٹوک تھا۔ دیا کے آنسو گالوں پر اترنے لگے۔

”کیوں خود کو براہ کرم کرتے ہیں مستقیم! پہلے چلیں آپ کی کوئی مجبوری تھی۔ اب ایسا کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ ابو، امی خطر ہیں آپ کے۔ ختم کر دیں ان سے ناراضی۔ قبول کر لیں حالات کو۔ انا اور نفرت کی اس جنگ میں سب سے زیادہ نقصان آپ کی جھولی میں ہی آ کے گرا ہے۔ اس نقصان کا قاعدہ میں بھی بدل سکتے ہیں آپ۔ پلیز۔۔۔“

وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر نرمی سے جھنجھوڑتے ہوئے گویا منت کر رہی تھی۔ مستقیم نے جواباً اسے سر نظروں سے دیکھتے ہاتھ جھٹک دیئے اور اٹھ کر فاصلے پر ہو گیا۔

”ہاں ارادہ تو بدلا ہے میں نے اپنا۔ پہلے کچھ دنوں بعد جانے کا سوچا تھا۔ اب سی وقت جاؤں گا۔ اٹھو تم۔ ایزڈ کو لو ساتھ۔“

اس کے تاثرات میں کبیدی اور شدید نفرت تھا۔ ایک ہاتھ سے اس کا بازو پکڑ کر اس نے بھرپور جھٹکے سے دیا کو بھی گھسیٹ کر کمر اکر دیا تھا۔ وہ اتنا مشتعل تھا اور ایسی نظروں سے دیا کو دیکھتا تھا جو اس کا خون خشک کر کے رکھ گئی تھیں۔ اس کے اس جارحانہ موڈ اور حرکت پر اس کے حلق سے خوفزدہ سی جھپٹی بھی نکلی تھی۔ جس پر مستقیم نے مطلق دھیان نہ دیا۔

”تمہیں سنائیں ہے؟ لے کے آؤ ایزڈ کو ہم ابھی اسی وقت یہاں سے چل رہے ہیں۔“

”مستقیم بیٹے پلیز ادیا آپ چپ کرو بیٹے!“

عبدالماجد باری باری دونوں کو دیکھ کر جیسے گڑ گڑائے۔ مگر ان کی سن کون رہا تھا۔

”آپ چھوڑ دیں ای مجھے۔ آج کر لینے دیں انہیں اپنے دل کی۔ مارنا چاہتے ہیں آپ مجھے۔“

دیا بھری ہوئی موج کی طرح بے چل کرامی کے بازوؤں سے نکلی اور مستقیم کے سامنے آگئی۔ اس کی غیض سے بھری آنکھیں مزید قہر سمیٹ لائیں۔

”ایز دکولو اور میرے ساتھ چلو۔“

مستقیم نے اسے گھورتے ہوئے اپنا مطالبہ دہرایا۔

”میں نہیں جاؤں گی۔ میں کہہ چکی ہوں۔ اس گستاخی پر شوٹ کر دیں گے مجھے؟ کریں۔“

وہ بھی آج سرتاپا قہر تھی۔ مستقیم کی آنکھوں سے جیسے لبو ٹپکنے لگا۔

”میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی۔ یاد رکھنا بچہ پھر بھی میں ہی ساتھ

لے کر جاؤں گا۔ ہار تہا ر ای مقدر بنے گی۔ بولو چل رہی ہو میرے ساتھ۔“

امی دھک سے رو گئیں۔ دیا کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ ابو نے بے اختیار دل تھام لیا۔

ان کا چہرہ لہجے کے ہزاروں حصے میں پسینوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ انہیں لگا۔ وقت دس سال پیچھے چلا گیا ہے۔ ان کی جگہ یہ مستقیم کھڑا تھا۔ ایک بار پھر ایک قیامت نوٹنے کو تھی اور اک گھر بربادی کے آخری مرحلے پہ۔ کتنے دل تباہ ہونے تھے۔ انہیں لگا ان کا دل دھڑکنے سے انکار کر دے گا۔ جیسی وہ مزید کھڑے نہیں رہ سکے۔

”چپ کیوں ہو؟ یعنی منظور نہیں میرا مطالبہ؟ تو ٹھیک ہے پھر۔ میں تمہیں ابھی اسی وقت طلاق۔“

”چپ ہو جائیں مستقیم! خدا کے واسطے۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں چلوں گی آپ کے ساتھ۔“

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ عبدالماجد کا لمبا چوڑا وجود پورے قد کے ساتھ زمین بوس ہوا تھا۔ امی بے ساختہ جھنجھیں۔ دیا بھی سب کچھ بھول کر ان کی جانب بھاگی۔ اک افراتفری مچ گئی۔ مستقیم حق دق کھڑا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

صورتحال لمحوں میں تبدیل ہوئی تھی۔ صورتحال لمحوں میں ہی تبدیل ہوا کرتی ہے۔ اگر کوئی تغیر آیا

وہ حلق کے بل چیخا تھا۔ دیا نے ٹرکوفنی میں جنبش دی تھی اور اپنا بازو بے حد غصے میں آتے اس سے چھڑوا لیا۔

”تو پھر آپ بھی سن لیں۔ اگر آپ ٹھان ہی چکے ہیں کہ برائی کے راستے کو نہیں چھوڑیں گے تو میں آپ کے ساتھ نہیں چلوں گی۔ پہلے حالات اور تھے۔ میں مجبوراً نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کے ساتھ چلنے پر مجبور تھی مگر اب۔۔۔ اب میں امی، ابو کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں نے کہا تھا ناں کہ میں اپنی اولاد کی خاطر کچھ بھی کر گزروں گی۔ اس لیے کہ مجھے اپنے بچے کو قتل اور ناجائز راستوں پر نہیں چلانا ہے۔“

جوانا وہ بھی بھری گئی تھی۔ اور بغیر لحاظ رکھے اس سے بڑھ کر بلند آواز میں چیخی۔ جس کو سن کر امی اور ابو گھبرا کر بھاگے آئے تھے جبکہ مستقیم کو اس کا یہ انداز۔ گویا سکتہ ہوتے ہوتے رو گیا۔

”کیا کہا تم نے؟“

وہ اس سنانے سے نکلا تو آتش فشاں لاوے کی طرح پھٹ پڑا۔ ایک ہاتھ سے اس کا بازو پکڑ کر خود سے قریب کیا دوسرے سے کئی تھپڑ اس کے چہرے پر دے مارے تھے۔ ابو ششدر جبکہ امی بے ساختہ رو پڑی تھیں اور تڑپ کر ان کے درمیان حائل ہوئیں۔

”مستقیم۔۔۔ بیٹے! چھوڑو بچی کو۔ یہ ظلم نہ کرو۔“

وہ قہر قہر کانچتی جیسے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ دیا کا چہرہ لال بھسوکا تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی مگر وہ بہت مضبوطی سے اپنی جگہ پہ جمی اسے دیکھتی رہی۔

”میں نے کہا میں مزید آپ کے ساتھ ان گناہ آلود راستوں پر نہیں چل سکتی۔ سن لیا آپ نے؟“

وہ اسے گھورتے ہوئے پینکاری۔ اس بل وہ نہ اس سے ڈری تھی نہ خائف ہوئی تھی۔ البتہ آواز بھرائی ہوئی ضرور تھی۔ مستقیم مزید مشتعل ہوا۔

”تم چلو گی میرے ساتھ۔ اس لیے کہ تم میری بیوی ہو۔ مجھ پر میرے دشمنوں کو ترجیح نہیں دے سکتی تم۔“

اس نے دانت چکا پکائے تھے۔

”یہ دشمن نہیں ہیں آپ کے کیوں اللہ کے غضب کو آواز دیتے ہیں۔“

پھر وہ دے بغیر ترخ کر کہہ گئی۔ جو اب مستقیم کا مزید ایک طمانچہ اس کے نازک کال پر نشان ثبت کر گیا۔ امی کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ انہوں نے دیا کو جیتانی سے اپنے بازوؤں میں چھپایا۔

چاہتا ہو۔ وہ جو کسی برائی پر تلا ہوا تھا۔ خود آزمائش میں پڑ گیا۔ عبدالماجد کو پڑنے والا دل کا شدید دورہ اس کے شدت پسندانہ رویے کا باعث تھا۔ وہ جتنا بھی شاکی تھا ان سے۔ جتنا بھی متنفر تھا۔ مگر یہ کبھی نہیں چاہ سکتا تھا ان کی موت کا موجب بن جاتا۔ اضطراب اس کا دل مسلتا تھا۔ تلک اس کی روح کو پھیل رہا تھا۔ اس کے اعصاب پر ایک ایک ٹوکراں تھا۔ اسی اور دیا ہنگیوں سے روتی تھیں۔ اور اس کا فولادی وجود اشکوں کی اس برسات میں مانع بنتا جا رہا تھا۔

عبدالماجد آپریشن روم میں تھے۔ خطرے کی لالہ ہی مسلسل اسپارک کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی جلن ہر لمحہ بڑھ رہی تھی۔ کچھ کہے بغیر وہ پلٹ گیا۔ اس کے اٹھتے ہوئے ہر قدم میں اضطراب اور انفرار تھا۔ وضو کرنے کے بعد وہ قرہی مسجد آ گیا۔ مشکل میں اسے بھی خدایا یاد آیا تھا۔ ویسے ہی جیسے ہر مسلمان کو یاد آیا کرتا ہے۔ دو رکعت نماز حاجت پڑھنے کے بعد اس نے دعائے حاجت پڑھی تھی اور ہاتھ پھیلا دیئے۔ الفاظ کی جگہ حاجت روائی کو اشک رواں ہو گئے تھے۔

”انہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے میرے اللہ! اگر انہیں کچھ ہوا تو میں شاید کبھی تیری جانب نہ پلٹ سکوں۔ تجھے تو ہر وقت اپنے ہر بندے کی واپسی کا انتظار رہتا ہے ناں۔ مجھے بھی واپس بلا لے۔ مجھے بھی اس ملال سے نجات عطا فرما۔ اس پشیمانی سے نکال لے۔ ازالے کا موقع عطا فرما۔ آمین۔ آنسو قطرہ در قطرہ بہتے تھے۔ وہ ہنگیوں سے رو رہا تھا۔ چٹائی سے سک رہا تھا۔ اسے بھی مظلوم نہیں تھا۔ مگر حقیقتاً واپسی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ کہ دل پھیل جائیں تو نفرت کا زہر مدھل جاتا ہے۔

بقول شاعر

محبت جب لبو بن کر
رگوں میں سرسرائے تو
کوئی بھولا ہوا چہرا
اچانک یاد آئے تو
قدم مشکل سے اٹھتے ہوں
ارادے ڈمکائیں تو
کوئی دم سے لہجے میں
جھپیں واپس بلائے تو
غصہ جانا سمجھ لینا

کہ اب واپس پلٹنے کے عمل آغاز ہوتا ہے

کبھی تنہائیوں کا درد

آنکھوں میں سمائے تو

کوئی کمزور لمحہ چاہتوں کا جب ستائے تو

کسی کی یاد میں رونا تمہیں بھی خوں رلائے تو

کبھی انہونیوں کا ڈر

پرندوں کو اڑائے تو

ہو واجب چڑ سے اک زرد سا پتہ گرائے تو

غصہ جانا سمجھ لینا

کہ اب واپس پلٹنے کا عمل آغاز ہوتا ہے

وہ بھی واپس پلٹ آیا تھا۔ محبتوں کی طرف۔ اچھائی سچائی اور حق کی طرف اور دعا کرتا تھا۔ بہت عاجزی سے

”بے شک ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر۔ نہ پھیرنا ہمارے اس کو۔ بعد اس کے جب کہ تو نے ہمیں ہدایت دی۔ ورنہ ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔“

وہ یہ گزارش اللہ کے حضور پہنچا رہا تھا۔ اسے اب ساری عمر یہ گزارش باقاعدگی سے اللہ کے حضور پہنچاتے رہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے گہرا سانس بھرا اور عبدالماجد کے چہرے سے نگاہ بنائی۔ وہ دوواؤں کے زیر اثر غنودگی میں تھے۔ سر اس کی گود میں جبکہ ہاتھ یوں تھام رکھا تھا جیسے اس کے کہیں بھاگ جانے کا شدید دل میں لاحق ہو۔ وہ نہیں چاہتے تھے مستقیم ہاسٹل میں ان کے پاس کے انہیں اس کی جانب سے بہت سے خدشات لاحق تھے۔ جبکہ مستقیم چاہنے کے باوجود انہیں ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ بنی ہجرتی کہ وہ پوری طرح ٹھیک نہ ہونے کے باوجود ضد کر کے ڈسپارچ ہو گئے تھے اور اب واپس گھر کی جانب ہی ان کی گاڑی رواں دواں تھی۔ دیا اور امی کو اس نے آج ہاسٹل آنے سے اسی لیے منع کر دیا تھا۔ اس نے گاڑی سے باہر کے منظر پر نگاہ ڈالی تھی۔ سامنے بسوں اور ویکوں کا اڈا تھا۔ بے تحاشہ ٹریفک، بے شمار لوگ اور پازو کے اطراف بنی رنگ برنگ چیزوں کی دکانیں۔ نیلی وردی میں ٹریفک پولیس کے سارجنٹ بھی کہیں کہیں دکھائی دے جاتے تھے۔

انہوں نے ہوش میں آنے کے بعد بھی اس کا نام پکارا تھا۔ شعور و اشعور ہر جگہ وہی چھا گیا تھا

”کیسے بتاؤں آپ کو، کن راستوں پر ڈال دیا تھا آپ نے مجھے۔ جہاں نہ چاند کی دستک تھی۔ نہ روشنی کے قدموں کی آہٹ ابھرتی تھی۔ کیسے بتاؤں کہ میری روح کی طن میں آپ نے کیسی بیدردی سے اکھاڑ کر پھینک دی تھیں۔ آپ کے بننے مرد قحط کے ان بے شرم لہجوں نے مجھے ایسے دورا بے پرلا کھڑا کیا تھا۔ جہاں میں اپنی پہچان تک بھول گیا تھا۔ مجھے جہاں یقین کا نڈکی کشتی کی طرح دوسووں کی بارش میں بھیگ کر بار بار نونا تھا۔ جہاں دیار ذات کے تار یک بام و در میں خوش امید کی کوئی کرن نہیں جگمگاتی تھی۔ میں انہی اندھیروں میں بھٹکتا تھا اور بھٹکتے رہتا چاہتا تھا کہ تقدیر کے تھپڑے نے مجھے پھر آپ تک پہنچا دیا۔ آپ کی ٹکڑ بدلی ہوئی شخصیت محبت پیار میرے قدموں میں اس محبت کی زنجیر ڈالنے لگی۔ جسے میں پہننا نہیں چاہتا تھا مگر اب مجھے پر آشوب ہوا۔ میں تو کبھی آپ سے محبت ترک کر ہی نہ سکا۔ وہ نفرت، نفرت ہی نہ تھی۔ نفرت کی آڑ میں محبت تھی۔ آپ کو بھلانے کی کوشش میں آپ کی یادوں کے چراغ باقاعدگی سے روشن کرتا رہا۔ میں نے جانا میں تو آج بھی بیس سال پرانا وہی ”موجو“ ہوں۔ جسے اپنے سونڈ بوند بہت بڑے آفسر باپ سے والہانہ عشق تھا۔ جن کی شاندار قامت باوقار سراپے کی میں بڑھ چڑھ کے اپنے دوستوں کے سامنے فخر سے تعریفیں کرتا نہیں تھکتا تھا۔ میں نے آپ کو تکلیف میں دیکھا تو جانا میری نام نہاد نفرت اس محبت کے سامنے ہتھیار بھی نہیں جس کی میں پر میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکا۔ آپ کو دکھ نہیں دے سکا۔ میں نے جانا میں آج بھی آپ کو دکھ نہیں دے سکتا۔“

وہ خاموش ہوا اور ان کے کندھے سے اپنی بھٹی آنکھیں رنر کر صاف کرنے کے بعد ان سے الگ ہوا تھا۔ ان کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر پیار لٹاتی نظروں سے جھک کر ان کے بھیکے چہرے کو چوم لیا۔ جو خاموش آنسوؤں سے نمناک ہو چکا تھا۔

”آپ دل پر بوجھ نہ لیں ابو جی! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے اب۔ یہ تقدیر کا لکھا قسمت کا کھیل تھا۔ اب اس پر کیا الزام دیں کسی کو بھی۔“

عبدالماجد نے اس کا ہاتھ لیوں سے چھوا اور نرمی سے مسکرائے تھے۔

”یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے بیٹے! کہ تم نے میرا ہر جرم معاف کر دیا۔ ورنہ ساری کوتاہیاں اور خطیاں تو میرے اعمال کی تھیں اور میں سمجھتا ہوں اس کی بھرپور سزا بھی پا چکا میں۔ نو سال تم نہیں دتے۔ میں نے نو سال کا بچہ تارے و طلال سے لبریز مہر بھگتا ہے۔ کمال ضبط کی اس اسٹیج کا کیا نام ہو سکتا ہے جس سے میں گزرتا رہا ہوں جس میں ضمیر ہر لمحہ کوزے پر ساتا تھا اور ذرا جو دریغ کرتا ہو۔ تم نے ایسا خزانہ تھے جسے میں نے خود اپنی نااہلی کی بنا پر کھو دیا تھا۔ اور سزا یہ تھی کہ اس دنیا میں واحد تم ہی

گو یا وہ ڈاکٹر ز کے بھی پکارنے سے پہلے لپک کر ان تک آیا اور جھک کر ان کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

”میں آپ کے پاس ہوں ابو! جسٹ ریٹیکس۔“

اس کی آواز پر نمی اپنا غلبہ پانچلی تھی۔

”تم کہیں نہیں گئے ہونا؟ تم نے دیا کو طلاق بھی نہیں دی؟“

وہ ہراساں تھے۔ وہ خوفزدہ نظروں سے سوال کرتے تھے۔ یوں جیسے اک جواب بھی توقع اور مرضی کے خلاف ہوا تو جیسے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ سب کچھ نہ بھی سکی عبدالماجد ضرور۔

”نہیں ابو جی! ایسا کچھ بھی نہیں غلط ہوا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“

وہ ان کے سر کو سہلانے لگا۔

”اور۔۔۔ اور تم نے مجھے معاف کر دیا۔“

ان کے چہرے پر آس جگلی تھی۔ ان کے چہرے پر انجانا خوف بھی سمٹ آیا۔

”میری کیا اوقات ہے کہ آپ معافی مانگیں مجھ سے۔ مجھے شرمندہ اور گناہگار نہ کریں۔“

اک لمحہ ہوتا ہے ہدایت کا۔ اگر آجائے زندگی میں تو خوش بختوں میں شمار ہو جایا کرتا ہے۔ نہ آئے تو بے کار میں گزر جایا کرتی ہیں۔ زندگیوں وہ خوش بخت ہی تھا۔ اسے یہ لمحہ ودیعت ہوا تھا۔ عبدالماجد نے ہچکچاہٹوں سے روتے اس کے لیے دونوں بازو پھیلا دیے وہ بھی کسی چھوٹے بچے کی طرح ایسے ان کے گلے لگا جیسے کوئی گلہ، کوئی شکوہ کوئی دوری اور کمزورت درمیان میں آئی نہ تھی۔ وقت پیچھے چلا گیا تھا بہت پیچھے جب وہ محض دس سال کا ”موجو“ تھا۔ معصوم، ڈرپوک اور احمق سا، جسے باپ کی آغوش میں سینے کی خواہش شدید تھی۔ اسے پتا بھی نہ چلا اور وہ سسکیاں بھرتے ہوئے شکوے کیے کیا۔

”کیسے بتاؤں آپ کو۔ آپ کی توجہ اور محبت کے لیے کتنا ترسا ہوں۔ جتنا بھی آپ سے ڈرتا تھا۔ مگر ہمیشہ آس مندانہ نظروں سے آپ کو دیکھا کرتا۔ کبھی تو آپ مجھے پیار کریں گے۔ کبھی تو آپ مجھے توجہ دیں گے۔ مگر یہ خواہش حسرت بنتی گئی۔ یہ محبت کا راستہ سراب کا راستہ تھا جس نے بالآخر مجھے نکل لیا۔“

انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اسے اپنے سینے میں بھینچا۔ وہ بہت کچھ اچاچتے تھے۔ جو آج تک اس کے لیے محسوس کیا تھا۔ مگر فی الحال اسے سننے کے متمنی تھے۔ وہ بھی جا۔ کس رو میں بہ رہا تھا۔ ساری حسرتیں نکال لینے کا متمنی لگتا تھا۔

وہ ہستی تھی۔ جس سے میں نے کچھ معنوں میں دل لگایا تھا۔

To the world you are one of many to me you are all the

world.

اور سب سے بڑی ٹریجڈی یہ تھی کہ تم میری اس کیفیت سے بے خبر تھے۔ میری سزا میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہوا جاتا تھا۔ مجھے ہر آن لگتا گویا گرم تو سے پر بیٹھا ہوں اور جل کر راکھ ہو رہا ہوں۔ اس پوری دنیا کی بس نہ چلتا تھا خاک چھانوں اور تمہیں ڈھونڈ لوں۔ تمہارا میں سو بٹا چہرہ دیکھوں تاکہ دل کو کچھ سکون مل سکے۔ کیجیے شہنشاہ ہو۔ تم یقین کر سکتے ہو میرے بچے! تمہیں کھونے کے بعد میں نے لمحہ لمحہ تمہیں سوچا تمہیں ہی سوچا۔ مجھے تم سے زیادہ کوئی حسین نظر نہ آتا۔ تمہارا چہرنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا۔ میں راتوں کو نیندوں میں بیٹھ کر اٹھ بیٹھتا۔ اس بیتاب خواہش کے ساتھ کہ تمہارا وہ چہرہ چوم لوں۔ جس پہ ہمہ وقت نرمی چھائی رہتی تھی۔ مجھے یاد آتا تھا جب تم مسکراتے تھے تو چاروں طرف کیسا اجالا بکھر جاتا تھا۔ میں تمہاری آواز کی بازگشت اپنی سماعتوں سے کھٹکتا تھا اور اس آواز کے سو سو بار واری صدقے ہوا کرتا۔ وہ آواز جس میں احترام ہوتا تھا اور انوکھی عاجزی بھی، میں نے تمہاری جدائی میں ہر لمحہ سولی پر گزرا۔ میں ہر گزری بڑپا ہوں۔ یہ میری دعا میں تھیں جو اللہ کو مجھ پر رحم آیا اور تم لوٹا دیئے گئے۔ تم وہ نہ تھے جو میں تمہیں سوچتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے تم پہ فساد نہ آتا۔ یہ تو میرے عمل کا رد عمل تھا۔ پھر کیسا دکھ۔ ہاں مگر مجھ سے تمہاری جدائی برداشت نہ ہو سکی تھی۔ جیسی تو دل دھڑکنے سے انکار کرنے لگا۔ میں جو تمہاری جدائی میں رب سے نزدیک ہوا تھا۔ ہر لمحہ ازالے کی التجائیں کرنے لگا۔ برسوں گزر گئے اس التجا میں۔ اس میں ایسی ہی شدت تھی کہ تم لوٹا دیئے گئے۔ میری منظر نظروں کا انتظار ختم ہوا اور چٹائی نصیب ہو گئی۔ تم سمجھو تو مجھے ہوئے مستقیم میری چٹائی کیا تھی؟

وہ سوال کر رہے تھے اور وہ نو خیز لڑکے کی مانند جھینپ کر سرخ پڑ گیا تھا۔ عبدالماجد بنو زید فتودگی میں تھے۔ اس کی نظریں پھر کھڑکی سے باہر بھٹکی تھیں۔ ارد گرد شام کے سائے گہرے تھے اور سڑک کے دونوں اطراف پھیلی اونچی نیچی جھانڑیوں سے لدی پہاڑیاں اور ٹیلے۔ باہر ٹھنڈک اور سکون تھا۔ ویسا ہی اس کے اندر اتر آیا تھا۔ زندگی کے خشب و فراز سے گزرتے انسان بہت کچھ اُگر کھوتا ہے تو پانے والا بھی بنتا ہے۔ جیسے اس نے کھویا ہوا سکون کھوئی ہوئی چاہتیں اور رشتے پالے تھے۔ جیسے اسے دیال مل گئی تھی۔ یہ اللہ کی عنایتیں ہی تھیں۔ یعنی کسی بھی مقام پر کسی بھی مرحلے پر اللہ نے اسے جہا نہیں چھوڑا تھا۔ بس وہی اللہ کو بھول گیا تھا۔ اس نے دل میں پھر اللہ سے اس کو تباہی کی معافی طلب کی اور دل میں دیا کا خیال آنے پر مسکرا دیا۔ وہ یقیناً بہت خفا ہو گئی اس سے۔ ہونا بھی چاہیے تھا۔ اس نے التجا

بھی تو کر دی تھی بہت۔

”میں منالوں گا تمہیں میری جان!“ وہ مسکرایا تھا۔ اور عبدالماجد کا سر نرمی سے ہلانے لگا۔ جو نوز نیند کے زیر اثر پر سکون نظر آ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

”یہ دیکھو۔ مستقیم! کیسا سوٹ ہے؟ دیا کے لیے لائی ہوں۔ چلہ نہا کر پہنے گی۔“ امی نے بے حد چمکتا دکھتا ہوا خوبصورت ترین سوٹ ڈبا کھول کر اس کے سامنے پھیلایا۔ مستقیم نے ہاتھ بڑھا کر دوپٹے کا کنارہ اٹھا پھر مسکراہٹ دہائی تھی۔

”ایسے تو اندازہ نہیں ہو رہا تھا امی بالکل بھی۔ آپ ذرا ان سے کہیں چمن کے دکھائیں پھر پنا پس سکے گا۔“

اس نے بالکل اعلق نظر آئی دیا کو نظروں کے فوکس میں لے کر گویا مطالبہ ظاہر کیا تو اس کی وجہ بنی تھی وہ اسے کتنے دنوں سے یونہی نہ صرف نظر انداز کر رہی تھی بلکہ ازالے کا کوئی موقع بھی نہیں دے رہی تھی۔ رات کو بھی ایزد کا بہانہ کر کے امی کے کمرے میں سویا کرتی اور وہ جزیب ہو کر جاتا۔

”چمن کر دکھانا تو مشکل ہے۔ ابھی میں نے درزن کو دینا ہے کہ دیا کے ناپ کا کر دے۔ ہاں پندہ اوڑھ کے دکھا دو بیٹے! مجھے پورا یقین ہے میری بیٹی پر یہ رنگ بہت کھلے گا۔“ امی کے لہجے میں نیت کا احساس بے حد گہرا تھا۔ اپنی فتح کے احساس پر مستقیم کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔ دیا اسی قدر بھائی تھی۔

”ایزد ابھی سویا ہے امی! ذرا سی جنبش کی تو جاگ اٹھے گا۔ بعد میں نہ دکھاؤں آپ کو؟“ وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ بڑے مینھے انداز میں مستقیم کی چال کو ناکامی سے وہ چار کیا تھا۔ وہ سرد آہ بھر کے رو گیا۔ امی کی وہ بالخصوص چبیتی تھی۔ جب سے انہیں مستقیم کے کارنامے کا معلوم ہوا تھا کہ کس طرح جبراً اسے اٹھایا اور پھر نکاح کیا تھا۔ بعد میں دیا کی ساری کارگزاری جان کر مستقیم نے منہ سے وہ تو دیا کی بے دام غلام اور مرید ہو گئی تھیں۔ جیسے ”تو میری دعاؤں کا اجر تھی میری بیٹی! نہ ہی تجھے اس نیکی اور اعلیٰ ظرفی کا انعام عطا فرمائے گا۔“

وہ بار بار آبدیدہ ہو کر کہتی رہی تھیں۔

”دے تو دیا ہے اللہ نے اجر و انعام! آپ کے بیٹے کی صورت انہیں۔ اور کیا چاہیے؟“ مستقیم ہر بار مسکرا کر کھڑا لگا نہیں بھولا کرتا تھا۔

”بہت ظالم ہوتی جا رہی ہو تم۔“

ای کسی کام سے انھیں تو مستقیم کو اس سے کھل کر بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ دیا نے وہی نظر اندازی کا حربہ آزمانا چاہا جسے مستقیم نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔
 ”ابھی تک خفا ہو؟“

وہ اس کا ہاتھ زبردستی تھام چکا تھا۔

”مجھ سے بات نہیں کریں۔ سمجھے ہیں آپ؟“
 وہ آنکھیں نکال کر دھیسے لہجے میں غرائی۔ مستقیم نے سر کھجایا۔
 ”یعنی خفا ہو۔“

دیا نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ اسے یہ خیال یہ احساس کند چھری بن کر کاٹا تھا کہ اتنی معمولی بات پر وہ اسے طلاق دینے پر تل گیا تھا۔ یہ تھی اس کے نزدیک اس کی حیثیت کہ جب چاہا زبردستی زندگی میں شامل کر لیا۔ جب چاہا بے کار سمجھ کر نکال کر پھینک دیا۔ جبکہ جانتا بھی تھا اس کی بے بسی و لاچاری کو بھی کہ زندگی میں ایسے دورا ہے پر وہی اسے لایا ہے جہاں اس کے علاوہ اور کوئی اس کا نہیں بچا ہے۔

”کمرے میں چلو۔ ابھی منالیتا ہوں تمہیں۔“
 مستقیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ وہ بدک سی گئی۔
 ”کیوں؟ کیوں چلوں میں؟“

اس نے بے تحاشہ غصے میں آتے ہوئے اسے گھورتے مہمک کر پوچھا تھا۔ مستقیم اک ہل کر ہونٹ ہونے کے بعد بے ساختہ ہنسنے لگا۔

”کیا ہو گیا ہے یار! یہی ہو تم میری۔“

لال ہوتے چہرے کے ساتھ وہ پہ مشکل ہنسی کے درمیان جتلا کر بولا۔ گویا صفائی پیش کی اور اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا جو دیا نے فی الفور چھڑو لیا۔

”زیادہ فریج ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے آپ؟ جتنی اوقات تھی آپ کے نزدیک میری وہ آپ بہت اچھی طرح سے بتا چکے مجھے۔“

آن کی آن میں اس کی آنکھوں میں مونے مونے آنسو اتر آئے۔ مستقیم اس لحاظ سے بے یمن و بیقرار اور مضطرب نظر آئے لگا۔

”میں معذرت کر چکا ہوں دیا! پھر سوری کر رہا ہوں۔ میری ذہنی کیفیت جتنی محدود تھی تب تمہیں اندر اسیند تو کرنا چاہیے نا؟“

ملتی انداز میں وضاحت پیش کرتے وہ امید افزا نظروں سے اسے ایسے نکلنے لگا جیسے معافی کا خواہاں ہو۔

”سوچا آپ نے؟ اگر خدا نخواستہ اسی غصے میں آپ اس حد سے گزر جاتے پھر کیا بنتا؟ میں کہاں جاتی؟ کہاں جو گا چھوڑا تھا آپ نے مجھے؟“

وہ اس وقت کی اذیت کو پھر سے محسوس کرتی جیسے پھر خود پر ضبط کھو گئی۔ مستقیم نے بے اختیار نزدیک ہوتے اسے بازو کے دھار میں مقید کر کے اسے خود سے قریب کر لیا۔

”اللہ نے بچا لیا ہے نا۔ اللہ نے بیوی ہی مجھے اتنی سمجھدار عقلمند دی ہے۔ جو میرے ہر رنگ کو پہچانتی ہے۔ جیسی تو اسی وقت سب کچھ چھوڑ کر میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ اور ہر نقصان دہوتے ہوتے رہ گیا۔“

وہ جھکا تھا اور اس کی پیشانی پر لب رکھ دینے۔ عقیدت بھرا مہکتا ہوا انداز تھا۔ جو صحیح معنوں میں تصور کر کے رکھ دینے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ دیا اس کے ظلم سے کیسے بچ سکتی تھی۔ اس کی ساری ناراضی جیسے اپنا اثر کھونے لگی۔

”تم خاص ہو دیا! بے حد انوکھی۔ جیسی تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوا ہوں کہ۔۔۔“

زالی تیری چاہتی ہیں

زالی ہی تو تمہیں ہیں

میں تم کو جب بھی سراب بخشوں

ہمیشہ مجھ کو گلاب دو تم

ہمیشہ تم کو عذاب دوں تو

مجھے تم زندگی کی جانب کھینچ لاؤ

کہاں سے سیکھی ہے ایسی فطرت

سنہری لڑکی مجھے بتاؤ

یہ کیسی عاشق بنی ہو میری

کبھی تو کھل کے مجھے بتاؤ

زالی تیری چاہتیں ہیں

وہ مسکرایا اور پھر جھک کر اس کا گال چومنا چاہا تھا کہ وہ کترا کر تیزی سے فاصلے پر ہو گئی۔

”شرافت کے جائے میں رہیں۔ بیڈروم نہیں ہے یہ آپ کا۔“

وہ اچھا خاصا چڑی ہوئی تھی۔ اس کی اس بے تکلفی کے مظاہرے پر۔ مستقیم منکھوڑ ہو کے قہقہہ لگانے لگا۔

”حد بندیاں لگانے سے بہتر تھا تم میرے ساتھ بیڈ روم میں ہی چلتیں۔“

وہ اب پوری طرح پڑی چھوڑتا ہوا آنکھ مار کر بولا۔ دیا کے سارے جسم کا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا تھا گویا۔

منہ دھو کے رکھیں۔ اونہ حکم دے رہے ہیں محترم! اتنی بھی فرمانبرداری نہیں ہوں میں اب آپ کی۔“

چلبلاتے ہوئے وہ جیسے اپنی خجالت مٹانے کو بولی۔ البتہ نظریں اس سے چار نہیں کیں کہ اس کی نگاہوں کے گستاخ نقاصوں کی تاب لانے کی ہمت نہیں تھی اس میں۔

”فرمانبرداری تو تم ہو میری۔ پر اب ذہنی چھپی بات نہیں رہی۔ سن لو۔ اگر آج شرافت سے نہیں آئیں تو امی ابو کا خیال کیسے بغیر اٹھا کر لے جانے سے گریز نہ کروں گا بعد کی ناراضی کی پروا ابھی کچھ خاص نہیں ہوگی مجھے۔“

اس بیاہگ و دہل دعوے پر دیا کا چہرہ ابھاپ چھوڑنے لگا۔ لانی پلکیں حیا سے جو جھل ہو کر لرزنے لگیں۔ مستقیم کو وہ نظریں چراتی جھینپی شرماتی اتنی اچھی لگی کہ خود کو کسی گستاخی سے باز نہیں رکھ سکا۔ دیا کی سراسیمگی، حجاب اور ہراسگی کا عالم بھی کیا خوب دیکھنے والا تھا۔ جسے نگاہوں کی زد پر رکھے وہ منہ سے جا رہا تھا اور دیا راہ فرار پر مجبور ہو کر وہاں سے بھاگی تھی۔

☆.....☆.....☆

”یہ بھلا کیا بات ہوئی ابوجی! آپ مجھے اتنی دور اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے کیوں بھیج رہے ہیں آخر؟“

آج ہی دیا چل نہائی تھی۔ امی نے اس موقع پر قرآن خوانی اور محفل نعت کا بھی اہتمام کر لیا تھا۔ دور و نزدیک کی سب جاننے والی خواتین بلوائی گئی تھیں۔ دیا کی ج جج بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ امی نے جانے کون کون سے ارمان نکالتے ہوئے اسے صحیح معنوں میں دہن مٹا کے دم لیا تھا۔ ”ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھی تیاری کو آخری اور فائنل ٹچ دے رہی تھی۔ جبکہ مستقیم بستر پر نیم دراز اس میں گویا پوری طرح گم بہوت بیٹھا تھا معاہدہ ایک دم اپنی جگہ سے اچھلی۔“

”کیا ہوا؟“

مستقیم اسی کی جانب متوجہ تھا۔ بری طرح حیران ہوا۔

”ایزدادی کے پاس ہے اور میلاد کے لیے خواتین پہنچنا بھی شروع ہو گئیں۔ میری ابھی تک تیاری مکمل نہیں ہوئی۔ اوپر سے آپ بھی کم نہیں ہیں بوکھلانے کو۔“

وہ جھنجھلاہٹ میں اسی پر آلت پڑی۔ مستقیم کو جھنکا لگ کر رہ گیا۔

”ہائیں۔۔۔ میں نے کیا کیا؟ اتنے فٹ کے فاصلے سے یار؟“

وہ تڑپ اٹھا تھا اس سراسر کے الزام پر۔

”ایسے دیکھیں گے تو ڈھنگ سے کہاں کچھ کر پاؤں گی۔ ہاتھ بہک جاتے ہیں۔ جائے باہر۔ ابوجی کے پاس۔“ وہ سخت چڑی۔ اور کوفت سے اپنے کیلے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ساتھ ساتھ ڈریسنگ ٹیبل کی دروازوں کو کھول کھول کر مختلف زیور کے ڈبے نکال کر رکھ رہی تھی۔ مستقیم سخت خفا ہوتا اٹھ کر اس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔

”نگاہیں چار نہیں کر رہیں مجھ سے۔ پھر ہاتھ کیسے بیٹکتے ہیں تمہارے؟ بالکل جھوٹی ہو تم۔“

اس نے بھی جیسے شکوہ کیا۔ دیا کا چہرہ ادبک گیا۔

”نگاہیں نہ بھی ملاؤں۔ آپ کی نظریں تو اپنا کام دکھا جاتی ہیں ناں۔“

وہ جل کر بولی تھی اور جھکنے کے باعث آگے ڈھلک آنے والے بالوں کو جھٹکے سے پیچھے گرایا جو مستقیم کے بازو سے ٹکرا کر دیا کی کمر پہ جھولنے لگے۔

”اچھا۔۔۔ واہ! اتنا بگھتی ہو تم نگاہوں کی زبان؟ مجھے تو ابھی پتا چلا۔“

اب کے وہ صاف اس پر طنز کر رہا تھا۔ پھر جھک کر اس کے بالوں کی لمبی لت ہاتھ میں پکڑ کر اٹھائی اور سوتھ کر لمبی سانس بھری۔

تیرے جھٹکے بدن کی خوشبو سے لہریں بھی ہوئیں سہانی سی۔

اس نے مسکراہٹ دبا کر بے حد شوخ و شنگ انداز میں تان اڑائی تھی۔ دیا کا رنگ دہک دہک گیا۔ پلکیں بارہا سے لرز کر جھکیں مگر بظاہر جھنجھلائی اور اپنے بال چھڑائے۔

”اف اللہ! چھوڑیں۔ جائیں نا۔“

اسے مزید شرارت پر آمادہ پا کر اس نے بوکھلاتے ہوئے اس کے سینے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے زور سے پیچھے دھکیلا اور اسے بیڈ پر بٹھا کر سیدھی ہوئی۔

”خبردار آپ یہاں سے بٹے تو۔“

وہ اس کی آنکھوں کے آگے مکالہ کر سختی سے تنبیہ کر رہی تھی۔

”اف۔۔۔۔۔ ظالم بیوی۔“

وہ جوت موت کا سہا۔ مگر پھر شرارت پر اتر آیا اور اس کا دامن پکڑ کر منچھے انداز میں کھینچا۔

لگا ہوں سے قتل کرو نہ ہو تکلیف دونوں کو

تمہیں نینر اٹھانے کی، ہمیں گریں جھکانے کی

دیانے ہونٹ بھیجی کر مسکراہٹ ضبط کی۔ پھر جیسے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

”خلیفہ مستقیم! آپ پہلے جائیں یہاں سے۔ قسم سے نہیں ہوگی ایسے مجھ سے تیاری۔ نیچے اسی

اکیلی سب کچھ ہینڈل کر رہی ہیں۔ کچھ تو خیال کریں۔“

لجابت سے کہتے اس نے اپنی مجبوری دے ہی بتائی۔ مستقیم نے گہرا طویل سانس بھرا اور کھنی کے بل تسلی سے نیم دراز ہو گیا۔

”چلو کیا یاد کرو گی۔ نہیں جگ کرتا۔ کرو اپنا کام۔“

وہ اسر و آہ بھر کے غلٹ میں بالوں کو سمیٹنے لگی۔ اس کے بعد زیورات کے ڈبے کھولے تھے اور ایک سیٹ منتخب کیا اور جلدی جلدی گلے میں نیگس سجاتے ہوئے خیال آنے پر اسے مخاطب کر لیا۔ مگر پچھتاہی۔

”کیسا لگ رہا ہے یہ سیٹ؟“

”بہت خوب! اتنا کہ مجھے اپ سیٹ کر دیا ہے۔ ذرا یہاں آؤ تو بتاؤں کتنا اپ سیٹ کر چکا ہے۔“ وہ اس کے سجے بنے سراپے پر لگا ہیں فوکس کیے سر آہیں بھر رہا تھا۔ دیا اسے گھورتا چاہتی تھی مگر اس کی نگاہوں کے انداز نے اٹا اسے بوکھلا کے رکھ دیا۔ اس سے قبل کہ مستقیم مزید کوئی مصلحتی چھوڑنا دروازے پر دستک ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر آگے بڑھا تھا۔ دروازہ کھولنے پر ملازمہ کی صورت نظر آئی۔ جو روتے ہوئے ایزد کو گود میں لیے کھڑی تھی۔

”بیگم صلاب کہتی ہیں۔ چھوٹی بی بی کو دے آؤں۔ بابا کو بھوک لگی ہے اور بیگم صلاب بی بی کو جلدی آنے کا بھی کہہ رہی ہیں۔ قرآن خوانی شروع ہو چکی ہے۔“

مستقیم نے نہ بڑھ کر بچے کو لے لیا۔

”یہ لیجیے محترمہ! پیغام تو سن لیا ہوگا آپ نے۔“

وہ ایزد کو لیے اس تک آیا تھا۔ دیانے ہری جھنڈی دکھائی۔

”آپ کی وجہ سے ہی لیٹ ہوئی ہو۔ اب ذرا بھلائیں اسے۔“

وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ مستقیم نے اسے گھورا۔

”مجھ سے کہاں سنیں گے۔“

”سنجیدل جائے گا۔ باپ ہیں دشمن نہیں۔ ذرا بلا نہیں جھلائیں اسے۔“

اس کی جھنجھلاہٹ کو خاطر میں لائے بغیر وہ مزے سے بولی تھی۔ مستقیم سر و آہ بھر کے رو گیا۔ مگر ایزد ہاتھ پیر مار مار کے کچھ ایسے رویا کہ دیا کو اٹھنا پڑا تھا۔

”آؤ میری جان! بابا نے مارا؟“

وہ لپک کر اس کے پاس آئی اور ایزد کو اس سے لیا۔ اور خود میں سمولیا۔ ایزد کی فریادیں بھی جیسے تھمنے لگیں۔

”آج کے بعد میں بھی ایسے ہی بالکل اسی انداز میں احتجاج کر کے تمہیں متوجہ کروں گا۔ خبردار جو تم نے ذرا سی بھی ڈنڈی ماری اس والہانہ محبت میں۔“

مستقیم جو اس کے التفات کا مظاہرہ دیکھ رہا تھا۔ فوراً گرفت کرتے ہوئے مطالبہ بھی ظاہر کر دیا۔ دیا کے چہرے سے بھاپ نکلنے لگی۔ اب کے اسے گھورتا تو درکنار وہ لرزتی چلکیں بھی نہیں اٹھا سکی۔ اس کی حالت دیکھ کر مستقیم خود ہی ہنستا چلا گیا تھا۔

”بہت بے شرم ہیں آپ۔“

دانت کچکا کر کہتی خود ہی جھلا کر باہر نکل گئی تھی۔ مستقیم مسکراتا ہوا اسنڈی میں عبدالماجد کے پاس آ گیا۔ تب انہوں نے اسے اس کا اور دیا کا پاسپورٹ بننے کی اطلاع دی تو وہ کتنا حیران رہ گیا تھا۔

”تو کی؟ مگر کیوں ابوجی؟“

”یہاں مجھے ہر دم تمہاری گرفتاری کا دھڑکا لگا رہتا ہے بیٹے! مجھے یہ بھی احساس ہے کہ یہاں تم اب پوری آزادی سے سرائٹا کر نہیں جی سکتے ہو اور میں چاہتا ہوں میرا بیٹا ہر بھر کی احساس کمتری یا محرومی کا شکار نہ رہے۔ یہ معمولی سا ازالہ ہے اس زیادتی کا جو میں نے تم پر کی۔ تمہارا کام میں نے بدل دیا ہے۔ یہ بھی ضروری تھا۔ بہت مشکل تھا یہ کام مگر اللہ کا شکر ہے ہو گیا۔ بس چند دن کی بات ہے۔ پھر تم پورے اعتماد اور آزادی کے ساتھ زندگی سے لطف کشید کر سکو گے کہ وہاں تمہیں اس حوالے کے ساتھ کوئی نہیں جانتا ہوگا۔“

وہ نرمی اور رسانی سے کہہ رہے تھے۔ جبکہ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ محبتوں کا ایسا ثبوت زیادتی کا ایسا ازالہ احسان کا ایسا شاندار انداز محسوس کرتا رہا تھا۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے بیٹے! اسلامی ملک کو ترجیح اس لیے بھی دی کہ اک دن تمہارے بچے بڑے بھی ہوں گے تو مشکل نہ فیس کرنی پڑے۔ جیسا کہ عموماً برٹش ممالک میں ہوتا ہے۔ پھر دیا جی بہت سمجھدار ہے۔ مجھے بہت بھروسہ ہے اس پر۔ وہ سنبھال لے گی خوبی سے آپ کو

اور ہماری نسل کو بھی۔

وہ مزید کہہ رہے تھے۔ مستقیم نے بے چین ہوتے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔
"لیکن میں اب آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا ابوتی! آپ اور امی کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ کسی بھی صورت چاہے مجھے یہاں کتنی ہی مشکلات کو فیس کرنا پڑے۔"

اس کا گلا اندرونی جذبات کے باعث بھرانے لگا تھا۔ عبدالمجید نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا تو اپنا بازو اس کے شانے پر دراز کر کے خود سے لگا کر تھپکا تھا۔

"تھینک یو بیٹے! میں سمجھ سکتا ہوں۔ ہم خود بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جیسا کہ میں سے ہجرت کا سوچ لیا ہے۔ آپ کی امی کے ویزے میں کچھ پر ایئر آرہی ہیں۔ جبکہ میں یہاں سے پرنس وائٹ اپ کر کے تمام کام سمیٹ کر جانا چاہتا ہوں۔ کچھ وقت لگ جائے گا لیکن اللہ نے چاہا تو ہم بہت جلد اکٹھے ہو جائیں گے۔"

وہ بہت نرمی سے۔ محبت سے اسے قائل کر رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے۔ جب دروازہ کھول کر امی بہت غلت میں اندر آئی تھیں۔ ان کا چہرہ اندرونی جذبات کے باعث تھمٹایا ہوا تھا۔

"خیریت امی! آپ ٹھیک ہیں؟"

مستقیم گھبرا کر کھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے فوراً جذبات میں اسے گلے لگا کر ماتھا چوما۔
"خوشی کی ہی خبر ہے الحمد للہ ادیا بیٹی کی والدہ مل گئی ہیں۔ بلکہ مستقیم کے ابا یاد ہیں نا وہ محترمہ آپ کو؟ جن سے ہاسپل میں آپ کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہی جن کی ساس کی طبیعت خراب تھی تو ہاسپل میں آپ ان سے ملے تھے؟ قد سرہ بیگم، وہی تو ہیں دیا کی امی۔"

وہ مسرت زدہ لہجے میں تیز تیز بول کر ساری تفصیل سنانے میں مصروف ہوئیں۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ قد سرہ بیگم نے دیا کو پہچان لیا تھا اس کے بعد کا منظر ظاہر ہے بہت جذباتی تھا۔ قد سرہ بیگم نے کال کر کے اپنے بیٹے، شوہر اور ساس کو بھی بلوایا تھا۔

"دیا ابھی تک بہت رورہی ہے پتا نہیں کیوں؟ میں نے سوچا آپ کو بلاؤں۔ چپ تو کرائیں کسی طریقے سے بچی کو۔ آؤ بیٹے تم بھی۔"

انہوں نے پٹنے سے قبل مستقیم کا ہاتھ پکڑا۔ دوسرا وہ بھر کے رو گیا۔

"آپ کر لیں بات امی! صورتحال سنبھل جائے گی ہبے فکر ہیں۔ دیا ہرٹ ہے انہیں دیکھ کر۔" اور امی ابو چونکہ کسی بھی معاملے سے بے خبر نہیں تھے جیسا کہ محض سر بلایا تھا اور پلٹ کر باہر چلے گئے۔ مستقیم سگریٹ سلگاتے ہوئے حالات میں تیزی سے آنے والی تبدیلیوں پر غور کرتا کش لیتا رہا۔

تھا۔

☆.....☆.....☆

پھر تو جیسے ساری صورتحال ہی تبدیل ہو گئی تھی۔ دیا کی امی بے حد شرمندہ تھیں اپنے اس عمل سے، جیسا کہ اب بار بار مستقیم سے بھی معذرت کر چکی تھیں۔ اس کے علاوہ دیا کے بابا اور بھائی کے علاوہ دادی نے بھی ان کے رویے پر معافی مانگی تھی تو مستقیم شرمندہ ہونے لگا تھا۔ جیسا کہ اجڑی سے انہیں ٹوکا۔

"یہ اپنی جگہ پر ٹھیک تھیں۔ مجھے ہرگز بھی شکوہ نہیں ہے۔ شاید نہیں یقیناً ہم اسی سلوک کے مستحق تھے۔ خاص طور پر میں۔"

وہ سر جھکائے بولا تھا۔ تو دیا کے بابا نے بے حد محبت سے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔
"ایسا مت سوچیں مستقیم بیٹے! قابل تحسین ہوتے ہیں وہ لوگ جو برائی سے اچھائی کی جانب واپس لوٹیں اور اس کے لیے اسٹرگل کریں۔ آپ تو خاص ہو عام لوگوں سے کہیں زیادہ بہادر بھی۔" ان کا لہجہ ان کے الفاظ کا واضح عکاس تھا۔ مستقیم ان کی رواداری کے مظاہرے پر نرمی سے مسکرایا پھر دیا کو دیکھا تھا۔

"سچ پوچھیں تو اس میں میرا کہیں بھی کوئی کارنامہ شامل نہیں ہے۔ امی ابو جی کی دعائیں رنگ لائیں اور اللہ کا احسان ہوا۔ دوسرا یہ کریڈٹ دیا کو ہی جاتا ہے۔ یہ ساری محنت سارا کمال اسی کا تھا۔ اگر یہ نہ ہوتی تو شاید میں آج یہاں بھی نہ ہوتا۔"

اس کے لہجے میں عقیدت بھی تھی۔ سچائی بھی۔ دیا اس پر ملا تعریف پر وہ بھی سب کے سامنے اچھا خاصا شرمائی تھی۔ جیسا کہ جینپ کر مسکرانے لگی۔

"یہ سب تو ہے بیٹے! آپ کی فطرت کی اچھائی بھی اس میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔ مجرم عادی ہو جائے تو جرم کا احساس ختم ہو جایا کرتے ہیں۔ کب... کیسے... کیوں اور کیسے کے سوال اپنی وقعت کھودیتے ہیں۔ وہ بس اپنی کامیابیوں پر نگاہ رکھتا ہے اور آگے بڑھتا جاتا ہے۔ پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ لیکن آپ کا پلٹ کر بار بار دیکھنا آپ کی فطرت کی اچھائی اور اللہ کا آپ پر خاص کرم ہی تھا۔ جو اس واپسی کا باعث بنا۔ گناہ یہ نہیں کہ آپ گناہگار ہیں۔ گناہ یہ ہے کہ آپ کو اس پر فخر ہے۔ آپ تو بے گناہ گار نہیں۔ شرمسار نہیں۔"

اور گناہ سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آپ کو اپنے گناہ کا احساس نہیں۔ جبکہ اللہ آپ نے اپنی غلطی پر فخر نہیں کیا۔ آپ جرم کے عادی ہو کر بھی ذہنی طور پر اسے قبول نہ کر سکے۔ ہر قدم پر آپ کو غلطی اور

وہ جیسے اس ہلکے شاک کی ہونے لگی۔ مستقیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔
 "شکوہ اور اچھی بات تم ہمیشہ فاصلے سے ہی کرتی ہو۔ بہت خراب عادت ہے۔ یا یہ تمہاری۔
 اگر یہاں ہوتی تو ثبوت پیش کر دیتا۔ مگر بجز اتواب بھی کچھ نہیں۔ جواب دینا ضروری ہے نا۔ وہاں آ
 کے بتانا ہوں کتنی محبت کرتا ہوں۔ انتظار کرو۔"

اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے گویا لہجوں میں اسے بوکھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں خلیفہ! نام دیکھیں ذرا۔"

وہ واقعی شٹائی تھی۔ ہکلائی تھی۔

"میں نام نہیں تمہارے شکوے کو دیکھ رہا ہوں اور تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"

اس نے اسے اچھے انداز میں چھیڑنے کا تہیہ کر لیا تھا گویا۔

"اچھا بھئی! معاف کر دیں مجھے۔ نہیں ہے مجھے آپ سے کوئی گلہ شکوہ۔"

وہ عاجز ہوئی اور بات ختم کرنی چاہی۔ مستقیم کو تہہ روکنا محال ہوا مگر اسے تنگ کرنے کا ارادہ
 نہیں بدلا۔

"یعنی دوسرے لفظوں میں تم مجھے وہاں آنے سے روک رہی ہو۔"

"اف اللہ! مستقیم۔ قسم سے آپ حد کر رہے ہیں۔ میں کیوں روکوں گی آپ کو؟ بلکہ یہاں
 سب آپ کے منتظر ہیں۔ اسی دعوت کرنا چاہ رہی ہیں۔ اہی ابوجی اور آپ کی بھی۔"

وہ واقعی اس کے جھانسنے میں آگئی تھی۔ اور گھبرا کر وضاحتیں اور صفائیاں پیش کیے مگنی۔ اور مستقیم
 کو ہنسی روکنا محال لگنے لگا۔ جیسی بے تحاشہ سرخ پڑ چکا تھا۔

"میں تو ہرگز نہیں آؤں گا۔ تب تک جب تک تم نہ بلاؤ۔"

اس نے نروٹھے پن کا مظاہرہ کیا۔

"میں ہی تو بلا رہی ہوں آپ کو۔"

اس نے باقاعدہ منت کے انداز میں کہا تو مستقیم کے قہقہے نے اسے بتایا اب تک وہ اسے کتنا
 بیوقوف بنا کر ستا چکا ہے۔

"ثابت ہوا۔ ابھی تمہیں بہت زیادہ عقل نہیں آئی۔"

"میں بات نہیں کر رہی ہوں آپ سے بس۔"

اس نے مصنوعی غصے میں کہتے فون بند کر دیا۔ مستقیم بعد میں بھی اس کی شکل کے بگڑے زاویوں
 کا تصور کر کے مسکراتا رہا تھا۔ پھر اس نے یونہی مسکراتے ہوئے اسے ٹیکسٹ سینڈ کیا تھا۔

گناہ کا احساس تھا۔ پچھتاوا بھی دکھ بھی۔ یہی آپ کی رہائی آپ کی نجات کا باعث بن گئی۔ اور یہ مقام
 شکر ہے۔"

دیا کے بابا کہہ رہے تھے اور مستقیم آہستگی سے مسکرا دیا تھا۔ وہ سو فیصد متفق تھا۔ آخری خیال سے
 خاص طور پر جیسی چند لہجوں میں شکرانہ ادا کرنے اٹھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ تو بہت زیادتی ہے بھئی! تمہیں منع کرنا چاہیے تھا اور میرا خیال بھی الٹا لگاؤ تک ملائے بغیر
 اٹھ کر ساتھ بھاگ گئیں۔"

وہ سیل فون کان سے لگائے اس سے محو گفتگو بنایا جا رہا تھا۔ دوسری جانب دیا کی ٹھنکتی ہنسی اس
 کے غصے کو ایسے بڑھادی تھی جیسے جلتی آگ کو تیل بھڑکاتا ہے۔

"ہنسو نہیں۔ بتا رہا ہوں تمہیں ورنہ ابھی پہنچ جاؤں گا وہاں اور بغیر کسی کا لحاظ کیے لے آؤں گا
 سبھی۔"

اسے صحیح معنوں میں غصہ آ گیا تھا۔ دیا اسی دن اپنے والدین کے ہمراہ اپنے میکے چلی گئی تھی۔
 اس بات کو اب کتنے ہی دن ہو گئے تھے مگر وہ تھی کہ واپس آنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ جبکہ اس کی یہی
 بے اعتنائی مستقیم کے شدید غصے کا باعث بن چکی تھی۔

"افوہ..... اتنا غصہ کرنے کی کیا تک ہے بھئی؟ شادی کے بعد پہلی مرتبہ میکے آئی ہوں۔ صرف
 یہی نہیں، مستقل طور پر اس ملک سے بھی جا رہی ہوں۔ تو اتنا رہنا تو حق بنتا ہے نا میرا۔"

وہ جو اب نرمی سے سمجھا رہی تھی۔ مستقیم نے متاسفانہ سر د آہ کھینچی۔

"ہاں جی بالکل۔ بالکل حق بنتا ہے۔ سارے دوسروں کے حقوق اذیر ہیں ہماری ڈیڑسٹ
 وائف کو سوائے اپنے اس غریب شوہر کے۔"

دوسری جانب دیا یقیناً اس کی اس بیچارگی پلاس بے مبری پہ نفٹ زدہ ہوئی تھی جیسی بھی تھی۔
 "تھوڑا سا صبر کر لیں، پھر تو عمر بھر آپ کے ساتھ ہی رہتا ہے۔"

وہ مسکرائی تھی۔ مستقیم کا موڈ اس خوبصورت بات نے ذرا سا بحال کیا۔
 "ان شاء اللہ! مگر ابھی کا کیا کروں؟ دل نہیں لگ رہا ظالم لڑکی تمہارے بغیر۔ اتنا عادی کیوں
 بنایا تھا مجھے بیچارے کو اگر یہی سب کرتا تھا۔"

اس نے سر د آہیں بھر کے دوا دیا کیا۔ دیا کی مسکان مچل مچل گئی۔
 "بس کریں اداکاری اچھا۔ جانتی ہوں جتنی محبت کرتے ہیں آپ۔"

(خفا نہیں ہونا ڈارنگ! تمہیں نہیں ستاؤں گا تو اچھی نیند نہیں آئے گی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اب تمہارے بغیر زندگی کا تصور ہی محال ہے۔ تم میرے لیے اللہ کا وہ انعام ہو جو زندگی کو سہل اور خوشگوار بنا دیتا ہے۔)

اور یہ اعتراف اس نے اس وقت بھی اس کے سامنے کیا تھا۔ جب وہ پاکستان سے ترکی فلائی کرنے کے لیے سب کو الوداع کہہ کر ڈیپارچر لائونج کی جانب دیا کی ہمرای میں بڑھ رہا تھا۔ اس نے بہت عقیدت بھرے انداز میں دیا کے ہاتھ پر یوسر ثبت کیا تھا اور محبت سے لبریز صکتے خوشبودار لہجے میں گویا تھا۔

”نیک، صالح اور دیندار بیوی قدرت کا انعام ہوا کرتی ہے۔ میں شکر گزار ہوں اپنے رب کا کہ اس نے یہ انعام مجھے عطا فرمایا۔ یہ سب یونہی ہونا طے بھلے تھا۔ مگر دیا ہر انسان اپنے عمل سے پہچانا جاتا ہے۔ تمہارا عمل قابل ستائش ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ اگر تمہاری محبت، تمہارا تعاون ساتھ نہ ہوتا تو میں آج ایک بدلا ہوا انسان نہ ہوتا۔ ایک گمراہ ڈاکو کو اپنی کوشش اور دعاؤں سے راہ راست پر لانے والی لڑکی کے نام پر نیک جذبات بہت عقیدت کے ساتھ وہ تھا تھا۔ اور گھلا کھنکار کر بہت جذب سے گویا ہوا تھا۔

وہ لڑکی پھولوں جیسی ہے
وہ بالکل حوروں جیسی ہے
ہے چاند مگر کی رانی وہ
ہے جیسے رات مستانی وہ
ہے میری پریم کہانی وہ
روشن وہ اجالوں جیسی ہے
وہ میرے خیالوں جیسی ہے
شعلہ بھی وہ، شبنم بھی وہ
وہ زلف گھٹا سی رکھتی ہے
وہ آنکھ رسا سی رکھتی ہے
وہ دھوپ میں چھاؤں جیسی ہے

سادن کی گھٹاؤں جیسی ہے
تہنی کی اداؤں جیسی ہے
وہ ملک چاند ستاروں کی
وہ خوشبو باغ بہاروں کی
وہ لڑکی پھولوں جیسی ہے
وہ بالکل حوروں جیسی ہے

اور دیا کے سفید ابلے چہرے پر حیا کی سرخیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ لانی چٹکیں جیسے اٹھنے سے انکاری ہو رہی تھیں اور مسلسل لرزتی تھیں۔ اپنا محبوب روپ چھپانے کو اس نے جھک کر ایزد کو پیار کیا تھا۔

”جنت میں ہر مرد کو ستر حوریں ملیں گی۔ مگر میں اپنی بیوی سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ صرف تمہیں پر اکتفا کروں گا۔ دیکھا ہوگا تم نے کوئی ایسا بھی صابر و شاکر مرد؟“

وہ اس کی سماعتوں میں بو بھل سرگوشیاں اٹھاتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جہاز میں آ کر بیٹھ بھی گئے تھے اور جس ہل وہ اس کی سیٹ بیلٹ باندھ رہا تھا دیا نے نہ ہایت محبت سے اس کے ہاتھ کو تھام کر اپنے ہاتھوں کے ساتھ ملا کر دعا کے انداز میں پھیلا دیئے۔

”سفر میں مانگی جانے والی دعائیں قبول ہوا کرتی ہیں خلیفہ مستقیم! آئیے ہم دعا مانگیں اللہ پاک اپنے محبوب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ہمارے نیکی کے اس ارادے میں پختگی پیدا فرمائے۔ ہماری اس واپسی کو دائمی رکھے۔ ہر آزمائش میں استقامت اور سرخروئی نصیب فرمائے اور شیطان کے بہکاوے سے بچا کر اپنی پاک حفاظتوں میں لے لے۔ آمین تم آمین۔“

مستقیم نے صدق دل سے کہا تھا پھر مزید گویا ہوا۔

”نہیں کوئی معبود سوائے تیرے۔ تو پاک ہے۔ بے شک میں ہی خالموں سے ہوں۔“

اور یہ بہت پیاری دعا تھی جو واپسی کے اس دائمی سفر میں ہمیشہ اس کے لبوں پر زبانت بنی رہتی تھی۔ وہ مشکور تھا اور خوش بھی کہ آزمائش کے ان لمحات میں اللہ نے اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا کسی جی لیاظ سے اور اس کی محبت کا اس کی عنایت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا تھا بھلا؟ کہ اس نے اسے بچانے اور ہدایت پر لانے کو اتنا خاص سبب عطا کیا تھا دیا جیسی نیک میرت بیوی کی صورت میں اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کی شہادت اور رفاقت میں تو اس نے جانا تھا۔ زندگی بیکار نہیں تھی جسے ضائع کیا جاتا۔ زندگی خاک بھی نہیں تھی جسے حقیر سمجھ کر اڑا دیا جاتا۔ زندگی تو انمول سرمایہ تھی۔ ایک مہلت ایک چانس۔ جسے ہرگز ضائع نہیں کرنا تھا۔ جسے اسی مقصد کے لیے گزارنا تھا جس کی خاطر رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پیدا فرمایا ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا تو جان بھی گیا تھا۔ اب کوتاہی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اب زندگی حقوق اللہ اور حقوق العباد کے تحت ہی صراطِ مستقیم پر گزرنی تھی ان شاء اللہ۔

ختم شد

☆...☆...☆